گُلِستانِ اَدَب

سیکنڈری کلاسز

پنجاب
ٹیکسٹ بک بورڈ
لاہور

پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ ○ انارکلی لاہور

گلستانِ ادب

(اردو اعلیٰ اختیاری)

برائے

جماعت نہم و دہم

پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ ، ۱۷۶ ، انارکلی ، لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	تعداد اشاعت
جون 1973	اول	2,000

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور، منظور شدہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور بموجب سرکار نمبر SE/G—748 مورخہ 9 مارچ 1973ء سرگودھا بورڈ بموجب سرکار نمبر 4139—4734/MS مورخہ 18 اپریل 1973ء ملتان بورڈ بموجب نوٹیفکشن نمبر 203/ASG مورخہ 21 فروری 1973ء

مؤلفین : (۱) **پروفیسر سید وقار عظیم**

(۲) **پروفیسر مشرف انصاری**

(۳) **جناب دین محمد شفیقی عہدی پوری**

نگران تدوین و طباعت :

سید سجاد رضوی

ماہر مضمون

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور

مطبع : ۔ پبلشرز یونائیٹڈ پریس ، لاہور

مقدمہ

نثر و نظم کے انتخابات کا یہ مجموعہ اس نصاب کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے جو حال ہی میں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن سرگودھا کی مجلس نصاب اردو نے پنجاب کے تینوں ثانوی بورڈوں کے لیے مرتب کیا تھا۔ نصاب مرتب کرنے سے پہلے اردو کے اساتذہ کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا گیا تھا اور ان سے درخواست کی گئی تھی کہ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے نصابات کو بہتر بنانے کے متعلق اپنے مشوروں سے آگاہ فرمائیں۔ سو کے قریب اساتذۂ اردو نے مروّجہ نصاب کے سلسلے میں جو اظہار خیال کیا اس میں مندرجہ ذیل باتوں پر خصوصیت سے زور دیا گیا تھا:

(۱) میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے موجودہ نصابات مقدار میں اتنے کم ہیں کہ وہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی پورے ہو جاتے ہیں اور استاد کے لیے سبق میں دلچسپی برقرار رکھنا ممکن نہیں رہتا۔

(۲) اسباق میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن کے موضوع اور مطالب سے طلبہ کو قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

(۳) نصاب کی مروجہ کتابیں طالب علموں میں زبان اور ادب کا ذوق پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔

(۴) نصابات عموماً نثر نگاروں اور شاعروں کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے۔

نصاب کی موجودہ کتاب مرتب کرتے وقت مندرجہ بالا شکایات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ (۱) نصاب کی اس کتاب

کی ضخامت پچھلی کتابوں کے مقابلے میں اتنی زیادہ ہے کہ اب استادوں کو انشاءاللہ نصاب کی کمی کی شکایت باقی نہیں رہے گی (۲) اسباق کے انتخاب میں اس بات کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان کے موضوعات اور مطالب میں طلبہ دلچسپی محسوس کریں اور ان اسباق کو پڑھ کر ان کے دل میں مزید مطالعے کا شوق پیدا ہو۔ (۳) مضامین کے انتخاب میں زیادہ سے زیادہ تنوّع پیدا کیا گیا ہے اور (۴) کوشش کی گئی ہے کہ نثر اور نظم کے جو اقتباسات نصاب میں شامل کیے گئے ہیں وہ مصنف کے طرز کی صحیح نمائندگی کریں۔ (۵) انتخابات میں بہت سی چیزیں ایسی شامل کی گئی ہیں جو اس سے پہلے نصاب کی کتابوں میں نہیں آئیں (۶) نئے لکھنے والوں کی تحریروں کے اقتباسات پچھلی اور مروجہ کتابوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ یقین ہے کہ ان اقدامات کی بدولت نصاب کی موجودہ کتاب پڑھنے والوں کے لیے بھی دلچسپ ہوگی اور استادوں کو بھی اس کے پڑھانے میں زیادہ لطف حاصل ہوگا اور وہ تھوڑی سی توجہ سے طلبہ میں زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کر سکیں گے۔

واضعین نصاب کی اس غفلت اور کوتاہی کو بار بار ہدف ملامت بنایا گیا ہے کہ انھوں نے نصاب کی کتابوں کے ذریعے بچوں میں قومی شعور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اعتراض بڑی حد تک درست ہے۔ اور اس اعتراض کا اطلاق زبان اور ادب کے نصابات پر خصوصیت کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے کہ انھیں مرتب کرتے وقت جتنے تعلیمی نصب العین پیش نظر رہے ہیں ان میں قومی احساس کی بیداری کا نمبر شاید سب سے آخر میں آیا ہے۔ نصاب کی موجودہ کتاب میں اس اہم قومی تقاضے کو خصوصیت سے اہمیت دی گئی ہے۔ نثر اور نظم

کے جس سبق میں بھی اس بات کی گنجائش تھی کہ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی صد سالہ تاریخ کے کسی رخ کو ابھارا جائے وہاں اس سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اسباق کے آخر میں جو مشقیں جا بجا شامل کی گئی ہیں ان میں اس پہلو پر بار بار زور دیا گیا ہے ۔ نثر کے اسباق میں غالب کے خطوط ، نذیر احمد کے ابن الوقت ، حالی کے سرسید کی راست بازی اور نظم میں حالی ، آزاد ، اسمعیل میرٹھی ، اقبال ، ظفر علی خاں ، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی دوسرے شاعروں کے اقتباسات میں آنے والی ہر اس چیز کو پوری طرح نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا ہماری آزادی کی جدوجہد کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا رشتہ ہے ۔ اساتذۂ کرام ان مشقوں کو بنیاد بنا کر طلبہ کے اس احساس کو تیز تر کرنے میں مدد لے سکتے ہیں ۔

سبق کے آخر میں آنے والی مشقوں اور اشاروں میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن میں طلبہ کو اساتذہ کی رہنمائی کی ضرورت ہو گی ۔ ان مشقوں کے ذریعے اول تو یہ کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ اسباق کے مطالب کی صحیح روح کو سمجھیں اور دوسرے ان میں عام مطالعے کا شوق پیدا ہو ۔ اس کام میں بھی ان کے لیے اساتذہ کی رہنمائی ضروری ہوگی ۔ مشقوں میں لفظوں کی ساخت ، محاوروں کے استعمال ، قواعد کے اصولوں ، اہم معنوی صنعتوں اور حسنِ بیان کے بعض نمایاں پہلوؤں کی طرف بھی طلبہ کو بار بار متوجہ کیا گیا ہے تاکہ ان پر ان سب چیزوں کی عملی اہمیت واضح ہے ۔ اس طرح کی مشقیں بھی اساتذہ کی خصوصی توجہ کے بغیر مفید نتائج نہیں پیدا کر سکتیں ۔ مطالب کو موثر بنانے میں الفاظ جو کردار ادا کرتے ہیں اور اچھے لکھنے والے بیان کا لطف پیدا کرنے کے لیے

معمولی معمولی لفظوں سے جو کام لیتے ہیں مشقوں میں ان کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں تاکہ طلبہ میں لفظ اور معنی کے رشتے کا احساس پیدا ہو۔ اس احساس کو صحیح رخ دینے اور اسے طلبہ کے مزاج کی ایک مستقل خصوصیت بنانے کا کام بھی تعلیمی نقطہ نظر سے اتنا اہم ہے کہ اساتذہ کو ہر وقت اس پر نظر رکھنی پڑے گی اور جہاں کہیں بھی ممکن ہوگا وہ طلبہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں گے۔

طلبہ میں لفظوں کے مطالعے سے دلچسپی اور ان سے زیادہ سے زیادہ شناسا اور واقف ہونے کا شوق پیدا کرنا بھی تعلیمی عمل کا ایک مسلّمہ مقصد ہے۔ مشقوں میں اس مقصد کے حصول کو عملی صورت دینے کے لیے جو مختلف طریقے اختیار کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ طالب علموں میں لغت دیکھنے اور حسب ضرورت اپنی مشکل رفع کرنے کی عادت پیدا ہو۔ یہ بات بھی ایسی ہے جس پر استادوں کو ہر وقت نظر رکھنی پڑے گی۔ اس کام کا پہلا مرحلہ تو یہی ہے کہ طلبہ میں آہستہ آہستہ لغت دیکھنے کی عادت پیدا ہو اور دوسرا مرحلہ، جو ہمیشہ جاری رہنے والا مرحلہ ہے، یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہ عادت پڑ جائے تو ہمیشہ قائم رہے۔

اب آخری بات اسباق کی ترتیب کے سلسلے میں۔ اردو کے نصاب اب تک عموماً اس نہج پر مرتب ہوتے چلے آئے ہیں کہ ہم اصناف کی اہمیت سے قطع نظر کر کے انھیں زمانی اعتبار سے ایک دوسرے کے بعد رکھتے چلے جاتے تھے۔ اسباق کو عموماً پڑھایا بھی اسی ترتیب سے جاتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ انھیں پہلے ایسی تحریروں سے سابقہ پڑتا تھا جن کی زبان ان کے اپنے زمانے کی زبان سے ذرا مختلف ہوتی تھی۔ ان تحریروں کے مطالب بھی عموماً ٹھوس اور ادق ہوتے تھے

اس لیے طلبہ پر ان کا پڑھنا ایک طرح کا بوجھ ہوتا تھا، جسے وہ جبراً و قہراً اٹھاتے تھے۔ نصاب کی موجودہ کتاب میں اسباق کو مختلف خانوں میں رکھ کر ان میں زمانی ترتیب قائم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ کہانیوں کا ہے، جس میں داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما سب چیزیں ایک ساتھ آ گئی ہیں۔ بچوں کے لیے جہاں ایک طرف ان کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا، دوسری طرف انھیں داستان، ناول، افسانے اور ڈرامے کے باہمی فرق کو سمجھنے میں بھی مدد دے گا۔ نثر کے انتخابات میں دوسرا حصہ خطوں کا اور تیسرا سنجیدہ مضامین کا ہے۔ ان حصوں میں بھی دلچسپی اور افادیت کا متوازن امتزاج قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسباق کے موضوعات اور مطالب دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف حیثیتوں سے سبق آموز بھی ضرور ہیں۔ نثر کے حصے میں سفرنامے شخصی خاکے اور رپورتاژ کو اس لیے ایک ہی جگہ رکھا گیا ہے کہ ان میں زندگی کے مشاہدے اور اس مشاہدے سے کارآمد نتائج اخذ کرنے کا پہلو غالب ہے۔ آخری حصہ مزاحیہ مضامین کا ہے۔ اس حصے میں دو ایسے مزاح نگاروں کی تحریریں شامل ہیں جن کے نام سے بچے مانوس ہیں۔ دو نام غالباً اکثر طلبہ کے لیے نئے ہوں گے اور یہ علم ان کے لیے عین مسرت کا باعث ہوگا کہ یہ لکھنے والے ان کے اپنے زمانے اور اپنے معاشرے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی کے جو مضامین مجموعے میں شامل کیے گئے ہیں وہ اس سے پہلے کسی درسی کتاب میں نہیں آئے، یہی صورت کرنل محمد خاں اور مشتاق احمد یوسفی کے مضامین کی بھی ہے۔ کتاب کے مؤلفین کو یقین ہے کہ ان مضامین کے مطالعے کے بعد ان کے دل میں اس طرح کی زیادہ چیزیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوگا۔

حصہ نظم کے متعلق بھی چند باتیں کہنے کی ہیں :

(۱) میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے استادوں کو برابر یہ شکایت رہی ہے کہ غزل کے ایسے اشعار پڑھاتے وقت انھیں بڑی دقت پیش آتی ہے جن میں حسن و محبت کے مضامین نظم کیے گئے ہوں - اسی بنا پر استادوں کی بہت بڑی اکثریت نے یہ مشورہ دیا تھا کہ نصاب میں غزلیں بالکل شامل نہ کی جائیں - بدیہی اسباب کی بنا پر یہ بات قابل قبول نہیں تھی - غزل کی ہماری شاعری میں جو بنیادی حیثیت ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے اردو کے نصاب میں غزل کو شامل نہ کیا جائے ، البتہ یہ ضرور ممکن تھا کہ نصاب میں صرف ایسی غزلیں شامل کی جائیں جنھیں پڑھاتے وقت اساتذہ کسی طرح کی نفسیاتی الجھن محسوس نہ کریں - چنانچہ یہی کیا گیا ہے - میر ، درد ، غالب ، آتش ، حالی ، اکبر اور اقبال کی ایسی ہی غزلیں شامل نصاب ہیں -

(۲) استادوں کو یہ شکایت تھی کہ انیس اور اکبر کا جو انتخاب نصاب کی کتابوں میں شامل کیا جاتا ہے وہ مقدار میں اتنا کم ہوتا ہے کہ طلبہ پر انیس اور اکبر کے کلام کی خصوصیات واضح نہیں ہو پاتیں - موجودہ نصاب میں اس شکایت کی تلافی کر دی گئی ہے -

(۳) اس مرتبہ دور جدید کے کلام کو نسبتاً زیادہ نمائندگی دی گئی ہے - یہ بات طالب علموں کے لیے یقیناً دلچسپی کی ہوگی -

کتاب کے آخر میں اصناف کے تعارف اور بعض اصطلاحات کی وضاحت کے لیے جو مختصر تشریحی شذرے شامل کیے گئے ہیں انھیں اگر اساتذہ نے اسباق نظم کے حوالے سے پڑھایا تو طلبہ اصناف نظم کے مطالعے میں زیادہ دلچسپی محسوس کریں گے -

مندرجہ بالا گزارشات میں نصاب کی ترتیب اور ترتیب کے محرکات کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں ہر جگہ ان مفید مشوروں کا عکس ہے جو اساتذہ نے نصاب کو بہتر بنانے کے متعلق دیے تھے۔ ان کے ارشاد کی تعمیل کر دی گئی۔ اس تعمیل کے نتیجے میں جو چیز مرتب ہوئی ہے اسے ہم اردو کی تدریس میں ایک نیا تجربہ کہتے ہیں، لیکن یہ تجربہ اساتذہ کی مخلصانہ کوششوں کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس لیے اساتذۂ کرام کی خدمت میں ہماری التماس ہے کہ مؤلفین کی کوتاہیوں سے صرف نظر کر کے اس تجربے کو اسی خلوص سے قبول کریں جس سے یہ ان کی اور طالب علموں کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مؤلفین

فہرست

ہ - سفرنامے ، رپورتاژ ، خاکے

و - طنز و مزاح

حصہ نظم

الف ـ غزلیات

ب - نظمیں ، قصیدے ، رباعیات

حصهٔ نثر

داستان سے افسانے تک

کہانی ہر ایک کو اچھی لگتی ہے۔ بچے، جوان، بوڑھے، عورت، مرد سب کہانی دلچسپی اور شوق سے سنتے اور پڑھتے ہیں۔ کہانی کے ساتھ انسان کی یہ دلچسپی ہر زمانے میں رہی ہے۔ یہ فرق ضرور ہوا ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ کہانی کی صورتیں بدلتی رہی ہیں۔ جس زمانے میں انسان کو بہت زیادہ فرصت تھی وہ لمبی کہانیاں پسند کرتا تھا، جوں جوں زندگی کے کام بڑھتے گئے، لمبی کہانیوں کا رواج ختم ہوتا گیا اور ان کی جگہ چھوٹی کہانیوں نے لے لی۔

ایک بات اور بھی ہوئی۔ شروع شروع میں انسان کا علم محدود تھا۔ اس کی زندگی سادہ تھی۔ اس میں اتنی الجھنیں اور پیچیدگیاں نہیں تھیں جتنی آج کل کی زندگی میں ہیں۔ اس لیے ابتدائی زمانے کے انسان کو ایسی کہانیاں اچھی لگتی تھیں جن میں اسے ایسی باتیں ملیں جو اس کی اپنی زندگی میں یا آس پاس کی زندگی میں موجود نہیں تھیں۔ اس لیے وہ جنوں، پریوں، دیووں، جادوگروں وغیرہ کی کہانیاں زیادہ پسند کرتا تھا۔

جس طرح کہانیوں کی شکلیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، اسی طرح ان کے ناموں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم اردو کی کہانیوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہم کسی کہانی کو داستان کہتے ہیں، کسی کو

ناول ، کسی کو افسانہ یا مختصر افسانہ اور کسی کو ڈراما۔ کہانی کی ان سب قسموں میں کچھ باتیں ایک سی (یا مشترک) ہوتی ہیں ۔ ہر طرح کی کہانی میں واقعات ہوتے ہیں ، جن سے کہانی کا پلاٹ بنتا ہے ، کچھ اشخاص ہوتے ہیں جن سے یہ واقعات تعلق رکھتے ہیں ۔ انھیں ہم کہانی کے کردار کہتے ہیں ۔ ہر کہانی میں پلاٹ اور کردار کے علاوہ ایک جگہ ہوتی ہے یا مختلف جگہیں ہوتی ہیں اور ایک خاص وقت ہوتا ہے جس میں واقعات پیش آتے ہیں ۔ گویا پلاٹ ، کردار ، مقام اور وقت ایسی چیزیں ہیں جو ہر کہانی میں ضرور ہوتی ہیں ۔ لیکن ہر کہانی میں ان چیزوں کے پیش کرنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے ۔

داستان بھی کہانی ہوتی ہے ، جس میں کئی کہانیاں کڑیوں کی طرح جڑتی چلی جاتی ہیں اور اسے ایک لمبی زنجیر بنا دیتی ہیں۔ اس کے واقعات عام طور سے ہماری تمھاری دنیا کے واقعات کی بجائے بادشاہوں کے محلوں، پرستانوں، جنگل بیابانوں کے واقعات ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ایسے واقعات جو بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں اور ان پر آدمی کو حیرت ہوتی ہے ۔ ان کے کردار انسانوں کے علاوہ جن ، دیو ، پری ، جادوگر وغیرہ ہوتے ہیں اور یہ سب اس طرح کی غیر معمولی باتیں کرتے ہیں جو عام انسان کر ہی نہیں سکتا ۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ داستانوں کی دنیا، خیالی دنیا ہوتی ہے اور اس کے واقعات اور کردار ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم "مافوق الفطرت" (یعنی عام فطرت ، عادت اور مشاہدے کے خلاف) کہتے ہیں ۔

ناول داستان سے چھوٹا ہوتا ہے اور اس میں ناول نگار انسانوں

کی دنیا کے معاملات اور مسائل کو کہانی کے انداز میں پیش کرتا ہے - مختصر افسانہ بالکل ہی چھوٹی کہانی ہے ، اس میں واقعات بھی کم ہوتے ہیں اور کردار بھی اور باتیں اتنی زیادہ نہیں ہوتیں جتنی ناول میں۔ ناول میں تو کسی ایک شخص کی پوری زندگی بھی پیش کی جا سکتی ہے ، لیکن افسانے میں زندگی کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا ہمارے سامنے آتا ہے - ڈراما بھی کہانی کی ایک شکل ہے - اس میں جتنی باتیں بھی سامنے آتی ہیں وہ ڈرامے کے کرداروں کی گفتگو اور عمل کے ذریعے سے - اسی گفتگو اور عمل کی مدد سے کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے - کرداروں کی اس گفتگو کو مکالمہ کہتے ہیں۔ ڈرامے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کے مکالمے اچھے ہوں - جب ہم انھیں سنیں تو ہمیں یہ محسوس ہو کہ ڈرامے کے کردار ہمارے سامنے موجود ہیں اور ہم ان کی باتیں سن رہے ہیں -

اگلے صفحات میں ہم نے کہانی کی ان چاروں قسموں کے بعض نمونے سبق کی صورت میں جمع کیے ہیں - پہلا سبق ایک داستان کا ٹکڑا ہے - دوسرا بھی داستان ہی کا ٹکڑا ہے - اس سے اگلے دو تین ٹکڑے ناولوں کے ہیں، پھر دو افسانے ہیں اور ایک ڈراما - انھیں آپ غور سے پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ نے ہر سبق سے کوئی نہ کوئی اچھی بات سیکھی ہے اور ہر سبق پڑھ کر آپ کو انسان کی زندگی کی کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں - کہانی پڑھنے کا یہی انعام ہے - وہ ہمارے لیے دلچسپی کا سامان بھی مہیا کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں زندگی کی نئی نئی باتیں بتاتی اور نئے سبق بھی سکھاتی ہے۔ چلیے تو بسم اللہ کیجیے۔

پہلا سبق میر امن دہلوی کی مشہور داستان "باغ و بہار"

سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب اب سے کوئی پونے دو سو برس پہلے لکھی گئی تھی ، لیکن اس کی زبان اتنی صاف ، سادہ اور سلیس ہے کہ ہمیں آج بھی اس کے پڑھنے میں لطف آتا ہے۔

میر امن دہلوی

میر امن کا پورا نام میر امان تھا ۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی ۔ پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں ۔ جو کچھ خود انھوں نے اپنے متعلق لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے زمانے سے برابر شاہی ملازمت میں رہے اور مختلف بادشاہوں نے ان کی خدمات کے عوض جاگیریں اور منصب عطا کیے اور اس خاندان نے دلی میں عزت اور خوش حالی کی زندگی بسر کی ۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے آخر میں سورج مل جاٹ اور احمد شاہ درانی کے حملوں نے دلی کو تباہ کیا تو وہاں کے رہنے والے دلی چھوڑ چھوڑ کر دوسرے شہروں کو چلے گئے ۔ اس زمانے میں میر امن اپنے گھر والوں کو لے کر دلی سے عظیم آباد گئے ۔ کئی سال تک وہاں رہے اور وہاں سے روزگار کی تلاش میں کلکتے گئے ۔ کچھ عرصے بیکار رہے ۔ پھر دو سال تک نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی محمد کاظم خاں کے اتالیق رہے اور بالآخر میر بہادر علی حسینی کے وسیلے سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے ۔

میر امن نے دو کتابیں لکھیں ، ایک 'گنج خوبی ، دوسری 'باغ و بہار' ۔ ان دونوں میں ''باغ و بہار'' زیادہ مشہور ہے ۔ اس کتاب میں آزاد بخت بادشاہ اور چار درویشوں کی داستان بیان کی گئی ہے ۔ یہ داستان پہلے فارسی میں تھی ، پھر تحسین نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ۔ لیکن تحسین کی زبان بہت مشکل تھی ۔ میر امن

نے اس قصے کو آسان زبان میں لکھا - میر امن کی باغ و بہار کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے -

میر امن نے باغ و بہار جس آسان اردو میں لکھی ہے وہ دلی کی ٹکسالی زبان ہے - سادگی کے باوجود بیان میں بڑی شگفتگی ہے - پڑھتے وقت نثر میں شعر کا لطف محسوس ہوتا ہے - زبان کے حسن اور دلکشی کے علاوہ، میر امن کی باغ و بہار کو اس کی کردار نگاری اور واقعہ نگاری کی وجہ سے بھی پسند کیا جاتا ہے - اس کتاب کو پڑھ کر دلی کی معاشرت اور تہذیب کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے -

باغ و بہار ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی لیکن آج بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہے - اس کتاب کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں -

★

حاتم کی جواں مردی

[باغ و بہار میں دوسرا درویش فارس کا بادشاہ زادہ ہے - اسے قصے سننے اور ان سے سبق حاصل کرنے کا شوق ہے - اس کے دربار میں ایک مصاحب نے ایک دن حاتم کا قصہ سنایا - حاتم کا قصہ سن کر شہزادے کے دل پر جو اثر ہوا اس کا حال میر امن نے شہزادے ہی کی زبان سے ہمیں سنوایا ہے] -

حاتم کے وقت میں ایک بادشاہ عرب کا نوفل نام تھا - اس کو حاتم کے ساتھ بہ سبب نام آوری کے دشمنی کمال ہوئی بہت سا لشکر فوج جمع کر کر، لڑائی کی خاطر چڑھ آیا - حاتم تو خداترس اور نیک مرد تھا - یہ سمجھا کہ "اگر میں

بھی جنگ کی تیاری کروں تو خدا کے بندے مارے جائیں گے اور بڑی خونریزی ہوگی ۔ اس کا عذاب میرے نام لکھا جائے گا ۔" یہ بات سوچ کر تن تنہا ، اپنی جان لے کر ایک پہاڑی کی کھوہ میں جا چھپا ۔ جب حاتم کے غائب ہونے کی خبر نوفل کو معلوم ہوئی، سب اسباب اور گھر بار حاتم کا قرق کیا ۔ اور منادی کروا دی کہ جو کوئی ڈھونڈ ڈھانڈ کر پکڑ لاوے ، پان سے اشرفی ، بادشاہ کی سرکار سے انعام پاوے ۔ یہ سن کر سب کو لالچ آیا اور جستجو حاتم کی کرنے لگے ۔

ایک روز ایک بوڑھا اور اس کی بڑھیا، دو تین بچے چھوٹے چھوٹے ساتھ لیے ہوئے ، لکڑیاں توڑنے کے واسطے اس غار کے پاس ، جہاں حاتم پوشیدہ تھا ، پہنچے اور لکڑیاں اس جنگل سے چننے لگے ۔ بڑھیا بولی "اگر ہمارے دن کچھ بھلے آتے ، تو حاتم کو کہیں ہم دیکھ پاتے ، اور اس کو پکڑ کر نوفل کے پاس لے جاتے ، تو وہ پانچ سو اشرفی دیتا ، اور ہم آرام سے کھاتے ، اس دکھ دھندے سے چھوٹ جاتے" بوڑھے نے کہا "کیا ٹر ٹر کرتی ہے ؟ ہمارے طالع[1] میں یہی لکھا ہے کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دھر کر بازار میں بیچیں ، تب لون[2] ، روٹی میسر آوے ، یا ایک روز جنگل سے باگھ[3] لے جاوے ۔ لے اپنا کام کر ۔ ہمارے ہاتھ حاتم کاہے کو آوے گا اور بادشاہ اتنے روپے دلاوے گا؟" عورت نے ٹھنڈی سانس بھری اور چپکی ہو رہی ۔

یہ دونوں کی باتیں حاتم نے سنیں ۔ مردی[4] اور مروت سے بعید جانا کہ اپنے تئیں چھپائے ، اور جان کو بچائے ، اور ان

۱۔ قسمت ۔ ۲۔ نمک ۔ ۳۔ شیر ۴۔ مردانگی ۔

دونوں بے چاروں کو مطلب تک نہ پہنچائے - سچ ہے اگر آدمی میں رحم نہیں تو وہ انسان نہیں اور جس کے جی میں درد نہیں وہ قصائی ہے -

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں[1]

غرض حاتم کی جواں مردی نے نہ قبول کیا کہ اپنے کانوں سے سن کر چپکا ہو رہے - وہیں باہر نکل آیا اور اس بوڑھے سے کہا کہ "اے عزیز! حاتم میں ہی ہوں - میرے تئیں نوفل کے پاس لے چل، وہ مجھے دیکھے گا اور جو کچھ روپے دینے کا اقرار کیا ہے دیوے گا -" پیر مرد نے کہا - "سچ ہے اس صورت میں بھلائی اور بہبودی میری البتہ ہے - لیکن وہ، کیا جانیے تجھ سے کیا سلوک کرے اگر مار ڈالے تو میں کیا کروں؟ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ تجھ سے انسان کو اپنی طمع کی خاطر دشمن کے حوالے کر دوں - وہ مال کے دن کھاؤں گا اور کب تلک جیوں گا؟ آخر مر جاؤں گا - تب خدا کو کیا جواب دوں گا؟"

حاتم نے بہتیری منتیں کیں کہ "مجھے لے چل، میں اپنی خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اس آرزو میں رہتا ہوں کہ میرا جان و مال کسو کے کام آوے تو بہتر ہے" لیکن وہ بوڑھا کسی طرح راضی نہ ہوا کہ حاتم کو لے جاوے اور انعام پاوے - آخر لاچار ہو کر حاتم نے کہا - "اگر تو مجھے یوں نہیں لے جاتا تو میں آپ سے

۱- فرشتے -

بادشاہ کے پاس جا کر کہتا ہوں کہ اس بوڑھے نے مجھے آپ جنگل میں ، ایک پہاڑ کی کھوہ میں چھپا رکھا تھا" - وہ بوڑھا ہنسا اور بولا "بھلائی کے بدلے برائی ہے؛ تو یا نصیب" -

رد و بدل کے سوال و جواب میں آدمی اور بھی آن پہنچے بھیڑ لگ گئی - انھوں نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے - ترت[۱] پکڑ لیا - اور حاتم کو لے چلے - وہ بوڑھا بھی افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے ہو لیا - جب نوفل کے روبرو لے گئے ، اس نے پوچھا - "اس کو کون پکڑ لایا ؟" ایک بدذات سنگدل بولا "کہ ایسا کام سوائے ہمارے کون کر سکتا ہے ؟ یہ فتح ہمارے نام ہے - ہم نے عرش پر جھنڈا گاڑ دیا" - ایک اور لن ترانی والا ڈینگ مارنے لگا "کہ میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں - میری محنت پر نظر کیجیے اور جو قرار ہے سو دیجیے" - اسی طرح اشرفیوں کے لالچ سے ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا - وہ بوڑھا چپکا ایک کونے میں لگا ہوا سب کی شیخیاں سن رہا تھا اور حاتم کی خاطر کھڑا روتا تھا -

جب اپنی اپنی دلاوری اور مردانگی سب کہہ چکے - تب حاتم نے بادشاہ سے کہا - "اگر سچ بات پوچھو تو یہ ہے کہ "وہ بوڑھا جو الگ سب سے کھڑا ہے ، مجھ کو لایا ہے - اگر قیافہ پہچانتے ہو تو دریافت کرو اور میرے پکڑنے کی خاطر جو قول کیا ہے ، پورا کرو کہ سارے ڈیل[۲] میں زبان حلال ہے - مرد کو چاہیے ، جو کچھ کہے سو کرے - نہیں تو جیبھ[۳] حیوان کو بھی خدا نے دی ہے - پھر حیوان اور

۱- فوراً - ۲- جسم - ۳ - زبان-

انسان میں کیا تفاوت ہے" ؟

نوفل نے اس لکڑہارے بوڑھے کو پاس بلا کر پوچھا۔ کہ "سچ کہہ، اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ لایا ہے ؟" اس بے چارے نے سر سے پاؤں تک جو گزرا تھا راست کہ سنایا۔ اور کہا "حاتم میری خاطر آپ سے آپ چلا آیا ہے!" نوفل یہ ہمت حاتم کی سن کر، متعجب ہوا کہ "بل بے تیری سخاوت! اپنی جان کا بھی خطرہ نہ کیا"؟ جتنے جھوٹ دعوے، حاتم کو پکڑ لانے کے کرتے تھے، حکم کیا۔ ان کی ٹنڈیاں کس کر[1]، پانسو اشرفی کے بدلے پان پان سو جوتیاں ان کے سر پر لگاؤ کہ ان کی بھی جان نکل پڑے۔ وونہیں تڑ تڑ پیزاریں پڑنے لگیں کہ ایک دم میں سر ان کے گنجے ہو گئے۔ سچ ہے جھوٹ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی گناہ اس کو نہیں پہنچتا۔ خدا سب کو اس بلا سے محفوظ رکھے اور جھوٹ بولنے کا چسکا نہ دے۔ بہت آدمی جھوٹ موٹ بکے جاتے ہیں لیکن آزمائش کے وقت سزا پاتے ہیں۔

غرض ان سب کو، موافق ان کے، انعام دے کر، نوفل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم سے شخص سے (کہ ایک عالم کو اس سے فیض پہنچتا ہے اور محتاجوں کی خاطر جان اپنی دریغ نہیں کرتا۔ اور خدا کی راہ میں سر تا پا حاضر ہے) دشمنی رکھنی اور اس کا مدعی ہونا، شرط آدمیت اور جواں مردی سے بعید ہے۔ وہیں حاتم کا ہاتھ بڑی دوستی اور گرم جوشی سے پکڑ لیا۔ اور کہا "کیوں نہ ہو، جب ایسے ہو تب ایسے ہو" تواضع، تعظیم کر کر پاس بٹھایا۔ اور حاتم کا ملک و املاک

۱۔ ہاتھ پیچھے کو باندھ کر۔

اور مال و اسباب جو کچھ ضبط کیا تھا ، وہیں چھوڑ دیا۔ نئے سرے سے سرداری قبیلہ طے کی اسے دی اور اس بوڑھے کو پانچ سو اشرفیاں اپنے خزانے سے دلوا دیں۔ وہ دعا دیتا ہوا چلا گیا۔

جب یہ ماجرا حاتم کا میں نے تمام سنا ، جی میں غیرت آئی۔ اور یہ خیال گزرا کہ حاتم اپنی قوم کا فقط رئیس تھا جس نے ایک سخاوت کے باعث یہ نام پیدا کیا کہ آج تلک مشہور ہے۔ میں خدا کے حکم سے بادشاہ تمام ایران کا ہوں۔ اگر اس نعمت سے محروم رہوں۔ تو بڑا افسوس ہے۔ فی الواقع دنیا میں کوئی کام بڑا دادودہش سے نہیں۔ اس واسطے کہ آدمی جو کچھ دنیا میں دیتا ہے اس کا عوض عاقبت میں لیتا ہے۔ اگر کوئی ایک دانہ بوتا ہے تو اس سے کتنا کچھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات دل میں ٹھہرا کر ، میر عمارت کو بلوا کر حکم کیا کہ ایک مکان عالیشان ، جس کے چالیس دروازے ، بلند اور بہت کشادہ ہوں۔ باہر شہر کے جلد بنواؤ۔ تھوڑے عرصے میں ویسی ہی عمارت وسیع ، جیسا دل چاہتا تھا ، بن کر تیار ہوئی۔ اور اس مکان میں ہر روز ، ہر وقت ، فجر سے شام تک ، محتاجوں اور بے کسوں کے تئیں روپے ، اشرفیاں دیتا اور جو کوئی جس چیز کا سوال کرتا ، اسے مالا مال کرتا۔

غرض چالیسوں دروازوں سے حاجت مند آتے ، اور جو چاہتے سو لے جاتے۔ ایک روز کا یہ ذکر ہے کہ ایک فقیر سامنے کے دروازے سے آیا اور سوال کیا۔ میں نے اسے ایک اشرفی دی۔ پھر وہی دوسرے دروزے سے ہو کر آیا دو اشرفیاں مانگیں۔ میں نے پہچان کر در گزر کی اور دیں۔ اسی طرح ان نے

ہر ایک دروازے سے آنا اور ایک ایک اشرفی بڑھانا شروع کیا اور میں بھی جان بوجھ کر انجان ہوا ۔ اور اس کے سوال کے موافق دیا کیا ۔ آخر چالیسوں دروازے کی راہ سے آکر چالیس اشرفیاں مانگیں ۔ وہ بھی میں نے دلوا دیں ۔ اتنا کچھ لے کر وہ درویش پھر پہلے دروازے سے گھس آیا ۔ اور سوال کیا ، مجھے بہت برا معلوم ہوا ۔ میں نے کہا ۔ سن اے لالچی ! تو کیسا فقیر ہے ؟ کہ ہر گز فقر کے تینوں حرفوں سے بھی واقف نہیں ؟ فقیر کا عمل ان پر چاہیے !

فقیر بولا "بھلا داتا ! تمھیں بتاؤ " میں نے کہا ۔ "ف سے فاقہ ، ق سے قناعت ، اور ر سے ریاضت نکلتی ہے جس میں یہ باتیں نہ ہوں وہ فقیر نہیں ۔ اتنا جو تجھے ملا ہے ۔ اس کو کھا پی کر پھر آئیو اور جو مانگے گا، لے جائیو ۔ یہ خیرات احتیاج رفع کرنے کے واسطے ہے ، نہ جمع کرنے کے لیے! اے حریص چالیس دروازوں سے تو نے ایک اشرفی سے چالیس اشرفیاں تک لیں ۔ اس کا حساب تو کر کہ ریوڑی کے پھیر کی طرح کتنی اشرفیاں ہوئیں اور اس پر بھی تجھے حرص پھر پہلے دروازے سے لے آئی ۔ اتنا مال جمع کر کر کیا کرے گا ؟ فقیر کو چاہیے کہ ایک روز کی فکر کرے ۔ دوسرے دن پھر نئی روزی، رزق دینے والا موجود ہے اب حیا و شرم پکڑ اور صبر و قناعت کو کام فرما! یہ کیسی فقیری ہے؟ جو تجھے مرشد نے بتائی ہے ۔"

یہ میری بات سن کر خفا اور بد دماغ ہوا اور جتنا مجھ سے لے کر جمع کیا تھا ۔ سب زمین پر ڈال دیا ۔ اور بولا ۔ "بس بابا ! اتنے گرم مت ہو ۔ اپنی کائنات لے کر رکھ چھوڑو ۔

پھر سخاوت کا نام نہ لیجیو - سخی ہونا بہت مشکل ہے تم سخاوت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے - اس منزل کو کب پہنچو گے؟ ابھی دلی دور ہے - سخی کے بھی تین حرف ہیں - پہلے ان پر عمل کرو - تب سخی کہلاؤ -"

تب تو میں ڈرا اور کہا - "بھلا دانا! اس کے معنی مجھے سمجھاؤ" کہنے لگا "س سے سمائی، اور خ سے خوف الٰہی اور ی سے یاد رکھنا اپنی پیدائش اور مرنے کو، جب تلک اتنا نہ ہو لے - تو سخاوت کا نام نہ لے - اور سخی کا یہ درجہ ہے کہ اگر بدکار ہو، تو بھی دوست خدا کا ہے - اس فقیر نے بہت ملکوں کی سیر کی ہے - لیکن سوائے بصرے کی شہزادی کے کوئی سخی دیکھنے میں نہیں آیا - سخاوت کا جامہ خدا نے اس عورت پر قطع کیا ہے - اور سب نام چاہتے ہیں - پر ویسا کام نہیں کرتے -"

یہ سن کر میں نے بہت منت کی اور قسمیں دیں کہ "میری تقصیر معاف کرو اور جو چاہو سو لے لو -" میرا دیا ہرگز نہ لیا - اور یہ بات کہتا ہوا چلا - "اب اگر اپنی ساری بادشاہت مجھے دے تو میں اس پر بھی نہ تھوکوں" وہ تو چلا گیا - پر بصرے کی شہزادی کی یہ تعریف سننے سے دل بے کل ہوا - کسی طرح کل نہ تھی - اب یہ آرزو ہوئی - کہ کسی صورت سے بصرے چل کر اس کو دیکھا چاہیے -

(میر امن)

مشقیں

(۱) حاتم کی جواں مردی، کا جو حال آپ نے ابھی پڑھا، یہ میر امن کی باغ و بہار میں سے لیا گیا ہے۔ باغ و بہار ہر جگہ بڑی آسانی سے مل جاتی ہے - کسی چھٹی میں اسے پڑھیے، آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔

(۲) آپ نے جو قصہ ابھی پڑھا اس میں حاتم کی "جواں مردی" کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس جواں مردی میں اس کی وہ سخاوت بھی شامل ہے جس کے لیے اس کا نام ضرب المثل بن گیا ہے۔ جس طرح حاتم اپنی سخاوت کے لیے مشہور ہے اسی طرح نوشیرواں اور رستم بھی اپنی ایک ایک صفت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ بتائیے وہ کون سی صفات ہیں؟

(۳) سرسید، اقبال اور قائداعظم ہمارے عظیم قومی رہنما ہیں۔ ان تینوں نے مسلمانوں کے لیے بے شمار خدمات انجام دیں۔ آپ ان تینوں کی ایک ایک ایسی خدمت کا نام بتائیے جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

(۴) میر امن نے "حاتم کی جواں مردی" میں ایک شعر لکھا ہے:-

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اس شعر کا مطلب اچھی طرح سمجھ کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

رجب علی بیگ سرور

رجب علی بیگ کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ وہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سرور ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوئے زمانے کے رواج کے مطابق فارسی، عربی کی تعلیم حاصل کی۔ خطاطی اور موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کی اور ان دونوں چیزوں میں انھیں کمال حاصل تھا۔ شاعری کا بھی شوق تھا اس فن میں آغا نوازش حسین نوازش کے شاگرد تھے۔

کہا جاتا ہے کہ نواب غازی الدین حیدر کسی بات پر ناراض ہوگئے اور انھیں جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ وہ کانپور چلے گئے۔ غازی الدین حیدر کے بعد نواب نصیرالدین حیدر حکمران ہوئے تو ان کا قصور معاف ہو گیا اور وہ لکھنؤ واپس آگئے۔ اودھ کے آخری حکمران نواب واجد علی شاہ نے انھیں درباری شاعروں میں شامل کر لیا اور پچاس روپے مہینہ تنخواہ مقرر کی۔ لیکن ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کی سلطنت پر خود قبضہ کر کے واجد علی شاہ کو کلکتے بھیج دیا اس کے بعد سرور کی زندگی تنگ دستی میں بسر ہونے لگی۔ کچھ عرصہ یوں ہی گزرا۔ ۱۸۵۹ء میں مہاراجا بنارس نے اپنے پاس بلا لیا اور بڑی عزت کے ساتھ رکھا۔ مہاراجا پٹیالہ نے جواہرنگار چوڑیوں کا جوڑا تحفے کے طور پر بھیجااور بڑی عزت سے اپنے

پاس بلایا - سرور نے دہلی ، لکھنؤ اور راجپوتانہ کا سفر بھی کیا - ١٨٦٣ء میں آنکھوں کے علاج کے لیے کلکتے گئے - وہاں سے لکھنؤ واپس آ گئے اور آنکھ کا اپریشن کرا کے بنارس چلے گئے - یہیں ١٨٦٨ء میں (غالب کی وفات سے ایک سال پہلے) انتقال ہوا -

لکھنؤ کے نثر نگاروں میں سرور سب سے زیادہ مشہور ہیں - انھوں نے مندرجۂ ذیل کتابیں لکھیں: شگوفۂ محبت ، گلزار سرور ، شبستان سرور ، شور عشق اور فسانۂ عجائب - لیکن فسانۂ عجائب ان سب میں زیادہ مشہور ہے - اردو نثر اور داستانوں کی تاریخ میں جس طرح میر امن کا نام باغ و بہار کی وجہ سے زندہ ہے اسی طرح سرور کا نام فسانۂ عجائب کی وجہ سے باقی ہے -

فسانۂ عجائب کو اول تو اس کے قصے کی دلچسپی کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے اور دوسرے اس کے رنگین طرز تحریر کی وجہ سے - اس طرز تحریر کو اردو میں مقفلی اور مسجع عبارت کا بہترین نمونہ سمجھاجاتا ہے - سوداگر کے بیٹے کا جو قصہ آپ ابھی پڑھیں گے وہ فسانۂ عجائب کا ایک ٹکڑا ہے -

*

قصہ سوداگر کے بیٹے کا

ایک شخص تھا مجسٹن نام ، اہل دول[1] ، مرفہ حال ، صاحب علم و فضل ، جامع ہر کمال ، طبیب و ادیب بےبدل ، سخن سنج ، لطیفہ گو ، بر محل ، کمالات میں یگانۂ روزگار تجارت میں نامور بردبار ، سو سو جہاز ایک بار تجارت کو جاتا تھا نصیب ایسا تھا کہ مٹی کو چھوتا تو سونا ہاتھ آتا تھا -

---

١ - دولت مند -

کسی طرح کا حاجت مند، بجز فرزند ارجمند نہ تھا شب و روز اسی کا خیال تھا۔ مدام فرحت میں یہ ملال تھا۔ خوش قسمتوں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے، تمنائے دل حصول ہوتی ہے۔ پچھتر برس کے سن میں اللہ نے بیٹا عنایت کیا۔ حسب دلخواہ، صورت میں غیرت ماہ، بہت شاداں و سر گرم پرورش تھا۔ جب بارہ برس کا ہوا، بسبب طبع رسا و تعلیم استادان با ذکا، جمیع علوم و فنون میں کامل ہوا۔ درس دینے لگا۔ مطب کرنے لگا۔ چودھویں سال باپ سے اجازت چاہی کہ تجارت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے۔ مجسٹن نے کہا "اپنا بھی یہی قصد تھا، مگر چندے توقف شرط ہے" اس نے عرض کی۔ "حضور عمر طبعی کو پہنچے، مُسن ہیں۔ فدوی کے سیاحت کے دن ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے بقید حیات سفر کو جاؤں، جودت طبع دکھاؤں" آخر مجسٹن نے دس بارہ جہاز پر متاع ومال، پندرہ بیس رفیق قدیم دیانت دار، امانت شعار ہمراہ کر رخصت کیا۔

جہاز ایک سمت روانہ ہوئے دو مہینے کے بعد ہوائے جور گردوں سے جہاز تباہ ہو گئے۔ مجسٹن کے بیٹے کا جہاز بھی ڈوبا۔ یاران ہمراہی، عالم بقا کو راہی ہوئے۔ یہ ایک تختے پر ڈوبتا، اچھلتا، بہ چلا۔ حیات مستعار باقی تھی۔ ساتویں دن تختہ کنارے پر لگا۔ اس کو غش سے جو افاقہ ہوا، تختے سے اترا اور گھاس کی رسی بنا، وہ تختہ پتھر سے اڑکا دیا۔ پھر آپ بہ تلاش آب و دانہ روانہ ہوا۔ چند قدم اور بڑھا تھا کہ شہر نمودار ہوا۔ آہستہ آہستہ بیٹھتا، اٹھتا شہر میں داخل ہوا۔

وہاں عجب سانحہ ، طرفہ ماجرا نظر آیا ۔ دکان پر ایک کھلی ، اشرفی روپے کا ڈھیر ۔ اسباب سب طرح کا موجود ، مگر آدمی کا پتہ مفقود ۔ اس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصے سے یہ بازار جنسِ بشر سے خالی ہے ۔ شہر کا نہ وارث ہے نہ والی ہے ۔ پھرتا پھراتا قلعے میں آیا ۔ دیکھا، باغ سرسبز، پر میوہ، بیچ میں بنگلہ کے نفیس پردے پڑے ، پردہ اٹھا ، بنگلے میں آیا ، پلنگ جواہر نگار گسترده ، اس پر کوئی بہشکل مردہ ، دوپٹہ تانے ، نہ کوئی پائینتی نہ سرھانے ، پڑا ہے ۔ اس نے دوپٹہ سرکایا ۔ عورت نے چونک کر سر آٹھایا ۔ اس کی صورت دیکھ کر کہا "اے عزیز ! اپنی جوانی پر رحم کر ۔ یہ مکان نہیں، سیلِ فنا ہے، تو نا آشنا ہے اس لیے درگزر ، وگرنہ آفت کا مبتلا ہوگا ۔ خدا جانے ایک دم میں کیا ہوگا "؟ اس نے کہا ۔ "ایسا ماجرا کیا ہے ؟ بیان تو کر" ۔

عورت نے کہا ۔ "تو پہلے اپنے آنے کا حال سنا ، کیونکر آ پھنسا" ۔ اس نے کہا ۔ "سات دن سے بھوکا ، پیاسا ہوں ۔ جو کچھ کھاؤں تو داستانِ پریشان سناؤں "۔ عورت بولی۔ "مدت کے بعد کھانے کا نام تیرے منہ سے سنا ہے ۔ سو کھانا یہاں کہاں ؟ بجز غم کھانے کے ، اور پانی ، سوا اشک بہانے کے ۔ آنسو پینے کا نام ہے ، اس لیے نہیں پیتی ہوں ، اور کھانے کی قسم سے قسم تک نہیں کھاتی ہوں ۔ متحیر ہوں کیونکر جیتی ہوں۔ مگر تنہائی میں، ہاں خوف کھاکے روز دن بھرتی ہوں ، ہر شب کہ شبِ اولین گور ہے ، جاگتی رہتی ہے سخت جانی کی بدولت نہیں مرتی ہوں ۔ تو اس باغ میں جا اور جس میوے پر رغبت ہو کھا"۔

مجسٹن کے بیٹے نے جا کے میوہ کھایا - نہر سے پانی پیا ، گونہ رنج فاقہ کشی سے افاقہ ہوا - پھر عورت کے پاس آ کے حسب و نسب اپنا اور باعثِ سفر اور جہاز کی تباہی کی مفصل سرگزشت سنائی - پھر اس کا ماجرا پوچھا - وہ بولی - "اے شخص ! اس شہر بے چراغ کی میں شہزادی ہوں، باپ میرا والیِ ملک تھا- مجھ کو سوائے سیر و شکار کے کسی امر سے سروکار نہ تھا- ایک روز لبِ دریا مصروف تماشا بیٹھی تھی - دفعتاً ایک سانپ نمودار ہوا اور میری طرف بڑھا - میں نے تیر مارا نا معلوم لگا یا خطا کر گیا - پھر جو دیکھا تو اژدہائے مہیب بہ‌شکلِ عجیب جھپٹا آتا ہے - میں تو گھوڑے پر چڑھ کر بھاگی - جو جو ہمرکاب تھے ، وہ طعمۂ دہن مارِ خونخوار ہوئے - کہاں تک بیان کروں - ساکناں شہر مع بادشاہ انسان سے تا حیوان کوئی نہ بچا - فقط میں سخت جان باقی ہوں - اور یہ صورت ہے کہ قریبِ شام وہ مارِ خون آشام آکر اس بنگلے کے نیچے بیٹھتا ہے - دو گھڑی کے بعد غائب ہو جاتا ہے - مجھ پر جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے ، اسی باغ سے میوہ کھا ، پانی پی لیتی ہوں - اس خرابی سے جیتی ہوں، کوئی غمخوار بجز ذات پروردگار نہ تھا- آج تجھے دیکھا ، خود خدا آگیا ، مطلع کر دیا "-

پسر مجسٹن نے کہا - "خاطرِ پریشان جمع رکھ - اگر فضل الٰہی شریکِ حال ہے تو اس آفت سے جلد نجات ہو جائے گی " یہ کہہ کر جہاں سانپ کے بیٹھنے کا نشان تھا - وہاں گڑھا کھودا - قلعہ سے بارود لا کر اس میں بچھائی اور دور تک نقب سی بنائی - پھر گھاس ہری اس پر جمائی - شہزادی نے کہا - "اب وہ آتا ہی ہو گا"- یہ سن کر سر نقب جا ، پوشیدہ ہو کر

بیٹھ رہا کہ دفعتاً وہ افعئی پر زہر ، خدا کا قہر آیا اور اپنی جگہ پر اس سبز قدم نے فرشِ زمردیں پایا - بہت خوش ہو کر بیٹھا یہ تو تاک میں تھا - پتھر سے آگ نکال اس نقب میں ڈال دی - فوراً ایک دھاکہ پیدا ہوا - وہ ٹکڑا زمین کا مع سانپ آسمان پر پہنچا - دونوں نے شکر کا سجدہ بارگاہِ دافع البلیات کیا - باہم بے اندیشہ و غم رہنے لگے - سات برس تک دونوں ساتھ رہے - اس عرصے میں دو لڑکے بھی پیدا ہوئے - ایک دن رنجِ تنہائی کی شہزادی نے شکایت کی "کہ اکیلے طبیعت نہیں لگتی - کوئی ترکیب ایسی نکالوکہ پھر یہ شہر آباد ہو - خاطرِ غمگین شاد ہو" - وہ بولا "کہ اگر میں وطن جاؤں اور مجسٹن کو یہاں لاؤں تو یہ بستی بسے" - عورت نے کہا - "اکیلی میں کیونکر بسر کروں گی ؟ میں بھی ساتھ چلوں گی" - آخرش ایک ایک لڑکا گود میں لے کے چل نکلے - قضارا وہاں پہنچے جہاں تختہ بندھا تھا- ذہن میں آیا- اسی پر سوار ہو، کھول دو، کہیں تو جا نکلے گا- یہ سوچ کر دونوں سوار ہوئے- وہ تختہ کھولنے لگا - شہزادی بولی - "مال و اسباب تو اس قدر ہے کہ بیان قاصر ہے مگر ایک ناریل اکسیر سے بھرا ہے ، دولت لا انتہا ہے جو تو اجازت دے تو اسے لے آؤں "؟

مجسٹن کے بیٹے نے کہا - "اچھا" وہ تختہ کچھ کھلا کچھ بندھا یونہی رہا شہزادی لڑکا لیے آتری - اس کے اترتے ہی ایسی تند ہوا چلی کہ رسی تکان سے ٹوٹ گئی- تختہ بہ چلا- ہرچند اس نے ہاتھ پاؤں مارے - وہ ساحلِ مطلب سے کنارے ہوا - کنارے پر شہزادی بحال خراب ، دریا میں وہ بادل کباب؛ بہ نکلا - دل سے کہتا تھا- دیکھیے مرضی ناخدائے کشتیِ بادبان

شکستہ کیا ہے ، یہ جھونکا ہوائے قوم عاد کا ہے ۔ اس سوچ میں تھا کہ ایک جہاز نمودار ہوا ۔ اہلِ جہاز نے دیکھا ، تختے پر کوئی جوان گود میں لڑکا نادان لیے بہا جاتا ہے۔ رحم کھا، پنسوئی کو دوڑا ، جہاز پر لیا ۔ اتفاق زمانہ مالکِ جہاز مجسٹن کا دوست و دمساز تھا ۔ اس کو پہچان بہت تعظیم وتکریم سے پیش آیا ۔ برس روز میں جہاز کلکتے میں داخل ہوا ۔ جہاز کا حاکم مجسٹن کی ملاقات کو آیا، بچھڑے بیٹے کو باپ سے ملایا ۔

یہاں جس دن سے جہاز کی تباہی مجسٹن نے سن پائی تھی ۔ غریقِ لجہ غم تھا ۔ بارے بیٹے کو دیکھ کر سجدہ بارگاہِ باری کیا ۔ پوتا گھاتے میں ملا ۔ اور کلمات شکریہ اس سے کرنے لگا ۔ اس نے کہا "بندہ پرور ! خبر ہے ، دنیا اسی کا نام ہے ۔ جس کا کام جس سے نکلے وہ فخر و سعادت سمجھے" بعد چند روز کے مجسٹن نے بیٹے سے روئیدادِ سفر پوچھی ۔ اس نے ابتدا سے انتہا تک سرگزشت سب بیان کر دی ۔

مشقیں

۱ ۔ آپ نے سوداگر کے بیٹے کا قصہ پڑھا ۔ یہ قصہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اگر آپ کا جی چاہتا ہے کہ اس قصے کو پورا پڑھیں تو لائبریری سے فسانہ عجائب نکلوائیے اور قصے کو پورا پڑھ لیجیے ۔

۲ ۔ مندرجہ ذیل ترکیبیں سبق میں استعمال ہوئی ہیں ۔ آپ بھی انھیں جملوں میں استعمال کیجیے :-

عمرِ طبعی - بقیدِ حیات - عالم بقا - راہیِ عالم بقا - طرفہ ماجرا۔ حیاتِ مستعار -

۳ - اوپر کے سبق میں ایک لفظ ''ہمرکاب'' آیا ہے - یہ ہم اور رکاب سے مل کر بنا ہے - اس طرح کے پانچ لفظ بنائیے جن کی بناوٹ اسی طرح کی ہو -

۴ - اوپر کے سبق کو غور سے پڑھیے اور یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ مقفیٰ اور مسجع عبارت میں کیا فرق ہے -

نذیر احمد دہلوی

مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶-۱۹۱۲ء) کے والد مولوی سعادت علی ضلع بجنور کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے مشہور تھے۔ نذیر احمد اسی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور ان کے ایک عالم دوست سے حاصل کی۔ ابھی ۸-۹ برس کے تھے کہ پڑھنے کے لیے دلی آ گئے۔ پہلے مسجد کے مدرسے میں پڑھا اور پھر دلی کالج میں۔ طالب علمی کا زمانہ بڑی تکلیف سے گزارا، لیکن پڑھنے کے شوق میں ساری تکلیفیں برداشت کیں اور آخر دلی کالج میں تعلیم مکمل کی۔ تعلیم کے زمانے میں برابر وظیفہ حاصل کیا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر پہلے کنجاہ، ضلع گجرات میں چالیس روپے ماہوار پر مدرس ہوئے۔ پھر الٰہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ پہلے تحصیل داری اور پھر ڈپٹی کلکٹری کا امتحان دیا اور دونوں امتحانوں میں اول رہے۔ ۱۸۷۷ء میں ملازمت پر حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں ساڑھے آٹھ سو تنخواہ مقرر ہوئی۔ چند سال وہاں ملازمت کی۔ تنخواہ ۱۷۰۰ روپے ماہوار تک پہنچ گئی۔ لیکن وقت سے پہلے ہی ملازمت چھوڑ کر چلے آئے اور باقی عمر دلی میں رہ کر علمی اور ادبی خدمت کرتے رہے۔

۱۸۹۷ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ علمی خدمات کے صلے میں ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا سے ایل۔ ایل۔ ڈی حاصل کی اور ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے

ڈی - او - ایل کی ڈگری دی -

مولوی نذیر احمد کا شمار اپنے زمانے کے بڑے عالموں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے قانون کی کئی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے کیا - وہ ترجمہ آج تک مستند سمجھا جاتا ہے - اسی طرح قرآن شریف کا ترجمہ بھی کیا ، جسے لوگ آج کل بھی پڑھتے ہیں - لیکن اردو کے عام پڑھنے والوں میں نذیر احمد کی شہرت ان کے ناولوں کی وجہ سے ہے - ناولوں میں مرأة العروس ، بنات النعش ، توبۃالنصوح، ابن الوقت اور فسانۂ مبتلا زیادہ مشہور ہیں - موعظۂ حسنہ ان کے خطوں کا مجموعہ ہے -

نذیر احمد کے ناولوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ان میں اپنے زمانے کے مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی بڑی صحیح عکاسی کی ہے- اپنے ناولوں کے ذریعے نذیر احمد نے مسلمانوں کوعورتوں کی تعلیم، دینی تعلیم، کفایت شعاری، تجارت اور صنعت کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی پہلی دو کتابیں مرأۃالعروس اور بنات النعش خاص کر عورتیں کے لیے لکھی گئی ہیں اور ان میں بتایا گیا ہے کہ عورتوں کے لیے تعلیم کیوں ضروری ہے ؟ توبۃ النصوح میں مذہبی زندگی اختیار کرنے کا سبق ہے اور ابن الوقت میں ایسے مسلمانوں کی زندگی کا نقشہ ہے جو انگریزوں کی دیکھا دیکھی مغربی معاشرت اختیار کرتے اور طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتے تھے -

نذیر احمد اپنے ناولوں میں دلی کی ٹھیٹ روزمرہ زبان استعمال کرتے ہیں - انھیں محاورے استعمال کرنے کا بھی بہت شوق ہے - نذیر احمد کے بیان میں روانی اور

بے ساختگی کے ساتھ ساتھ بڑا زور ہے۔ ان کی بات سیدھی دل میں گھر کرتی ہے۔ وہ حسبِ موقع مزاح سے بھی کام لیتے ہیں اور واقعات کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں جیسے یہ واقعات ہم خود اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے کردار ہمیں اپنے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں میں مکالمے بہت دلچسپ ہیں اور ہر بات اس کردار کے مزاج کے مطابق ہے جس کی زبان سے نکلی ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں نے مسلمانوں کی زندگی کی اصلاح میں وہی حصہ لیا ہے جو سر سید کی نثر اور حالی اور اقبال کی شاعری نے۔

★

اصغری کا مکتب

[ذیل کا اقتباس نذیر احمد کے پہلے ناول مرأۃ العروس سے لیا گیا ہے۔ یہ ناول خاص طور سے لڑکیوں کی تربیت کے لیے لکھا گیا ہے۔]

اگلے روز جو سفیہن آئی۔ تو لڑکیوں کے کشیدے اور لڑکیوں کے بنے ہوئے گوٹے، لڑکیوں کے موڑے ہوئے گوکھرو، لڑکیوں کی بنائی ہوئی توئیاں اور چنیا، لڑکیوں کے قطع کیے ہوئے اور سیے ہوئے مردانے، زنانے کپڑے، اصغری نے سب دکھائے۔ جن کے دیکھنے سے سفیہن کو نہایت اچنبا ہوا۔

اس کے بعد لڑکیوں کی گڑیوں کے گھر دکھائے، ان گھروں میں خانہ داری کا سب لوازمہ، فرش فروش، گاؤ تکیے

اگالدان، چلمچی، آفتابہ، پٹاری، پردہ، چلمن، چھت گیری ، پنکھا ، مسہری ، پلنگ ہر طرح کے برتن ، ہر طرح کا سامانِ آرائش اپنے اپنے ٹھکانے سے رکھا ہوا تھا ۔ اور گڑیاں ایسی سجی ہوئی تھیں کہ گویا عین مین شادی کے گھر میں مہمان جمع ہیں ۔

جب گڑیوں کے گھر کو دیکھ چکی ۔ تو اصغری نے سفیہن سے کہا کہ "لڑکیوں کے سب کھیلوں میں مجھ کو گڑیوں کا کھیل پسند ہے ۔ اس کے ذریعے لڑکیاں سینا ، پرونا کپڑوں کی قطع اور گھر کا بندوبست ہر طرح کی تقریبات ، چھٹی ، کھیر چٹائی ، دودھ چھڑائی ، بسم اللہ ، روزہ ، منگنی، عیدی ، سانوئی ، محرم کی قفلیاں اور گوٹا ، تیج تہوار ، ساچق[1] برات ، بھوڑا[2] بیاہ ، چالے[3] ، چوتھی[4] کی راہ و رسم سے واقفیت حاصل کرتی ہیں ۔

ہوا سفیہن ! تمھاری لڑکی تو ابھی تھوڑے دنوں سے آتی ہے جو لڑکیاں میرے مکتب میں بہت دنوں سے ہیں جیسی یہ بیٹھی ہے ۔ ام البنین یا میری نند محمودہ یا حسن آرا ، توبہ توبہ کرکے کہتی ہوں کہ اگر ان کو کسی بڑے، بھرےپرے گھر کا انتظام اس وقت سونپ دیا جائے ۔ تو انشاءاللہ ایسا کریں گی جیسے کوئی بڑی مشاق کرتی ہیں ۔ میں صرف پڑھنے پر تاکید نہیں کرتی ۔ ان کو دنیا کے کام کا بناتی ہوں جو چند روز بعد ان کے سر پڑے گا ۔"

یہ کہہ کر اصغری نے حسن آرا کو بلایا ۔ اور کہا ۔

۱-۴ ۔ یہ سب شادی بیاہ کے موقعے کی رسمیں ہیں ۔ کسی اچھے سے لغت میں ان کے معنی دیکھیے ۔

کہ "بوا ! تمہارا گڑیا کا گھر تو خوب آراستہ ہے - صرف ایک کسر ہے کہ تمہاری گڑیوں کے پاس رنگین جوڑے نہیں معلوم ہوتے - شاید تم کو رنگنا نہیں آتا"۔

حسن آرا نے کہا - "رنگ تو مجھ کو محمودہ بیگم نے سب سکھا دیئے ہیں یونہی نہیں رنگے" -

اصغری نے کہا : "بھلا بتاؤ تو" ؟

حسن آرا بولی: "استانی جی ! برسات کے رنگ سرخ ، نارنجی ، گل انار ، گل شفتالو ، سردئی ، دھانی ، اودا اور جاڑے کے : گیندئی ، جوگیا ، عنابی ، کاہی ، تیلیا ، کاکریزی ، سیاہ، نیلا ، گلابی ، زعفرانی ، کوکنی ، کرنجوی اور گرمی کے : پیازی، آبی ، چمپئی، کپاسی ، بادامی ، کافوری ، دودھیا ، خشخاشی ، فالسئی ، ملاگیری ، سیندوریا - اور رنگ تو اور بہت ہیں - مگر میں نے وہی بیان کیے جو اکثر پہنے جاتے ہیں" -

اصغری نے پوچھا - "رنگوں کے نام تو تم نے بہت گنوا دیے - بھلا یہ تو بتاؤ کہ یہ سب رنگ تم کو رنگنے آتے ہیں؟" -

حسن آرا نے بہت کہا - "میں نے انھیں رنگوں کا نام لیا ہے جو مجھ کو خود رنگنے آتے ہیں" -

اصغری نے کہا - "بھلا بتاؤ ؟ سردئی کیونکر رنگتے ہیں ؟"

حسن آرا نے کہا: "کاہی قند ، اچھی گہرے رنگ کی ، آدھ گز منگوائی اور پانی کو خوب جوش کرکے پھٹکڑی ڈال دی - اور اوپر سے قند کا ٹکڑا ڈال کر ہلا دیا - پھٹکری کی تاثیر سے قند کا رنگ کٹ جائے گا - بس اس میں کپڑا رنگ لیا" -

اصغری نے کہا: "بھلا اور جو قند نہ ملے !"

حسن آرا نے کہا ۔ "تو ٹیسو کے پھولوں کو جوش دے کر پھٹکری پیس کر ملا دے ۔ سردئی ہو جائے گا ۔ لیکن ہلکا کپاسی ہوگا ۔ اچھا سردئی بغیر قند کے نہیں رنگا جاتا اور اگر قند کی جگہ بانات کا رنگ کاٹ دیا جائے تو وہ عمدہ رنگ آتا ہے کہ سبحان اللہ !"

شام ہوئی تو لڑکیاں اپنے کشیدے اور کتابیں رکھ رکھا معمول بموجب کھیلنے اور کہانیاں اور پہیلیاں کہنے سننے کو آ بیٹھیں ۔

اصغری نے سفیہن سے کہا ۔ "کہ یہاں چڑے چڑیا کی کہانیاں نہیں ہوتیں ، کہانیوں کی ایک بہت عمدہ کتاب ہے جس میں بڑی اچھی اچھی کہانیاں ہیں ۔ اور ہر ایک کہانی سے ایک نصیحت کی بات نکالی ہے ۔ اس کتاب کی زبان بہت شستہ ہے ۔ اب یہ لڑکیاں اسی کتاب کی کہانیوں سے جی بہلائیں گی ۔ کہانیاں کہنے سے ان کی تقریر صاف ہوتی ہے ۔ ادائے مطلب کی استعداد بڑھتی ہے اور جب کبھی مجھ کو فرصت ہوتی ہے ۔ تو میں کہانیوں کے بیچ میں ان سے الجھتی جاتی ہوں اور جیسی ان کی سمجھ ہے یہ میری بات کا جواب دیتی ہیں ۔ اگر نادرست ہوتا ہے تو میں بتا دیتی ہوں ۔ پہیلیوں کے بوجھنے سے ان کی عقل کو ترقی اور ان کے ذہن کو تیزی ہوتی ہے ۔ لیکن تم، ان میں بیٹھ کر سیر دیکھو ۔ مجھ کو آج عالیہ کی ماں نے بلا بھیجا ہے ۔ ان کے بچے کا جی اچھا نہیں ۔ بہت بہت منتیں کہلا بھیجی ہیں ۔ نہ جاؤں گی تو برا مانیں گی ۔ اور میرا جی بھی نہیں مانتا"۔

سفیہن بولی۔ "ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ ان کے لڑکے نے کئی دن سے دودھ نہیں پیا۔ بے چاری بہت ہراساں ہو رہی ہیں۔ اے ہے، خدا کرے نگوڑا جیتا رہے۔ بڑے اللہ آمیں کا بچہ ہے۔ دس برس میں پھڑک پھڑک کر خدا نے یہ صورت دکھائی ہے۔ عالیہ کے اوپر بھی تو ایک بچہ ہوا ہے۔ استانی جی تم کو علاج کے لیے بلایا ہوگا" ؟

اصغری نے کہا۔ "علاج ولاج تو مجھ کو کچھ بھی نہیں آتا۔ ایک مرتبہ پہلے اس لڑکے کو پیاس ہو گئی تھی۔ میں نے زہر مہرہ، بنس لوچن، گلاب کا زیرہ، چھوٹی الائچی، زیرے کی گری، کباب چینی، خرفہ اس طرح کی دو چار دوائیں بنا دی تھیں۔ خدا کا کرنا لڑکا اچھا ہو گیا"۔

سفیہن نے کہا۔"استانی جی! تم سب گنوں پوری ہو"۔

اصغری خانم بولی۔ "اس میں گن کی کیا بات ہے؟ ہمارے میکے میں دوا درمن کا بہت خیال ہے۔ جب میں چھوٹی تھی، جو دوا آتی، میں ہی اس کو چھانتی، بناتی، اور خیال رکھتی، اس طرح پر سنی سنائی دو چار دوائیں یاد ہیں جس کو ضرورت ہوئی، بتا دی۔ اور بچوں کا علاج تو عورتیں ہی کر کرا لیا کرتی ہیں۔ جب ایسی مشکل آ پڑتی ہے تو حکیم کے پاس لے جاتے ہیں"۔

سفیہن نے کہا۔"استانی جی! تم نے مہربانی کر کے مجھ کو اپنے مکتب کا سب انتظام تو دکھایا۔ للہ! ذرا دم کے دم ٹھہر جاؤ تو میں دیکھ لوں، لڑکیاں کیوں کر کہانیاں کہتی ہیں۔ اور کہانیوں میں تم کیونکر تعلیم کرتی ہو؟"

اصغری نے کہا۔ "بوا! مجھ کو دیر تو ہوتی ہے، پر

خیر، تمھاری خاطر ہے - اچھا لڑکیو! آج کس کی باری ہے؟"

محمودہ نے کہا۔ "باری تو امۃ اللہ کی ہے - لیکن فضیلت سے کہلائیے۔"

اصغری نے کہا - "اچھا فضیلت! کوئی بہت چھوٹی سی کہانی کہو -"

فضیلت نے کہانی شروع کی:

"ایک تھا بادشاہ ...."

اصغری نے پوچھا - "بادشاہ کس کو کہتے ہیں؟"

فضیلت بولی - "جیسے دہلی میں بہادر شاہ تھے" -

اصغری: "یہ تو تم نے ایسی بات کہی - کہ جو دہلی اور بہادر شاہ کو جانتا ہو وہی سمجھے" -

فضیلت: "بادشاہ، حاکم کو کہتے ہیں!"

اصغری: "تو کوتوال، تھانے دار بھی بادشاہ ہیں"۔

فضیلت: "نہیں کوتوال، تھانے دار تو بادشاہ نہیں ہیں - یہ تو بادشاہ کے نوکر ہیں"۔

اصغری: "کیوں؟ کیا کوتوال حاکم نہیں ہے؟"

فضیلت: "حاکم تو ہے - لیکن بادشاہ سب سے بڑا حاکم ہوتا ہے اور سب پر حکم چلاتا ہے -"

اصغری: "ہمارا بادشاہ کون ہے؟"

فضیلت: "جب سے بہادر شاہ کو انگریز پکڑ کر "کالے پانی" لے گئے تب سے کوئی بادشاہ نہیں ہے"۔ یہ سن کر لڑکیاں ہنس پڑیں -

اصغری نے کہا - "فضیلت! تم بڑی بے وقوف ہو - تم نے خود کہا کہ جو سب سے بڑا حاکم ہو اور سب پر حکم چلائے وہ

بادشاہ ہوتا ہے ۔ اور یہ بھی جانتی ہو کہ بہادر شاہ کو انگریز پکڑ کر کالے پانی لے گئے ۔ تو انگریز بادشاہ ہوئے یا نہ ہوئے ؟"

فضیلت : انگریز!

اصغری : "کیا انگریز کسی خاص شخص کا نام ہے ؟"

فضیلت : "نہیں۔ سینکڑوں ، ہزاروں انگریز ہیں۔"

اصغری : "کیا سب انگریز بادشاہ ہیں ؟"

فضیلت : "اور کیا" ؟

یہ سن کر لڑکیاں پھر ہنسیں ۔

اصغری نے حسن آرا کی طرف اشارہ کیا ۔ "کہ تم جواب دو ۔"

حسن آرا : "استانی جی ! ہمارا بادشاہ ملکہ وکٹوریہ ہے ۔"

اصغری : "مرد ہے یا عورت ؟"

حسن آرا : "عورت ہے۔"

اصغری : "کہاں رہتی ہے ؟"

حسن آرا : "لندن میں ۔"

اصغری : "لندن کہاں ہے ؟"

حسن آرا : "انگریزوں کی ولایت میں ، ایک بہت بڑا شہر ہے ۔"

اصغری : "یہاں سے کتنی دور ہوگا ؟"

حسن آرا : "میں نے ایک کتاب میں پانچ ہزار کوس لکھا دیکھا ہے۔"

اصغری : "کوس کتنا لمبا ہوتا ہے ؟"

حسن آرا : "استانی جی ! سلطان نظام الدین اولیا کو تین کوس کہتے ہیں۔" یہ سن کر محمودہ ہنسی اور کہا - "۱۷۶۰ گز کا ہوتا ہے ۔"

اصغری نے محمودہ سے پوچھا "کہ اس مرتبہ جو میں قطب گئی تھی ۔ اور تم بھی میرے ساتھ تھیں ۔ تم نے بھی دیکھا

تھا ۔ کہ تھوڑی تھوڑی دور سڑک پر پتھر گڑے تھے ۔ اور پتھروں پر لکھا ہوا تھا ۔ وہ پتھر کیسے تھے ؟"

محمودہ : "میں نے اٹکل سے یہی سمجھا تھا ۔ کہ کوسوں کے پتھر ہیں ۔ لیکن گاڑی ایسی تیز تھی کہ پتھروں پر نگاہ نہیں جمتی تھی ۔ میں خوب نہیں پڑھ سکی ۔ کہ ان پر کیا لکھا تھا ؟"

اصغری : "وہ کوسوں کے پتھر نہیں تھے ۔ میلوں کے پتھر تھے ۔ آدھے کوس کا میل ہوتا ہے اور ہر میل پر پتھر گڑا ہے ۔ اس میں یہی لکھا ہوتا ہے ۔ کہ یہاں سے دہلی اس قدر میل ہے اور قطب صاحب اتنے میل ۔"

اس کے بعد اصغری پھر حسن آرا کی طرف مخاطب ہوئی ۔ اور پوچھا ۔ "ہاں بوا لندن کس طرف ہے ؟"

حسن آرا : "اُتر میں ۔"

اصغری : "وہ ملک گرم ہے یا سرد ؟"

حسن آرا : "یہ تو میں نہیں جانتی ۔"

محمودہ : "بڑا سرد ہے ۔ جتنا اُتر کو جاؤ گرمی کم ہے ۔ اور جتنا دکن کو چلو ۔ گرمی زیادہ ہوتی جاتی ہے ۔"

سفیہن : "اچھی استانی جی ! عورت بادشاہ ہے ؟"

اصغری : "اس میں تعجب کی کیا بات ہے ؟"

سفیہن : "تعجب کی بات کیوں نہیں ؟ عورت ذات کیا کرتی ہوگی ؟"

اصغری : "جو مرد بادشاہ کرتے ہیں ۔ وہی عورت کرتی ہے ۔ ملک کا بندوبست ، رعایا کا پالنا ۔"

سفیہن : "عورت تو کیا کرتی ہوگی ؟ کرتے سب کچھ انگریز

ہوں گے۔ برائے نام عورت کو بادشاہ بنا رکھا ہوگا!"

اصغری : "سب انگریز ملکہ کے نوکر ہیں۔ ہر ایک کا کام الگ ہے۔ ہر ایک کا اختیار جدا ہے۔ اپنے اپنے کام پر سب مستعد رہتے ہیں۔ اور جب مرد بادشاہ ہوتے ہیں تب بھی وزیر وزراء سب کام کیا کرتے ہیں۔"

سفیہن : "ملکہ کی اولاد ہے؟"

اصغری : "ہاں خدا رکھے بیٹے، پوتے، نواسیاں سب کچھ ہیں۔"

سفیہن : "اچھی ملکہ اس ملک میں کیوں نہیں آتیں؟"

اصغری : "وہاں بھی بڑا ملک ہے۔ وہاں کے کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ لیکن ان دنوں ملکہ کا بیٹا آنے والا ہے۔ بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں، میں نے اخبار میں دیکھا ہے۔"

سفیہن : "اچھی، ملکہ کو ہزاروں کوس دور بیٹھے یہاں کی کیا خبر ہوتی ہوگی؟"

اصغری : "کیوں نہیں۔ ذرا ذرا خبر ہوتی ہے۔ ڈاک اور تار، برق رو، رات دن خبریں آتی جاتی ہیں۔ ہزاروں اخبار ولایت جاتے ہیں۔"

سفیہن : "ملکہ کو کیونکر دیکھیں؟"

اصغری : "کیوں کر بتاوں؟ ان کی تصویر البتہ دیکھ سکتی ہو۔"

سفیہن : "خیر! تصویر ہی دیکھ لیتے۔"

اصغری : "بوا تم بھی تماشے کی باتیں کرتی ہو کیا تم نے روپیہ نہیں دیکھا؟"

سفیہن : "کیوں نہیں دیکھا۔"

اصغری : "عورت کا چہرہ جو بنا ہے۔ وہ ملکہ کی تصویر ہے! خطوں کے ٹکٹ پر ملکہ کی تصویر ہے اور میرے

پاس ملکہ کی ایک بڑی عمدہ تصویر اور ہے۔ میرے ابا کو کسی انگریز نے دی تھی۔ وہ انھوں نے میرے پاس بھیج دی تھی۔" محمودہ! "میرا صندوقچہ تو اٹھا لا!" صندوقچے میں سے اصغری نے ملکہ کی تصویر نکال کر دکھائی۔ اور سب لڑکیوں نے نہایت شوق سے ملکہ کی تصویر کو دیکھا۔

سفیہن : "کیا اچھی تصویر ہے۔ عین مین ملکہ کھڑی ہیں۔

سفیہن : "حسن آرا نے لندن کو پانچ ہزار کوس بتایا ہے۔ تو کہیں برسوں میں یہاں سے وہاں تک آتے جاتے ہوں گے؟"

اصغری : "نہیں۔ سمندر در سمندر ایک مہینہ میں بافراغت پہنچ جاتے ہیں۔"

سفیہن : "اے ہے۔ سمندر ہو کر جانا پڑتا ہے؟ انگریزوں کے بھی کیسے دل ہیں؟ ان کو سمندر سے ڈر نہیں لگتا؟ میرے تو سمندر کا نام سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔"

اصغری : "سمندر سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟ مزے میں جہاز پر بیٹھ لیے، اچھا خاصہ خانۂ رواں بن گیا۔"

سفیہن : "اے ہے، استانی جی! ڈوبنے کا کیسا برا کھٹکا ہے۔"

اصغری : "ہاں! انسان کی بات ہے۔ جہاز کبھی کبھار ڈوب بھی جاتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ آئے دن ڈوبا کریں۔ تو سفر کا کوئی نام نہ لے۔ اب تو دریا کا راستہ خشکی کی سڑکوں سے زیادہ آباد ہو رہا ہے۔ ہزاروں، لاکھوں جہاز رات دن آتے جاتے رہتے ہیں انگریز اور ان کے بیوی بچے اور کل انگریزی اسباب، سب جہاز کی راہ

یہاں آتا ہے ۔"

سفیہن : "انگریزوں کی عورتوں کا کیا ذکر ، وہ تو کچھ اور ہی طرح کی عورتیں ہیں ۔ ۔ ہماری اور ان کی کیا ریس ؟ وہ تو باہر پھرتی ہیں ۔ سنتی ہوں ۔ ننھے ننھے بچوں کو ولایت بھیج دیتی ہیں ۔ اور ان کا دل نہیں کڑھتا ۔ نہیں معلوم کس قسم کی مائیں ہیں ؟ کیوں کر ان کے دل کو صبر آتا ہے ؟ پھر باہر کی پھرنے والیاں اور لوہے کے دل ، ان کو ایک سمندر کیا، ہوا پر اڑنا بھی کچھ مشکل نہیں۔"

اصغری : "باہر کے پھرنے کی جو تم نے کہی تو ان کے ملک میں پردے کا دستور نہیں ۔ غدر کے دنوں میں ہم لوگ ایک گاؤں میں بھاگ کر گئے تھے ۔ وہاں بھی پردے کا دستور نہ تھا ۔ سب کی بہو بیٹیاں باہر نکلتی تھیں ۔ لیکن میں چار مہینے وہاں رہی ۔ باہر کی پھرنے والیوں میں وہ شرم و لحاظ دیکھا کہ خدا ہم سب پردے والیوں کو نصیب کرے اور بچوں کو ولایت بھیج دینے سے تم نے کیوں کر سمجھا کہ اولاد کی محبت نہیں ۔ البتہ ان لوگوں کی محبت عقل کے ساتھ ہے ۔ یہاں کی ماؤں کی طرح باؤلی محبت نہیں ۔ کہ اولاد کو پڑھنے سے روکیں ۔ ہنر حاصل کرنے سے باز رکھیں ۔ نام کو تو محبت اور حقیقت میں اولاد کے حق میں کانٹے بوتی ہیں ۔ اولاد کو ناہموار اٹھاتی جاتی ہیں ۔ اور محبت کا نام بدنام کرتی ہیں" ۔ (یہاں پہنچ کر سب نے سکوت کیا ۔ تو فضیلت نے اپنی کہانی پھر شروع کی) ۔

"۔ ۔ ۔ ۔ اور اس بادشاہ کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اکیلی ایک بیٹی تھی۔ بادشاہ نے یہ سمجھ کر کہ میرے بعد یہی لڑکی وارث سلطنت ہوگی ۔ اس لڑکی کو خوب پڑھوایا، لکھوایا اور ملک داری کا قانون قاعدہ سب کچھ اچھی طرح سکھایا ۔ اور اپنے جیتے جی اسی کو ملک کا کام سونپ دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

فضیلت یہاں تک پہنچی تھی ۔ کہ اصغری خانم نے کہا ۔ "بوا ! تم تو جھپ جھپ کہانی کہتی جاتی ہو ۔ اور میرے دل میں پوچھنے کو ہزاروں باتیں بھری ہیں ۔ پر کیا کروں ، دن تو ہو چکنے پر آیا۔ اور مجھ کو عالیہ کے گھر جانا ضرور ہے ۔ شام کے وقت کسی کے گھر عیادت کو جانا بھی منع ہے ۔ میں تو اب نہیں ٹھہر سکتی ۔ تم لڑکیاں آپس میں کہو سنو" ۔ اور سفیہن سے کہا ۔ "بوا ! اللہ بیلی ! میں تو جاتی ہوں ، تمھارا دل چاہے تو بیٹھی رہو یا کل پھر آ جانا ، یہاں تو روز یہی ہوا کرتا ہے ۔"

غرض اصغری خانم تو عالیہ کے گھر روانہ ہوئیں اور سفیہن تو ایسی ریجھیں کہ پہر رات تک لڑکیوں میں بیٹھی رہ گئیں ۔

ابن الوقت کھانے کی میز پر

ابن الوقت چمن سے جا بجا رکتا ، ٹھٹکتا برآمدے تک پہنچا تو ملاقاتیوں کا ہجوم تھا ۔ بعض کرسیوں پر تھے ۔ بعض فرش پر کھڑے ہیں (شاید امیدوار ہوں) برآمدے کے دونوں طرف نیچے ، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں ۔ صاحب کے آدمی ابن الوقت کو پہچان تو چکے ہی تھے، آتا ہوا دیکھ کر سب نے کھڑے ہو کر سلام کیا اور اتنی خصوصیت برتی

کہ الگ کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد چپراسی نے آکر خبر دی کہ "صاحب کو آپ کی اطلاع ہو گئی ہے ۔"

ابن الوقت : "پھر صاحب نے کیا فرمایا ؟"

چپراسی : "آپ نے دیکھا کتنے آدمی آپ سے پہلے کے آئے ہوئے ہیں۔"

ابن الوقت : "کیا یہ سب ہو لیں گے ۔ تب میرا نمبر آئے گا ؟"

چپراسی : "ان لوگوں کی ملاقات چار چار پانچ پانچ منٹ کی ، بلکہ صاحب نے آپ کا آنا تو سن ہی لیا ہے ، لوگوں کو جلد جلد رخصت کریں گے ۔ کیا کہیں صاحب ! ہمارے صاحب کا مزاج اسی طرح کا ہے ۔ کہ کوئی آ کھڑا ہو ۔ تو اس کو جواب نہیں دیتے ۔ ملنے کے تو بڑے دھنی ہیں اور اسی وجہ سے ہم لوگوں کو بھی چھٹی نہیں ملتی ۔ ورنہ اب تک تو کبھی کے سلام کو حاضر ہوئے ہوتے ۔ اتوار کو ضرور شاگرد پیشہ حاضر ہوں گے ۔ سب لوگ بڑی آس لگا رہے ہیں۔"

ادھر نوبل صاحب اپنی جگہ ابن الوقت کے خیال سے واقع میں دو ہی دو باتیں کرکے لوگوں کو اوپر تلے ٹال رہے تھے ۔ پھر بھی ابن الوقت کو آدھ گھنٹے کے قریب انتظار کرنا ہی پڑا ۔ اس کی ملاقات نوبل صاحب کے ساتھ ایسی حالت میں شروع ہوئی کہ نوبل صاحب کی اس وقت کچھ ہستی نہ تھی ۔ اس کے بعد سے جب نوبل صاحب ملے ' منصبی اور قومی تعزز ہر حال میں ان کے ساتھ تھا ۔ خواجہ

باقی باللہ کی سڑک پر جب کہ ابن الوقت بیگار میں پکڑا ہوا ایک گٹھڑ اٹھانے کو تھا ، تو نوبل صاحب کو اس نے دیکھا - کئی انگریزوں کے ساتھ عربی گھوڑے پر سوار ، پھر دربار میں دیکھا - تو دربار کا اہتمام کرتے ہوئے انگریزوں میں پیش پیش ، پھر آج اپنے بنگلے پر کہ ملاقاتیوں کی سواریاں دروازے پر کھڑی ہیں اور شہر کے بیسیوں رئیس سلام کے منتظر - شاگرد پیشہ حاضر - لوگوں کی بہ کثرت کہ احاطہ بجائے خود ایک چھوٹا سا محلہ معلوم ہوتا ہے - ہر قسم کی متعدد سواریاں احاطے کے اس سرے سے اس سرے تک بھری پڑی ہیں - بنگلے کے تمام کمرے فرش ، پردہ ، چلمن ، میز ، کرسی ، شیشہ آلات اور آرائش کے سامان سجے ہوئے ہیں - ابھی چند دن ہوئے کہ غدر کے دنوں میں اسی کوٹھی کے کسی کمرے کی چھت تک باقی نہ تھی - یا اب دو ہی مہینے میں نئے سرے سے مکان بھی بن گیا ، رنگ بھی پھر گیا اور ہر طرح کا سامان بھی مہیا ہو گیا ، باغ بھی لگ گیا - یعنی جہاں کچھ نہ تھا وہاں سب کچھ ہو گیا - چار چپراسی اور پانچواں جمعدار - اتنے آدمی صاحب کے کمرے سے ایک کمرہ چھوڑ کر دروازے سے لگے بیٹھے ہیں - اندر سے ذرا سی آواز آئی اور دوڑے - نوبل صاحب کی یہ شان ، اگرچہ ابن الوقت کو پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا - مگر اس بات کا اس کو حق الیقین تھا - کہ ایک غدر نہیں ایسے ایسے ہزار غدر کیوں نہ ہوں - انگریزوں کی عملداری جانے والی نہیں - بلکہ غدر کے بعد جو تسلط بیٹھے گا ، پہلے سے زیادہ مستحکم اور پائیدار ہوگا - وہ خوب سمجھے ہوئے تھے

کہ اگر اس وقت اتفاق سے کوئی انگریز بلکہ کوئی کرانی بھی نوبل صاحب کی طرح کہیں بھیگی بلی بنا ہوا بیٹھا ہے۔ وہ حقیقت میں شیر ببر ہے۔

ابن الوقت کی خودداری ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ نہ اس نے اس بات کا خیال کیا کہ جو لوگ عزت میں، اور مقدرت میں، شاید سرکاری خیر خواہی میں بھی اس پر ہر طرح ترجیح رکھتے ہیں برآمدے میں بٹھائے گئے ہیں اور یہ کمرے میں۔ اور نہ اس پر نظر کی کہ جو لوگ آنے میں اس سے مقدم۱ ہیں از روئے انصاف ان کو ملاقات میں بھی اقدام۲ ہونا چاہیے۔ آدھ ہی گھنٹے کے انتظار میں ایسا اکتا گیا۔ کہ بار بار چپراسیوں سے ترشروئی کے ساتھ پوچھتا تھا۔ کہ اب کتنے آدمی اور ہیں؟ کہیں تم نے میری اطلاع میں یا صاحب نے سمجھنے میں غلطی تو نہیں کی؟ اس کو اپنے زعم میں بٹھائے جانے میں خجالت تھی۔ اور وہ اس خجالت کو ٹالنے کے لیے کمرے میں ٹہلتا اور کتابوں اور تصویروں اور دوسری چیزوں کو اٹھا کر، جگہ سے ہٹا کر دیکھتا۔ اگرچہ اس نے کسی چیز کو بے ٹھکانے نہیں کیا۔ مگر چپراسی اس کی یہ آزادی دیکھ کر دل میں بہت ناخوش تھے اور دور ہٹ کر چپکے چپکے آپس میں کہتے تھے۔ "یہ بھی عجب آدمی ہے۔ ایک دم اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اس کو کمرے میں بٹھانا ہی نہ تھا۔"

• جمعدار: "میاں ہوش کی بنواؤ، تمھیں خبر بھی ہے کہ یہ کون ہیں؟ غدر میں صاحب انھی کے گھر میں تھے۔

۱۔ پہلے ۔ ۲۔ پہل۔

ان کو برآمدے میں بٹھا دیتا اور صاحب کی نظر پڑ جاتی تو سب کی شامت آ جاتی ۔"

چپراسی : "اجی جمعدار ! خیر خواہی کی تو ہمارے سر آنکھوں پر ، سرکاری دربار کا کچھ ادب بھی ہے یا نہیں ۔ حاکم کی ڈیوڑھی پر امیر ، رئیس ، راجہ ، نواب ، زمیندار سب ہی آتے ہیں ۔ اندر جا کر چاہے صاحب کی گود میں بیٹھتے ہوں ۔ پر باہر تو ہم نے سب کا ایک ہی قاعدہ دیکھا ہے۔ ہاتھ باندھے سر جھکائے، چپ چاپ، کل تم نے لوہارو والے نواب کی طرف خیال نہ کیا ہوگا ۔ صاحب کو غسل خانے میں دیر لگی ۔ تو اسی کمرے میں تھے ۔ کھانسی اٹھی تو آواز کی گونج کے ڈر کے مارے کھڑکی کے باہر منہ نکال کر اور رومال رکھ کر کھانسے اور میں نے اگالدان لانے کو پوچھا تو اشارے سے منع کر دیا ۔"

جمعدار : "کیا مضائقہ ہے ۔ ان کو صاحب لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا۔"

چپراسی : "میں تو انعام لینے جاؤں گا تو ضرور اتنی بات ان کے کان میں ڈال دوں گا ۔"

جمعدار : "جی نہیں ! تمھیں کیا پڑی ہے ۔"

چپراسی : "مجھے پڑی یہ ہے کہ اب ان صاحب سے ٹھہری خصوصیت ۔ ان کا روز کا نہیں تو تیسرے چوتھے دن کا پھیرا ضرور ہوا کرے گا ۔ اور ہمارے صاحب کے پاس باہر کے ایک دو صاحب لوگ ہمیشہ ٹھہرے ہی رہتے ہیں ۔ بعضاً انگریز ایسا بدمزاج ہوتا ہے ۔

کہ کالے آدمی کی صورت سے جلتا ہے۔ وہ اگر ایسی
بدتمیزی دیکھ پائے تو ڈک سے یا بوٹ کی ٹھوکر
سے خبر لے۔ انھی کی نہیں بلکہ ہم لوگوں کی بھی۔"

اتنے میں نوبل صاحب کے باہر نکلنے کی آہٹ سی معلوم ہوئی۔ سارے چپراسی اور جس قدر لوگ ملاقات سے رہ گئے تھے۔ سب کے سب ایک دم کھڑے ہوئے۔ جو شخص صاحب کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے اندر سے آئے تھے۔ وہ دروازے سے سلام کرکے رخصت ہوئے۔ باقیوں کو صاحب سلامت کے بعد صاحب نے رخصت کر دیا۔ کہ آج دیر بہت ہو گئی۔ اور خود ابن الوقت کے کمرے میں چلے گئے۔ پہلی بات جو صاحب نے ابن الوقت سے کہی تھی، یہ تھی۔ "کہ میں افسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔ آپ کے شہر میں مخبری کا بازار اس قدر گرم ہے کہ جس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ بھی خوف کے مارے پریشان ہے۔ کہ دیکھیے کوئی کیا جا کر لگا دے اور حکام کی نظر ہے سخت، اس سے لوگ اور بھی ہراساں ہیں۔"

ابن الوقت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ صاحب بول اٹھے۔ "مجھ کو آپ سے بہت دیر باتیں کرنی ہیں اور کھانا بھی میز پر رکھا جا چکا ہے۔ چلیے کھاتے بھی جائیں اور باتیں بھی کرتے جائیں"۔

ابن الوقت ": میں کچھ وقت کا ایسا پابند نہیں ہوں۔ آپ کھائیے
میں گھر جا کر کھا لوں گا اور ابھی کچھ ایسا ناوقت
بھی نہیں ہوا۔"

نوبل صاحب: (مسکرا کر ابن الوقت کے ساتھ کھانے کے
کمرے کی طرف چلتے ہوئے) "کیوں" کیا آپ کو

میرے ساتھ کھانے میں کچھ احتراز ہے ؟ میں وہی نوبل ہوں کہ میں نے اور آپ نے مہینوں ایک جگہ کھانا کھایا ہے ۔ اور آپ کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ میں اس وقت بھی ایسا ہی عیسائی تھا ۔ جیسا غدر سے پہلے اور جیسا اب ہوں اور جیسا خدا نے چاہا تو اس کی مدد سے مرتے دم تک رہوں گا ۔"

ابن الوقت : "نہیں ! مجھ کو اپنی ذات سے تو اعتراض اور احتراز کچھ بھی نہیں ۔ مگر لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں۔"

نوبل صاحب : "مگر آپ بھی اس میں کچھ برائی پاتے ہیں یا نہیں ؟"

ابن الوقت : "نہیں میں تو ہرگز کسی طرح کی کوئی برائی نہیں پاتا۔"

نوبل صاحب : "ہندوستان کو جس کمزوری نے تباہ کیا۔ اصل میں وہ یہی کمزوری ہے ۔ خدا نے جیسی ان کی طبیعتیں بودی اور محکوم بنائی تھیں ۔ ویسے ہی یہ لوگ سدا سے بودے اور محکوم رہتے چلے آئے ہیں اور جب تک یہ کمزوری ان کی طبیعتوں میں ہے ۔ آگے کو بھی ضرور بودے اور محکوم ہی رہیں گے"۔

ابن الوقت کو پہلے ہی سے انگریزوں کی طرف رجحان تھا ۔ اونگھتے کو ٹھیانے کا بہانہ ۔ نوبل صاحب کا اشارہ پاتے ہی مقابل کی ایک کرسی پر ڈٹ ہی تو گیا ۔ اور یہ عیسائیت کا نہیں بلکہ اس انگریزیت کا گویا اصطباغ تھا ۔حسنِ اتفاق سے اس وقت میز پر کوئی انگریز نہ تھا ۔ یوں تو کئی صاحب ان کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ مگر سب کے سب مل کر شکار

کھیلنے چلے گئے تھے - اور بہت بہتر ہوا - کہ نوبل صاحب اکیلے تھے - ورنہ آج ابن الوقت کی خوب ہی ہنسی اڑی ہوتی - اس نے ناواقفیت کی وجہ سے ایسی ایسی بدتمیزیاں کیں کہ وہ نوبل صاحب ہی جیسا متین آدمی تھا - کہ نہ تو اس کو ہنسی آئی اور نہ کچھ اس نے برا مانا۔ ہنسنے کو کھانا کھلانے والے خدمتگار کیا کم تھے ؟ مگر نوبل صاحب کے ڈر کے مارے کسی کی مجال نہ تھی - کہ مسکرا بھی لیتا - ہنسنا تو بڑی بات ہے - ابن الوقت کی بے جا حرکتیں دیکھتے اور دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے نظر کر کے رہ جاتے - مگر اپنی جگہ جا کر تو مارے ہنسی کے ضرور لوٹ لوٹ گئے ہوں گے -

ابن الوقت نے بے تمیزی سے بے تمیزی یہ کی کہ داہنے ہاتھ میں کانٹا لیا اور بائیں ہاتھ میں چھری - نوبل صاحب کے بتانے پر کانٹا بائیں ہاتھ میں لیا - تو چھری کو اس زور سے کانٹے پر ریت دیا کہ چھری کی ساری باڑھ جھڑ پڑی - خدمتگار نے میز پر سے دوسری چھری اٹھا کر دی - شاید آلو ہی تھا کہ اس کو کاٹنے لگا ' تو اچھل کر بڑی خیر ہو گئی کہ ٹیبل کلاتھ (دستر خوان) پر گرا۔ جب کسی چیز کو کانٹے میں پرو کر منہ میں لے جانا چاہتا تھا - ہمیشہ نشانہ خطا کرتا - اور جب تک باری باری سے ناک ، ٹھوڑی اور کلے یعنی تمام چہرے کو داغدار نہیں کر لیتا - کوئی لقمہ منہ میں نہیں لے جا سکتا - اس دن کھانے کے بعد کوئی اس کا منہ دیکھتا - تو ضرور یہی پھبتی کستا - کہ "چہرہ ہے یا دیوالی کی کلھیا" اس نے کہا تو نہیں - مگر اس کی مسکی سے کئی دفعہ ایسا بھی شبہ ہوا کہ ہونٹوں یا مسوڑھوں میں یا زبان میں کہیں نہ کہیں کانٹا ضرور چبھا - اور پھر اول مرتبہ خدمتگار

جھوٹی رکابی سامنے سے اٹھانے لگا۔ تو اس نے سمجھا۔ کہ بس دستر خوان بڑھانا چاہتا ہے۔ کچھ کہنے ہی کو تھا کہ خدمتگار تھا، سلیقہ مند، سمجھ گیا اور یہ کہہ کر رکابی آگے سے کھینچ چلتا ہوا "کہ دوسری صاف پلیٹ لاتا ہوں۔"

تمام کھانے میں کوئی چھ سات رکابیاں بدلی گئیں۔ مگر اس بندۂ خدا نے چھری کانٹا ہاتھ سے نہ چھوڑا، جب تک خدمتگار نے منہ پھوڑ کر نہیں مانگا۔ جب خدمتگار پہلی قاب اس کے برابر لایا تو اس نے دونوں کنارے پکڑ ساری قاب اس کے ہاتھ سے لے، چمچے سمیت اپنے آگے رکھ لی۔ خدمتگار نے کان میں جھک کر کہا کہ اس میں سے آپ کو جتنا درکار ہو۔ چمچے سے اپنے سامنے کی رکابی میں لے لیجیے"۔ پڈنگ کانٹے سے کھانی تھی۔ اس کو جو لگی مزے کی۔ چمچے سے ہڑپ اور اس پر مزہ یہ "ذرا سی اور دینا" آخر میں سب سے بیہودہ بدتمیزی جو کی، یہ تھی۔ کہ فنگر گلاس کا پانی اٹھا کر پی گیا۔

ابن الوقت کی بعض حرکتیں حقیقت میں سخت بے جا تھیں۔ مگر واہ ری شرافت، کہ نوبل صاحب شروع سے آخر تک گردن جھکائے بیٹھے رہے۔ گویا کچھ خبر ہی نہیں۔ مگر نیچی نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہے۔ تھے اور دل میں ضرور پشیماں ہوئے ہونگے۔ کہ "میں نے ناحق اس کو کھانے میں شریک کیا"۔ لیکن اس خیال سے ان کو ضرور ایذا ہوئی ہوگی کہ ایسی خصوصیت پر کیونکر ہو سکتا تھا۔ کہ عین وقت پر کھانے کی تواضع نہ کرتا، تواضع کا کرنا تو مناسب بلکہ واجب تھا۔ اور اب تواضع کی، تو آگے کو ایک راستہ کھلا "اور بھلے کو آج کوئی انگریز کھانے میں شریک نہ تھا۔ اور ہوتا تو ساری عمر ان کی بے تمیزیوں

کی نقلیں کر کر کے مجھ کو چھیڑا کرتا"۔ نوبل صاحب جب تک میز پر رہے۔ اسی فکر میں تھے۔ انھوں نے ابن الوقت کے ساتھ مطلق کسی قسم کی بات نہیں کی۔ ورنہ نوبل صاحب کی میز کے چرچے تمام چھاؤنی میں مشہور تھے۔ خیر کھانے کے بعد نوبل صاحب نے ایک خدمتگار کو اشارہ کیا۔ کہ آپ کو غسل خانے میں لے جا کر ہاتھ دھلواؤ۔ وہاں سامنے سنگار میز پر قدِ آدم آئینہ لگا تھا۔ ابن الوقت نے جاتے ہی اپنا عکس دیکھا تو بےساختہ انشاء اللہ خاں کا وہ مقولہ یاد آ گیا۔ "ڈاڑھی کو لگا شیخ کی اب بزر قطونا۔ اور بجنے لگی گت" بارے ہاتھ منہ دھو اور آدمیوں کی جون میں آ کر پھر نوبل صاحب کے پاس آیا۔ نہ جاننا بھی عجب مزے کی چیز ہے۔ ابن الوقت اتنا بھی تو متنبہ نہ ہوا کہ معذرت کرتا۔

نوبل صاحب نے تو اپنے لیے پائپ روشن کر لیا تھا۔ ابن الوقت کی طرف سگریٹ کا بکس سرکا دیا "کہ اس میں جو تمباکو ہے۔ روم کے علاقے میں پیدا ہوتا ہے۔ اور چرٹ کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے۔ آپ بے تامل لیجیے۔ اور جب آپ چند روز اس کی عادت کیجیے گا۔ تو میں یقین کرتا ہوں کہ اس کے سامنے آپ حقے کو منہ بھی نہ لگائیں گے۔ میں صبح و شام اور کھانے کے وقت پائپ پیتا ہوں۔ اور باقی اوقات یہی سگریٹ۔" ابن الوقت گڑ کھا چکا تھا تو گلگلوں سے کاہے کا پرہیز۔ دیا سلائی سلگا، انجن کی طرح بھک بھک منہ سے دھواں نکالنے لگا۔

مشقیں

(۱) آپ نے نذیر احمد کے دو ناولوں کے اقتباس پڑھے ، پہلا مرأۃ العروس میں سے اور دوسرا ابن الوقت میں سے۔ یہ دونوں ناول ہر ایک کو پڑھنے چاہییں - پہلا ناول ، لڑکیوں کو خاص طور سے پڑھنا چاہیے - نذیر احمد کا ایک اور مشہور ناول ''توبة النصوح'' ہے۔ یہ لڑکے اور لڑکی دونوں کے لیے دلچسپ اور سبق آموز ہے - ہر کتب خانے میں آسانی سے مل جائے گا -

(۲) آپ نے نذیر احمد کے دونوں سبق پڑھے - ان میں بہت سے محاورے اور بعض ضرب الامثال استعمال ہوئے ہیں۔ آپ ذیل کی کہاوتوں اور محاورں کو ان عبارتوں میں تلاش کیجیے اور عبارتوں کو غور سے پڑھ کر ان کے معنی ذہن نشیں کر لیجیے - اس کے بعد انھیں جملوں میں استعمال کیجیے :- سب گنوں پوری - رونگٹے کھڑے ہونا - خصوصیت برتنا - بھیگی بلی بننا - سر آنکھوں پر - بازار گرم ہونا - اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ - گڑ کھانا گلگلوں سے پرہیز کرنا -

(۳) ''ابن الوقت '' والے سبق کو غور سے پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ انگریز، ہندوستانیوں کو کتنا برا سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے تھے ، جیسا غلاموں کے ساتھ - اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی حکومت قائم ہونے کے بعد سے ہندوستانی (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے) برابر انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر تقریباً سو برس کی کوشش کے بعد انھیں کامیابی ہوئی - انگریز چلے گئے اور مسلمانوں نے اپنی نئی مملکت ''پاکستان'' بنائی -

رتن ناتھ سرشار

سرشار (۱۸۴۶-۱۹۰۲ء) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہ کشمیری برہمن تھے اور ان کا گھر لکھنؤ کے ایسے محلے میں تھا جہاں چاروں طرف مسلمان شرفا کے گھر تھے۔ یہ ان گھروں میں آتے جاتے تھے، اس لیے ان کی معاشرت کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی بامحاورہ زبان سننے اور سیکھنے کا بہت موقع ملا۔ ان دونوں چیزوں سے انھوں نے اپنی تصانیف میں بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

سرشار نے بچپن میں عربی، فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی اور کالج میں پڑھ کر انگریزی سیکھی، لیکن کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر ملازمت اختیار کی۔ شروع میں ایک اسکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ اخباروں اور رسالوں میں مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ ان مضامین کی وجہ سے انھیں جلد ہی شہرت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ منشی نولکشور نے انھیں اودھ اخبار کا ایڈیٹر بنا دیا۔ اس اخبار میں سرشار نے لکھنوی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے کو بہت پسند کیا گیا اور بالآخر انھوں نے اپنے مضامین کو ایک قصے کی شکل دے کر کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ یہ کتاب فسانۂ آزاد کے نام سے چار موٹی موٹی جلدوں میں چھپی اور پڑھنے

والوں میں بے حد مقبول ہوئی - اس کتاب میں یوں تو بہت سے کردار ہیں لیکن دو کردار خاص ہیں ، ایک آزاد اور دوسرے خوجی - آزاد قصے کا ہیرو ہے اور خوجی اس کے وفادار دوست ہیں - ہر مشکل میں اس کے ساتھ رہتے ہیں - لیکن ان کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب وہ سامنے آتے ہیں تو لوگ ان کی حرکتیں دیکھ کر اور باتیں سن کر ہنسی ضبط نہیں کر سکتے - ابھی آپ خوجی کو دو مختلف حالتوں میں دیکھیں گے - یقین ہے کہ آپ کو بھی ان سے مل کر خوشی ہوگی ، لیکن ان سے ملاقات کرنے سے پہلے ایک کام کیجیے - اسی کتاب میں ایک مضمون چراغ حسن حسرت کا ہے - اس کا نام "خوجی" ہے - پہلے یہ سبق پڑھ لیجیے - اسے پڑھ کر آپ کو بہت سی باتیں ایسی معلوم ہو جائیں گی کہ اس کے بعد خوجی والے دونوں سبق پڑھنے میں آپ کو زیادہ لطف آئے گا -

سرشار نے فسانۂ آزاد کے علاوہ بھی کئی کتابیں لکھیں ، مثلاً سیر کہسار ، جام سرشار ، کامنی ، پی کہاں اور کڑم دھم وغیرہ - لیکن ان میں سب سے زیادہ دلچسپ فسانۂ آزاد ہے - اس کا ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دینے والا مذاق ، اور لکھنؤ کی بامحاورہ زبان، دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ جب ہم فسانۂ آزاد کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ پڑھتے ہی رہیں -

★

خوجی کے دو روپ

(۱)

"خوجی، نواب صاحب کی محفل میں"

ہمارے رئیسِ نامدار، یعنی نواب عرش وقار، جھٹپٹے وقت اپنے باغیچہ پر بہار میں فرش مکلف پر بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے تھے - مصاحب اور رفقا خوشامد کی باتیں بنا رہے تھے - اور میاں آزاد محبت گرما رہے تھے - اتنے میں دریائے اخضر فلک پر کشتیٔ ہلال نظر آئی - یعنی ماہ نو نے اپنی پیاری پیاری صورت دکھائی چاندنی کا چھٹکنا تھا کہ مصاحب، بلبل کی طرح چہکنے لگے - نوابوں کے درباروں میں مسخروں کا، کال نہیں - ایک افیمچی پلاؤ کی چاٹ پر مسخرے بن گئے - چوطرفہ ان پر بوچھاڑ ہونے لگی - ایک شخص نے پوچھا:

"کیوں یار! واجد علی تمہارے کون ہیں؟ بھائی ہیں نا!" تو فرماتے کیا ہیں - - - "جی واجد علی! میری خالہ جان کی بہن کے میاں کے لڑکے، کے باپ کے بیٹے ہیں!"

اس پر وہ فرمائشی قہقہہ ہوا کہ فلکِ ہفتم تک آواز پہنچی- یعنی واللہ یہ نیا رشتہ ہے - اچھی الٹ پھیر ہے - "اور کیوں میاں! تمہارے باپ تمہارے کون ہوئے؟"

"واہ وا! اس میں کون سی مشکل بات بھلا ہے- ہوئے کون؟ باپ ہوئے- اچھے ہوئے اب ہمیں ایسا گھامڑ[1] سمجھ لیا ہے، مجھے بھی کوئی گنوار مقرر کیا ہے؟"

---

۱ - احمق

نواب صاحب نے کہا - "خوجی! اس حوض میں نہاؤ تو ایک اشرفی پاؤ -"

"پیرو مرشد! اشرفیاں تو حضور کی جوتیوں کے صدقے میں بہت سی مل جائینگی - مگر پھر جینا دوبھر ہو جائے گا - نا صاحب! مجھے تو کوئی فی غوطہ ایک اشرفی دے تو بھی پانی میں نہ بیٹھوں - پانی کی صورت دیکھتے ہی بدن کانپ اٹھتا ہے- اور روح لرزنے لگتی ہے"

"بھئی! واہ کیسے مردوے ہو جی؟"

"میاں! نہاتے نہیں تو آپ کوئی قاضی ہیں؟ ہم نہیں نہاتے پھر آپ کو کیا؟"

"اجی! سرکار کا حکم ہے!"

"چلیے آپ کی بلا سے- کہنے لگے سرکار کا حکم ہے - پھر کوئی اپنی جان دے ڈالے-"

"حضور! جو یہ اس وقت دھم سے حوض میں نہ کود پڑیں تو افیم نہ ملے"

"آپ بہت چل نکلے ہیں - کھلائیں حضور، کھائیں ہم، آپ کون بیچ میں بولنے والے - اڑسٹھ برس سے تو میں افیم کھاتا آیا ہوں اب آپ کے کہنے سے چھوڑ دوں تو کہیے مرا یا جیا؟"

نواب صاحب نے کہا - "اچھا بھئی! جانے دو - دودھ کھاؤ گے؟"

"واہ خداوند! نیکی اور پوچھ پوچھ - دودھ تو وہ شے ہے - جس کو انسان ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی غٹ غٹ پیتا ہے - لیکن ذری مٹھاس خوب ہو - شاہجہاں پور[1] کی سفید شکر

۱- ہندوستان کا ایک شہر -

یا کالپی[1] کی مصری گھولیے گا اور تھوڑا سا کیوڑا بھی گرا دیجیے تو پیتے ہی آنکھیں کھل جائیں گی ۔"

نواب صاحب نے حکم دیا "بھئی ان کے واسطے دودھ لاؤ ، کیوں جی تم حلوائی کا دودھ پیتے ہو یا گھوسن کا؟ "

"حضور جو مل جائے ۔ آم کھانے سے کام یا پیڑ گننے سے"

غفور خدمتگار چاندی کے کٹورے میں دودھ لایا ۔ "خواجہ صاحب ! دودھ پی لیجیے"

"چپ نامعقول ! اتنا بڑا لومڑ ہوا ۔ اے ابھی تک تمیز نہیں آئی ۔ یہ "دودھ پینا" کہاں کا محاورہ ہے ؟ گنوار ! دودھ کھانا نہیں کہتا ، کٹوری یہاں رکھ دے ۔ میں ابھی آیا ۔ ذری کتے بلی کو دیکھتے رہنا"

"کہاں؟ کہاں خوجی! کہاں ؟ اے دودھ تو کھاتے جاؤ مرد آدمی!"

"کہیں نہیں حضور ! ابھی آیا"

خوجی جب اوجھل ہوئے تو میاں آزاد چپکے سے آدھا دودھ کھا گئے ۔ اور کٹورا لبالب کرنے کے لیے حوض سے پانی لے کر بھر دیا ۔ اتفاق سے ایک چھوٹی سی مچھلی بھی پانی کے ساتھ کٹورے میں آ رہی ۔

جب خواجہ صاحب تھوڑی دیر میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے برآمد ہوئے ۔ اور کٹورے کو دودھ سے لبالب پایا ۔ تو باچھیں کھل گئیں ۔ جاتے ہی منہ ڈال دیا ۔ اتنے میں مچھلی بھی منہ میں آئی ۔ تب تو چکرائے کہ الٰہی ! یہ کیا اسرار ہے ؟ غفور پر بہت ہی جھلائے اور نواب صاحب سے شکایت کی ۔

۱- ہندوستان کا ایک شہر ۔

"حضور اس کی کان گوشی واجب ہے ۔ ایسا غافل ہو گیا کہ حوض سے مچھلی اچک آئی اور انھیں کانوں کان خبر نہ ہوئی ۔ اوگیدی ! اتنی قرولیاں بھونکی ہوں گی ، کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا"

حاضرین نے خوب قہقہہ لگایا ۔ جسے دیکھو لوٹ رہا ہے کہ واللہ ! اچھی دل لگی ہے ۔ اس پر میاں آزاد نے کہا :

"ارے کہا جا یہ شیر ماہی ہے"

تب تو میاں افیمچی نہایت ہی افسوس کرنے لگے ۔

"ہائے ہائے سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی مجھے کیا معلوم تھا ! ۔ مجھے کیا معلوم تھا ! یہ شیر ماہی ہے ورنہ کچا ہی چبا جاتا ۔ اس قسم کی مچھلی میں یہ خاصیت ہے کہ اسی برس کا بڈھا کھائے ، نوجوان ہو جائے ، نئے سرے سے دانت نکل آئیں ۔"

اس پر گھنٹوں دل لگی رہی ۔ اتنے میں ایک صاحب نے پوچھا ۔ "خواجہ صاحب ! لوگ آپ کے پدرِ بزرگوار کو باورچی بتاتے ہیں ۔ واللہ ہم تو آپ کو شریف زادہ سمجھتے تھے ۔ مگر آپ پاجی نکلے ۔"

"پاجی آپ اور آپ کے باپ ! کچھ بیدھے۱ تو نہیں ہو؟ یہ پاجی کی کونسی بات چیت ہے؟ ہم نے تو عمر بھر کبھی چولھا نہیں پھونکا ۔ باپ دادا کا حال ہی نہیں معلوم !"

"یہ لاعلمی ! تو بندہ نواز ! آپ کی عالی خاندانی کی قلعی کھل گئی ۔ بس بس اب آپ اس دربار کے لائق نہیں"۔

نواب صاحب نے مسکرا کر کہا ۔ "ارے میاں خوجی !

۱- پاگل ۔

تم کو اپنی زبان سے بھی کہنا نہیں تھا۔ یہ تم کیا بک گئے، کوئی اپنے باپ دادا کو بھی نہیں جانتا؟ واہ بے پاگل! ساٹھ برس کا ہوا۔ آدمیت نہ آئی۔ سٹھیا گیا ہے۔"

میاں آزاد نے پوچھا۔ "کیوں صاحب! آپ پٹھان ہیں یا شیخ"؟

"جی میں تو ہندوستانی ہوں!"

"ایں! یہ بھی کیا خوب! ارے بھئی! مسلمان ہو یا کافر! صاحب! پیدا کہاں ہوئے؟"

"ہندوستان کے بیچ میں"

"پھر اس سے کیا واسطہ! اگر اصطبل کے بیچ میں پیدا ہوتے تو کیا لوگوں کے بیچ میں گھوڑے کہلاتے؟ اس معاملے کے بیچ میں انصاف تو کیجیے"

پھر ایک فرمائشی قہقہہ ہوا اور حاضرین لوٹنے لگے۔

(۲)

خوجی روس کی قید میں

اب سنیے کہ خواجہ بدیع الزماں روسی فوج میں قید ہوئے اور آزاد کے مصنوعی باپ بنے تو ان کی توقیر و تعظیم ہونے لگی ۔ ان کے ہمدرد ترکی قیدی مردم خدمتگزاری کے لیے مستعد رہتے تھے ۔ ایک روز روس کے ایک میجر نے ان کی انوکھی قطع اور نرالی وضع اور ماشے ماشے بھر کے ہاتھ پاؤں جو دیکھے تو جی چاہا کہ ان سے باتیں کریں ۔ ایک ترکی کو جو فارسی دان تھا ۔ مترجم مقرر کرکے خواجہ بدیع الزماں سے باتیں ہونے لگیں :

خوجی : حضور کی کمال مہربانی ہے کہ آزاد پاشا[1] کے پدر بزرگوار ملے ۔

میجر : او آپ آزاد پاشا کا بوڑھا باپ ہے ۔ یہ کہیے ۔

خوجی : باپ تو کیا ہوں مگر خیر ۔ ع ۔

جو کچھ کہ ہوں سو ہوں ، غرض آفت رسیدہ ہوں

اثنائے گفتگو میں روسی افسر نے پوچھا ۔ "آپ بھی کسی لڑائی میں کبھی شریک ہوئے تھے"۔ خوجی آگ ہوگئے ۔ جھلا کر جواب دیا ۔ واہ ! فوج "کے افسر اور ایسے کوڑھ مغز آج ہی دیکھنے میں آئے ۔ ہمارا کینڈا[2] ہی گواہی دیتا ہے جی ! کہ ہم فوج کے جوان ہیں ۔ کینڈے سے نہیں پہچانتے ، ہم دگلے والی پلٹن کے رسالدار تھے ۔ اختری پلٹن کے کمیدان ۳ ۔ ہم سے پوچھتے ہیں

---

۱ ۔ آزاد پاشا سے ناول کا ہیرو آزاد مراد ہے ۔ ۲ ۔ انداز ۔ ۳ ۔ کمانڈر ۔

کوئی لڑائی دیکھی ہے ؟ یس ! دیکھی ہے ! شریک
ہونے کا ذکر نہیں ۔ جی حضرت ! یہاں وہ وہ لڑائیاں
دیکھی ہیں کہ انسان کی بھوک پیاس بند ہو جائے ۔
خواجہ بدیع سے اور حضور پوچھیں کہ کیوں کبھی
جنگ بھی دیکھی ہے ؟ ہزار ، لاکھ ، کروڑ ، پدم ،
سنکھ ، سمجھے ۔ جنگ" ! ! ! "

میجر : آپ لوگ گولی چلا سکتے ہیں ؟ ۔ نشانہ کبھی لگایا ہے؟

خوجی : اجی حضرت اب فصد کھلوائیے ۔ گولی چلائی یا نہیں
چلائی ۔ ہم وہ گل چلے ہیں مشفق !

بوتل کی کاک زور میں توبہ کو لے اڑی
ہم گل چلوں کے ہاتھ کی گولی رکی نہیں

[ریاض خیر آبادی]

ایک مرتبہ ایک کتے سے اور ہم سے لاگ ڈانٹ ہو گئی
خدا کی قسم ہم سے گیارہ بارہ قدم کے فاصلے پر کتا
کھڑا تھا۔ دھر کے داغتا ہوں تو پوں پوں کرتا ہوا کتا
بھاگ کھڑا ہوا ۔

میجر : آپ بڑا گل چلا ہے ۔ خوب گولی لگائی کہ کتا
پوں پوں کرتا بھاگا ۔

میجر نے ان کی گپ اور بے تکی باتیں سن کر حکم دیا
کہ ایک دونالی بندوق لاؤ ۔ تب تو خواجہ صاحب چکرائے ۔
سوچے کہ سات پیڑھیوں تک کسی نے بندوق چلائی نہ تھی ہم کو
تو یاد ہی نہیں آتا ۔ کہ بندوق کبھی عمر بھر چھوئی بھی ہو ۔
اتنا تو جانتے ہیں کہ بندوق میں گز ہوتا ہے۔ اور قرابیں میں گز
نہیں ہوتا ۔ اور تپنچہ بندوق سے بڑا ہوتا ہے ۔

راوی : پڑیں پتھر سمجھ پر ایسی تم سمجھے تو کیا سمجھے ۔ واہ

میاں کمیدان !

میجر : اڑتی چڑیا نشانہ لگا سکتے ہو ؟ خطا نہ کرے گا نشانہ ؟

خوجی : (اپنے دل میں) اجی یہاں بیٹھی چڑیا پر تو نشانہ پڑ نہیں سکتا ۔ اڑتی چڑیا کیسی ؟ (کڑک کر) اجی آسمان تک کے جانوروں کو بھون ڈالوں ۔

میجر : میجر اچھا بندوق آئی ہے دیکھیں آپ کی لیاقت !

خوجی : تاک کر نشانہ لگاؤں تو درخت کی پتیاں گرا دوں فوراً ۔

میجر : اس تقریر سے بھی سمجھ گیا کہ گاؤدی اور ناواقف ہے ۔ مگر گپ اڑانے کا بادشاہ ہے ۔ بندوق سامنے رکھ دی اور کہا لیجیے بندوق حاضر ہے !

خوجی : آسمان کی طرف نظر کر کے کمال دلجمعی کے ساتھ ، ٹہلنے لگے ۔ اور یہ شعر پڑھنے لگے ۔

نہ ایک دن ربط جسم و جاں ہے ، نہ پاس یہ دولت و حشم ہے
فنا فنا ہے فنا فنا ہے ، عدم عدم ہے ، عدم عدم ہے

میجر : اب بوکھلا گیا ؟ اجی حضرت بندوق حاضر ہے ۔ نشانہ لگائیے ۔ اجی حضرت ! آپ سے کہتے ہیں ، او گانے والے ! ایں ، واہ ہے ۔

میجر کے بیان کا ٹھیک ترجمہ فارسی میں خوجی سنتے جاتے تھے ۔ مگر بندوق کے خوف کے سبب دیوانے بن گئے ۔ واہ رے استاد !

میجر نے بہ آواز بلند کہا ۔ "اب بندوق لیتے ہو یا اسی بندوق سے تم کو نشانہ بناؤں ۔ (مسکرا کر) بولو جھٹا پٹ !"

بڑی دیر تک دل لگی رہی ۔ میجر ، خواجہ صاحب کے مسخرے پن سے اس قدر خوش ہوا ۔ کہ پہرے والوں کو حکم

دے دیا ۔ کہ ان پر بہت سختی نہ کرنا ۔ شب کو خواجہ بدیع سوچے کہ اب بھاگنے کی تدبیر ضرور سوچنی چاہیے ۔ ورنہ جنگ ختم ہو جائیگی اور ہم ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے ۔ آخر آزاد کے قید ہو جانے سے ان کو سخت رنج تھا مگر "قہرِ درویش بجانِ درویش" ادھر اپنی جان کے لالے پڑے تھے ۔ آدھی رات کے وقت اٹھے ۔ اور دعا مانگنے لگے :

"یا خدا یا معبود ! یا قہار یا جبار ! آج رات کو خواجہ بدیع اس قید فرنگ سے نجات پائے ۔ ترکوں کا لشکر نظر آئے ۔ خواجہ بدیع غل مچائے کہ (آن پہنچے آن پہنچے ۔ خواجہ بدیع الزماں آن پہنچے) اور خدایا آزاد سے بھی ملاقات ہو ۔" یہ دعا مانگ کر بہت روئے ۔ کہ ہائے اب وہ دن کہاں نصیب ہوں گے کہ نوابوں کے دربار میں گپ اڑا رہے ہوں ۔ رفقا اور مصاحبیں ہم پر اور ہم ان پر منہ آرہے ہوں ۔ وہ دل لگی وہ چہل ، وہ نعرہ بازی اب نصیب ہو چکی ۔ ہائے افسوس ! کس مزے سے کٹی جاتی تھی ۔ اور کس لطف سے گنڈیریاں چوس چوس کر کھاتے تھے ۔

دو بجے کے وقت خوجی نے افیم گھولی ۔ اور چسکی لگائی ۔ تہ پر تہ جمائی ۔ اتفاق سے ان کی نظر ایک چھوٹے سے ٹٹو پر پڑی ۔ حضرت خواجہ بدیع صاحب آگے بڑھے ۔ اور خدا خدا کرکے یابو کے قریب گئے ۔ گردن پر ہاتھ پھیر کر کہا ۔ "غازی مرد ! دغا نہ دینا ۔ مانا کہ تم چھوٹے موٹے ٹٹو ہو اور خواجہ بدیع کا بوجھ تم سے نہ اٹھ سکے گا ۔ مگر کچھ پروا نہیں ۔ "ہمتِ مرداں مددِ خدا" ۔ یابو کو کھولا اور ننگی پیٹھ پر سوار ہوگئے ۔ پھر اترے رسی پڑی تھی ۔ اس کی لگام بنائی ۔ سوار ہوئے اور آہستہ آہستہ

پو قدمے جانے لگے ۔ بدن کانپ رہا تھا ۔ جب کوئی سو قدم کے فاصلے پر نکل گئے تو جان میں جان آئی ۔ جنگل میں دو چار بار خوب غل مچایا ۔ فتح ، فتح ، فتح دو کروڑ روسیوں میں سے خواجہ بدیعا للوہ نکل آیا ۔ واہ رے بدیع! اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ لو بھائی ترکو! خواجہ بدیعا آن پہنچے ، آن پہنچے ۔ خواجہ بدیعا آن پہنچے ۔ غل مچا کر سو رہے ، تو ایسی میٹھی نیند آئی کہ عمر بھر کبھی نہ آئی تھی ۔ دو گھنٹے کے بعد اٹھے ۔ فوراً یابو پر لدے اور چلے ۔ تھوڑی ہی رات باقی رہی تھی ۔ کہ انھوں نے پہاڑ کے قریب دو فوجیں آراستہ دیکھیں ۔ یا الٰہی ! ترکی ان میں کون ہے ؟ بہت غور کر کے دیکھا تو جانبِ شرق گئے ۔ وہاں دیکھتے کیا ہیں ۔ کہ اس فوج سے وہ لشکر بعد پر ہے ۔ فوراً یابو کو ایڑ لگائی ۔ اور ٹخ ٹخ کرتے ہوئے فوج کی طرف چلے ۔ قریب جا کر غل مچایا ۔ (آن پہنچے ، خواجہ بدیعا آن پہنچے)

ہانک رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے دونوں ہاتھ پکڑ لیے ۔ اور دوسرے آدمی نے یابو سے اتار لیا ۔

خوجی : ایں ! کون ہے بھئی ! نا میاں ، دل لگی ، بازی کا وقت نہیں ۔ آزاد ہیں ؟ میں سمجھ گیا ۔ بھئی سن تو لو ، ہے ہے ، نہیں مانتے ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔

راوی : ذرا آنکھیں تو کھولیے ۔ اب نشہ ہرن ہوا چاہتا ہے ۔

خوجی : ارے میاں ! نہیں مانتے ۔ آخرش کہاں چلتے ہو؟

راوی : گھبرانے کی نہیں تھوڑی دیر میں معلوم ہوا جاتا ہے ۔ ساری مشیخت رکھی رہ جائے گی ۔ دو کروڑ روسیوں میں سے نکل تو اب آئے ہیں آپ ! مگر خیر ۔

نا چار پا بدستِ دگرے ، دست بدست دگرے، لشکر میں

آئے ۔ تو دیکھا روسی ہی روسی نظر آتے ہیں ۔ لگے سر پیٹنے ۔ ارے ہائے غضب ! روسیوں نے خوب قہقہے لگائے ۔ خوجی دل ہی دل میں کٹے جاتے تھے۔ مگر "قہرِ درویش بر جانِ درویش" روسیوں نے خوجی سے گفتگو شروع کی ۔

ایک روسی : تم کس ملک کے آدمی ہو ۔ حبش یا ہند یا چین یا برہما کے ؟

دوسرا : (چپت جما کر) خوب جمی ۔ چٹاخ سے پڑی ۔ ایک اور دونگا ۔

خوجی کی چاند پر بے بھاؤ کی پڑنے لگیں ۔ ادھر دیکھا ادھر پڑی ۔ تڑ ۔ ادھر دیکھا ادھر پڑی ۔ چٹاخ ۔ بوکھلا گئے ۔ کہا۔ "اچھا گیدی ! اس وقت تو بے بس ہوں۔ اب کی پھنسوں تو خواجہ بدیع نام نہیں ، اور قسم ہے اپنے قدموں کی کہ آج تک مردم آزاری کبھی نہیں کی ۔ اور سب کچھ کیا ۔ پتنگ اڑائے ، بٹیر لڑائے ، مرغ لڑائے ، چانڈو پیا، افیم کھائی،۔ چرس کے دم لگائے ، مدک کے چھینٹے اڑائے ۔ مگر مردم آزاری کس مردود نے کی ہو۔"

خوجی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ روس کی فوج کے چند رقیق القلب آدمیوں نے ان کی یہ کیفیت دیکھی ۔ تو رحم کھا کر کہا "بس اب اس کو دق نہ کرو۔ پہلے دریافت تو ہولے کہ یہ ہے کون شخص؟" ایک بولا "یہ ترکی ہے ۔ وضع کسی قدر بدل ڈالی ہے"۔ دوسرے نے کہا ۔ یہ "حبش کا مسلمان ہے"۔ تیسرے نے رائے دی ۔ کہ "یہ گوئیندہ[1] ہے" ۔ اس آخری رائے سے عموماً سب نے اتفاق کر لیا ۔ کئی آدمیوں نے خوجی

۱- جاسوس ۔

کی تلاشی لی ۔ اب خوجی اور تو سب اسباب دکھاتے ہیں ۔ مگر افیم کی ڈبیا نہیں کھولنے دیتے ۔ وہ اصرار کرتے یہ انکار کرتے ۔

روسی : اس میں کون چیز ہے جو تم اس کو کھولنے نہیں دیتے ؟ ہم ضرور بالضرور دیکھیں گے! اس میں کچھ ضرور ہوگا ۔

خوجی : (جھلا کر) او گیدی ! ماروں گا بندوق ، دھواں اس پار ہو جائے گا ۔

خوجی نے بڑی کوشش کی کہ اظہار مافی الضمیر کریں ۔ مگر ان کی زبان کسی کی سمجھ میں نہ آتی ۔ آخر کار ماوراءالنہر کا ایک باشندہ منگوایا گیا ۔ اس نے خوجی کی باتوں کا ترجمہ کیا اور روسیوں کو سمجھایا ۔ خوجی نے کہا ۔ پوچھو! ہم کو کس علت میں گرفتار کر کے لائے ہیں ؟ ہم سے کون قصور سرزد ہوا ؟

روسیوں نے جواب دیا۔ ”کہ تم ترکی ہو اور ترکی فوج کا سا لباس پہنے ہو ۔ اور ہم کو شک کی جگہ یقین ہے کہ تم گویندے ضرور ہو ۔ لہذا لازم آیا کہ تم کو قید کرلیں ۔“

خوجی نے کہا ۔ ”یہ خیال خام ہے ۔ اول تو میں ترکی نہیں ہندی ہوں ۔ دوسرے پست قد اس قدر ہوں کہ فوج میں بھرتی ہونے کے قابل نہیں ہوں ۔ تیسری بات یہ ہے کہ مسافر پردیسی ہوں ۔ اگر گوئندہ ہوتا ۔ تو اس وقت یہاں کیا کرنے آتا ؟ فوج آمنے سامنے ہے ۔ آپ کا حال ترک اور ترکوں کا حال آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ پھر گوئندے اور مخبر کی کیا حاجت تھی؟ اور یوں تو آپ کو اختیار ہے ۔ قید کیجیے، چاہے رہائی دیجیے ۔ اب تو

آ پھنسے ، تمھارے پھندے میں ۔ اختیار ہے جو چاہو کرو ۔"
ماوراء النہر کا باشندہ بڑی دقت سے خوجی کا مطلب سمجھا ۔ خواجہ صاحب تو خاص ایران کی ٹھیٹھ گفتگو کرتے تھے نا ! پھر بھلا اہلِ عجم کے سوا اور کون سمجھتا ؟ ان کی فارسی پر ان کو بڑی ہنسی آئی ۔

روسیوں نے ان کو پنجرے میں بند کر دیا ۔ اور اردگرد چار آدمی تعینات ہوئے کہ کھولنے نہ پائیں ۔ خواجہ بدیع بیچارے بے کسی کی حالت میں سخت متوحش تھے ۔ ایک بار نعرہ بلند کیا ۔ "ہائے افسوس" ! دوسری بار کہا ۔ "آزاد پاشا ! خواجہ بدیعا نے حقِ نمک ادا کر دیا ۔ اب خواجہ صاحب بھی قید بھگت رہے ہیں مگر صرف تمھارے لیے !"

مشقیں

۱ - آپ نے خوجی میاں کا حال پڑھا - جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ دونوں ٹکڑے فسانۂ آزاد سے لیے گئے ہیں - یہ کتاب دو ڈھائی ہزار صفحے کی ہے - اس لیے ابھی آپ کو اس کے پڑھنے کی فرصت نہیں ہوگی ، پھر بھی آپ کا جی چاہتا ہوگا کہ میاں خوجی کے کچھ اور کارنامے دیکھنے کو ملیں - اس کی ایک ترکیب ہے - رئیس احمد جعفری نے فسانہٗ آزاد کا ایک انتخاب کیا ہے - وہ دو چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں چھپ چکا ہے آپ اسے تلاش کرکے پڑھیے -

۲ - مندرجہٗ ذیل لفظوں اور ترکیبوں اور فقروں کو جملوں میں استعمال کیجیے :

فرمائشی قہقہہ پڑا - جینا دوبھر ہو گیا - آپ کی بلا سے - نیکی اور پوچھ پوچھ - پھونک پھونک کر قدم رکھنا - باچھیں کھل جانا - کانوں کان خبر نہ ہونا - قلعی کھل جانا - سٹھیا جانا - لاگ ڈانٹ - قہرِ درویش بجانِ درویش - جان کے لالے پڑنا - نشہ ہرن ہونا - بے بھاؤ کی پڑنا -

۳ - اوپر کے سبقوں میں آپ نے ''تماشا'' کا لفظ پڑھا ہے - بعض لوگ اسے اس طرح (تماشہ) لکھتے ہیں - ایسا لکھنا بالکل غلط ہے آخر میں ''الف'' آنا چاہیے ، ''ہ'' نہیں آنی چاہیے -

صادق حسین

صادق حسین ، جن کا افسانہ ''پھونچیاں'' ، ابھی آپ پڑھیں گے، ۱۹۱۷ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی اور بی ۔ اے بھی وہیں کے گارڈن کالج میں تعلیم پا کر ، کیا ۔ بی ۔ اے کرنے کے بہت مدت بعد قانون کی ڈگری ایس ۔ ایم ۔ لا کالج کراچی سے حاصل کی ۔

۱۹۴۱ء سے ملازمتوں کا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے ۔ پہلے پانچ سال محکمہ سپلائی ، گورنمنٹ آف انڈیا میں ، پھر دو سال محکمہ دفاع میں اور اس سے اگلے دو سال حکومت بنگال کے سپلائی کے محکمے میں رہے ۔ پاکستان بنا تو تقریباً آٹھ سال مشرقی پاکستان میں مختلف عہدوں پر فائز رہے ۔ ان میں سے ایک عہدے پر انھیں مجسٹریٹ درجۂ اول کے اختیارات حاصل تھے ۔ ۱۹۵۵ء میں ایک انگریزی کمپنی میں مینجر رہے ۔ آج کل ایک پاکستانی کمپنی میں مینجر ہیں ۔ جہاں رہے پوری ذمہ داری اور فرض شناسی سے اپنی خدمات انجام دیں ۔ اس کا اعتراف ایک مرتبہ ''حسن کارکردگی'' کی سند کی صورت میں بھی ہوا ۔

صادق حسین جہاں بھی رہے زندگی کا بڑی گہری نظر سے مشاہدہ کیا اور اس زندگی میں جس چیز کو سب سے اہم سمجھا وہ انسان اور انسان کا باہمی رشتہ ہے ۔ یہ

رشتہ غیروں سے ہو یا اپنے قریبی سے قریبی رشتہ دار سے، اس کی بنیاد ہمیشہ خلوص، صداقت اور خدمت گزاری پر ہوتی ہے - ان کی سب کہانیوں میں انسانی رشتوں کی اسی خرش گواری کا ذکر ملتا ہے - افسانوں کا مجموعہ ''پھولوں کے محل'' کے نام سے چھپا ہے - ''پھونچیاں'' اسی میں سے لیا گیا ہے -

★

پھونچیاں

ازدواجی زندگی کے ابتدائی دنوں میں فریداں نے پھونچیوں کی فرمائش کی - اور مستری خدا داد خاں نے تہیہ کر لیا کہ وہ فریداں کی کلائیوں میں چار تولے سونے کی دو پھونچیاں پہنا کر ہی دم لے گا -

فریداں ایک خوبصورت بچی کی ماں بن گئی -

ایک عرصۂ دراز گزر گیا -

مستری خدا داد خاں کو اپنی اکلوتی بیٹی سکینہ سے بے حد محبت تھی اور وہ اپنی رفیقۂ زندگی فریداں پر جان چھڑکتا تھا - گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ اور سردیوں کی برفانی ہواؤں میں وہ برسوں اینٹ گارے کی دنیا سے جنگ آزما رہا - سکینہ دیکھتے ہی دیکھتے اتنی لانبی ہو گئی - کہ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ کھڑی ہوتی تو دونوں چھوٹی بڑی بہنیں معلوم ہوتیں - اب سکینہ پانی سے بھرے دو گھڑے سر پر رکھ کر بات کی بات میں کنوئیں سے گھر پہنچ جاتی تھی - بھوری بھینس کی دیکھ بھال بھی وہی کرتی - چارہ ڈالتی ، دودھ دوہتی - اسی

دودھ کی فراوانی ہی سے تو ماں بیٹیوں کے گال انگارے کی طرح سرخ تھے اور خدا داد کے بازوؤں کی طاقت جوں کی توں قائم ۔

جب فریداں دہی کی مٹکی کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر متھانی کی ڈوری کے سرے ہاتھوں سے باری باری کھینچتی ، سل بٹے سے مسالہ پیستی ، تنور کے پاس کھڑی ہو کر روٹیاں لگاتی ، تو اس کی کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں شور مچانے لگتیں۔ یہ شور سن کر خدا داد خاں کا چوڑا چکلا سینہ ابھر کر آہنی دیوار بن جاتا ۔ اور اس آہنی دیوار کے تلے صرف ایک آرزو ، صرف ایک تمنا ، صرف ایک ارادہ کروٹیں لینے لگتا ۔ اسی ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے خدا داد خاں ایک مشین بن گیا تھا ۔ نور پور سے راولپنڈی اور راولپنڈی سے نور پور گرمی ہو یا سردی ، وہ اپنے مضبوط ہاتھوں میں کرنی اور بسولی لے کر صبح سویرے گھر سے نکل جاتا ۔ اور رات کو لوٹ کر آتا ۔ بانسوں کی اونچی باڑ پر کھڑے ہوکر چنائی کرتے ہوئے جب اسے کوئی بات یاد آ جاتی تو وہ ہاتھ روک کر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتا ۔ نیچے سڑک پر تانگے ، لاریاں ، کاریں ، سائیکلیں رواں دواں نظر آتیں ۔ اُجلی اُجلی پوشاکیں پہنے ہوئے شہری چلتے پھرتے دکھائی دیتے ۔ ہوٹلوں اور سینماؤں سے گراموفون ریکارڈ بجتے سنائی دیتے ۔ زیر تعمیر عمارت کی بلند ہوتی ہوئی دیوار پر ساہول لگاتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ یہ سب دولت ہی کے کرشمے ہیں ۔ لیکن اسے دھن دولت کی ضرورت نہیں ۔ اسے تو صرف چار تولے سونا مہیا کرنا ہے ۔

انہی خیالوں میں کھویا ہوا وہ پھر کرنی چوڑے چکلے ہاتھ کی گرفت میں لے لیتا اور پھر اسی تیزی سے ردے پر ردا رکھنے میں مصروف ہو جاتا۔

ہر روز کام پر جانے سے پہلے خدا داد خاں گرم تنوری روٹی پر مکھن ڈال کر کھاتا، لسی کے دو بڑے بڑے پیالے پی کر چلم کے دو چار گہرے کش لگاتا، دھوئیں کے مرغولے اڑ اڑ کر کارنس پر رکھے ہوئے مٹی کے پیالوں، رکابیوں اور صحنکوں[1] پر منڈلانے لگتے۔ پھر طاق پر رکھے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے جب وہ صافے کا شملہ درست کرتا۔ تو اس کے ماتھے پر چھوی کا ایک بڑا سا نشان عہدِ رفتہ کی یاد تیز کر دیتا۔ اس وقت وہ جھک کر کھڑکی سے اس پگڈنڈی کی طرف دیکھتا۔ جو کھیتوں کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہوئی پہاڑی کے دامن تک چلی گئی تھی۔ وہی راستہ سید پور کو جاتا تھا۔ اسی راستے سے وہ فرید ان کو پالکی میں بٹھا کر لایا تھا۔ اسی پگڈنڈی پر پہاڑی کی اوٹ میں اس نے چھویوں کے وار روکے تھے۔ وہیں ایک چھوی چمک کر اس کے ماتھے میں پیوست ہو گئی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ کرنی اور بسولی پکڑ کر باہر نکل جاتا۔ برسوں پہلے دنداسے سے رنگے ہوئے ہونٹوں کی کنواری فرمائش، پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔ اور زندگی کی ہر سانس کے ساتھ اس کا ارادہ پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا۔

شام کے وقت کام ختم ہونے پر جب ٹھیکیدار اجرت بانٹتا تو خدا داد خاں کی روزانہ مزدوری میں سے آنہ دو آنے کاٹ لیتا۔ اور پھر مخلصانہ انداز میں خدا داد سے مخاطب ہو کر کہتا۔

١- کونڈوں۔

"یہ تمھاری امانت ہے یہ پیسے کبھی تمھارے کام آئیں گے"
اور خدا داد خاں جو کوڑی کوڑی کو دانتوں سے پکڑنے کی فکر میں رہتا۔ اپنے پرانے ٹھیکیدار کا یہ جملہ سن کر منہ سے کچھ نہ بولتا۔ مگر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ اور پھر اپنے اوزار سنبھال کر صرافوں کے بازار کی طرف چل دیتا۔ اور وہاں کے شو کیسوں میں سجی ہوئی پھونچیوں کو دیکھتا ہوا، ہزاروں باتیں سوچتا ہوا، نورپور کی سمت نکل جاتا۔

روپیہ بڑی کاوشوں سے آہستہ آہستہ اکھٹا کیا جاتا اور پھر اچانک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خرچ ہو جاتا۔ ہر چار چھ مہینے کے بعد کوئی نہ کوئی بپتا[1] آن ہی پڑتی۔ بچے بچائے پیسے اٹھ جاتے، بات پھر از سر نو شروع ہوتی۔ امیدوں کی کونپلیں پھوٹنے لگتیں۔ پھر خوابوں کے محل یک بہ یک ڈھے پڑتے۔ زندگی یونہی چکر کاٹتی رہی۔

ہر سال موسم بہار میں شاہ لطیف کی درگاہ پر میلہ لگتا۔ بڑی دھوم سے پشاور سے چراغی آتی۔ جگہ جگہ خیمے تن جاتے۔ ملک کے گوشے گوشے سے آنے والے زائرین کا تانتا بندھ جاتا۔ چند دنوں کے لیے سارے نور پور میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔ رات کے وقت پہاڑوں کے دامن میں ندی کے کنارے، توری باغ میں، غرضیکہ چپے چپے پر پیڑومیکس لیمپ روشن ہو جاتے۔ سارنگی اور طبلے کی سنگت میں سنہری آوازوں کی تڑپ دلوں میں ہلچل مچا دیتی۔ "بری بری" کے نعروں سے فضائیں گونج اٹھتیں۔ سکوں اور نوٹوں کا مینہ برسنے لگتا۔ برسوں پہلے کے دنوں ہی میں خدا داد خاں نے فریداں کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس وقت

۱- مصیبت -

خدا داد خان کی کبڈی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ اڑھائی من کا پتھر اٹھا کر ہوا میں یوں پھینک دیتا۔ جیسے روئی کا گالا ہو۔ ہر شام موسم بہار کا یہ میلہ بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کر دیتا۔ نہ جانے کیوں ان دنوں خدا داد خاں عجیب طور پر جذباتی ہو جاتا؟

ایک دن میلے کے دنوں میں خدا داد خاں جب شہر سے لوٹ کر آیا۔ تو سکینہ کہیں پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ فریداں اکیلی چٹائی پر آلتی پالتی مارے لحاف میں ڈورے ڈال رہی تھی۔ خدا داد خاں اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ اور فریداں کے کانوں میں مٹکتے ہوئے چاندی کے جھمکوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے بولا۔ "پھر میلے کے دن آ گئے!۔

"اوں ہوں کام کرنے دو نا" فریداں نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ اور اس کی کلائی کی چوڑیاں بج اٹھیں۔

"پہلے ایک آلوچہ کھا لو پھر کام کرنا" یہ کہتے ہوئے خداداد خاں نے صافے کے کونے میں بندھے ہوئے آلوچے دھپ دھپ لحاف پر گرا دیے۔ پھر ایک آلوچہ اٹھا کر فریداں کے منہ میں ڈال دیا۔ فریداں کے رخساروں میں گلاب کی سی سرخی دوڑ گئی۔

"یہ تمھارے ماتھے پر کیا ہے"؟ فریداں نے سرمگیں آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"ایک نشانی!"

"کس کی"؟

"سید پور کی شہزادی کی"

اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اتنے میں سکینہ آنگن میں داخل ہوئی۔ خدا داد اٹھ کر چارپائی کی ادوائن کسنے لگا۔

اس رات خدا داد خاں ندی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر بہت دیر تک سوچتا رہا - سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں آہنی دیوار کے تلے دھائیں دھائیں ہونے لگی - صرافوں کے بازار کے بڑے بڑے شوکیس اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے - اوران شوکیسوں میں سجی ہوئی پہونچیوں کے ننھے ننھے طلائی گیند ابھر کر ندی کے پانی میں تیرنے لگے - گوشے گوشے سے نغمہ و ساز کے چشمے پھوٹ رہے تھے- آس پاس سے "ہری ہری" کے نعرے بلند ہو رہے تھے - آسمان پر ماہِ کامل چمک رہا تھا - ایک چاند، ندی کے پانی میں لرز رہا تھا - خدا داد خاں نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوتے آنسو صافے کے کونے سے خشک کر ڈالے - پھر وہ چھوی سنبھال کر گھر کی جانب چل دیا -

زندگی یونہی چکر کاٹتی رہی -

آخر ایک دن خدا داد خاں کی کائنات مسکرا اٹھی - اس دن حجازِ مقدس روانہ ہونے سے پہلے ٹھیکیدار نے پانچ سو روپے کی رقم خدا داد خاں کی جھولی میں ڈال دی -

"یہ تمھاری امانت ہے" ٹھیکیدار نے سنسنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا -

خدا داد خاں کا دل بلیوں اچھلنے لگا - فریدان کی فرمائش پرانی ہو چکی تھی - مگر اس کا عزم ابھی تک جوان تھا - اس دن وہ کام پر نہ گیا - بلکہ سیدھا صرافوں کے بازار میں چلا گیا - اس راستے سے وہ ہزاروں بار گزر چکا تھا - اس کی آنکھیں وہاں کے ایک ایک شو کیس سے مانوس تھیں - پرانے قلعے کی طرف جاتی ہوئی چھوٹی گلی کے نکڑ والے نلکے سے اس نے سینکڑوں بار اوک سے پانی پیا تھا - بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑے ہو کر نہ

جانے کتنی مرتبہ اس نے ان شو کیسوں میں سجی ہوئی پھونچیوں کو نظروں میں سمیٹا تھا ۔ نلکے اور بجلی کے کھمبے کے درمیان والی دکان میں پھونچیوں کے ان گنت جوڑے تھے ۔ ہر نمونے، ہر وزن اور ہر مذاق کی پھونچیاں ۔ خدا داد خاں نے اسی دکان سے چار تولے سونے کی دو پھونچیاں خریدیں ۔ انھیں باریک سرخ کاغذ میں لپیٹا اور اپنی کالی واسکٹ کی جیب میں ڈال لیا پھر تانگے میں بیٹھ کر نور پور کی سمت چل پڑا ۔

تانگے میں جتا ہوا سفید گھوڑا مری روڈ پر قدم چال، چل رہا تھا ۔ سڑک کے دونوں طرف شیشم کے پیڑوں کی قطاریں تھیں اور ان سے پرے کھیتوں میں سرسوں کے پھولوں کی پیلی پیلی ردائیں حد نظر تک پھیلی ہوئی تھیں ۔ کھیتوں میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چند دیہاتنیں گھڑے سر پر اٹھائے ایک قطار میں چل رہی تھیں ۔ ان کے اوپر، بہت اوپر، آسمان کی بلندیوں میں کونجوں کی ایک ڈار اڑتی ہوئی پہاڑوں کی سمت جا رہی تھی پیڑوں کے نیچے بیٹھا ہوا نوجوان دیہاتی مخصوص غیر فانی لے میں وارث شاہ کی ہیر گا رہا تھا ۔ اور پگڈنڈی پر چلتی ہوئی کونجوں کے ننگے پاؤں رکے جا رہے تھے ۔

”فریداں ابھی تک جوان معلوم ہوتی ہے ۔ یہاں تک کہ وہ اور سکینہ بہنیں جان پڑتی ہیں“ خدا داد خاں نے صافہ کھول کر پھر نئے سرے سے باندھا ۔

”تیز چلو“! سنگی! اس نے تانگے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔

پہلوانی ڈیل ڈول والے چھاچھی تانگہ بان نے مڑ کر خداداد خاں کی طرف دیکھا ۔ اور پھر باگ ڈھیلی چھوڑ دی ۔

گھوڑا دلکی چلنے لگا۔

"چابک لگاؤ نا سنگی"! خدا داد خاں نے بے تاب ہو کر کہا۔

تانگہ بان نے نشست سے اٹھ کر چابک ہوا میں گھمایا۔ تڑاخ تڑاخ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ گھوڑے کی دم میں تناؤ پیدا ہوا اور پھر کنوتیاں بدل کر سرپٹ بھاگ پڑا۔ ٹاپوں کی کٹ کٹ فضا میں گونجنے لگی۔ گھوڑے کے پاؤں میں جڑے ہوئے نعل تارکول کی سڑک کا سینہ کوٹ کوٹ کر چنگاریاں پیدا کرنے لگے۔ گھوڑے کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگرو بج بج کر راہگیروں کو خبر دار کرنے لگے۔

اوجڑیاں کے قریب پہنچ کر تانگے والے نے باگ کھینچ لی۔ پسینے میں شرابور، ہانپتے ہوئے گھوڑے نے کچھ دم لے کر چوبچے سے پانی پیا۔ اور پھر تازہ دم ہو کر سڑک پر دوڑنے لگا۔ سڑک کے دائیں جانب ایک زیارت پڑتی تھی جس کے آنگن میں بیٹھے ہوئے مجاور نے تانگہ دیکھ کر نوبت بجائی۔ خدا داد خاں نے چونی ہوا میں اچھال کر اس کی طرف پھینک دی۔

نور پور پہنچتے ہی خدا داد خاں اچک، کر تانگے سے نیچے اترا۔ ہانپتے ہوئے گھوڑے کی ریشم جیسی ایال پر ہاتھ پھیرا، اس کی گردن تھپتھپائی۔ تین روپے تانگے والے کی ہتھیلی پر رکھ کر اپنی مونچھوں کو دو چار تاؤ دیے۔ پکی سڑک کی آخری بلندی پر رک کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کائنات کے ذرے ذرے نے ایک نیا روپ دھار لیا تھا۔ ہر شے حسین نظر آنے لگی۔ سنبلو سے لدی ہوئی پہاڑیاں مسکرا اٹھیں۔ گول پتھروں سے ٹکراتا ہوا ندی کا صاف و شفاف پانی میٹھے میٹھے گیت گانے لگا۔ اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ڈھالو راستہ

طے کیا ۔ ندی کے اس پار پہنچ کر وہ پگڈنڈی پر ہو لیا ۔ وہ دل میں سوچنے لگا ۔ کہ آج اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو بر آئی ہے ۔ گھر پہنچتے ہی وہ جھٹ پہونچیاں واسکٹ کی جیب سے نکال کر فریداں کی کلائیوں میں پہنا دے گا ۔ آج فریداں کی فرمائش پوری ہو جائے گی ۔ یک بیک پہونچیاں دیکھ کر فریداں کا دل دھک دھک کرنے لگے گا ۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئیں گے ۔ سارے نور پور میں یہ پہونچیوں کا دوسرا جوڑا ہوگا ۔ پہلا نمبردار کے بیٹے کی دلہن کا تھا ۔ اور اب فریداں کی کلائیوں میں ہوگا ۔

"ابا جی ! یہ سرخ کاغذ میں کیا ہے ؟" دفعتاً ایک آواز آئی

خدا داد خاں نے چونک کر سامنے دیکھا ۔ سکینہ دو خالی گھڑے اٹھائے ہوئے بیچ راستے میں کھڑی تھی ۔

"ابا جی ! یہ سرخ کاغذ میں کیا ہے؟" قریب آ کر سکینہ نے کالی واسکٹ کی جیب سے باہر نکلے ہوئے باریک سرخ کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا ۔

"کچھ بھی تو نہیں" خدا داد خاں نے باریک سرخ کاغذ کو جیب کے اندر کرتے ہوئے جواب دیا ۔

"کچھ تو ہے ابا جی !" سکینہ نے گھڑے زمین پر رکھ دیے ۔

"اچھا تو پہلے تم پانی بھر لاؤ ۔ پھر گھر آ کر دیکھنا ۔ کہ اس کاغذ میں کیا ہے ؟"

خدا داد خاں نے دایاں ہاتھ جیب پر رکھتے ہوئے کہا ۔

"اوں ہونہہ" سکینہ نے دائیں بائیں سر جھٹک کر ضد کی ۔

"دیکھو بیٹا" !

"نہیں ابا جی! میں ابھی یہیں دیکھوں گی۔ کہ اس سرخ کاغذ میں کیا ہے؟"

سکینہ نے بات کاٹ کر کہا۔ اور پھر جھٹ ایک ہاتھ کالی واسکٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔

"سکینہ!" خدا داد خاں یہ کہتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ابا جی!" سکینہ مچل گئی۔

"تم بڑی ضدی ہو" باپ نے جیب پر رکھا ہوا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"بابل!" سکینہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور پھر گھڑے وہیں چھوڑ کر پہونچیاں ہاتھوں میں لیے گھر کی طرف بھاگ پڑی۔ گلے میں مقیش والی کالی چنری ڈالے سکینہ پگڈنڈی پر دوڑتی چلی جارہی تھی۔ خدا داد خاں کی محبت بھری آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ حتیٰ کہ وہ ایک پہاڑی کے دامن کو چھوتی ہوئی لوکاٹ اور شہتوت کے پیڑوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ خدا داد خاں خالی گھڑے ہاتھوں میں لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ کہیں دور کوئی چرواہا بانسری پر مرزا صاحباں کے بول الاپ رہا تھا۔ جنگلی کبوتر ہوا میں اڑانیں بھر رہے تھے۔ آک کی خودرو جھاڑیوں کے سائے مشرق کی طرف پھیل رہے تھے۔

جب خدا داد خاں نے اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو پلنگڑی پر بیٹھی ہوئی سکینہ نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کیے اس کی بھری بھری کلائیوں کو پہونچیوں نے نکھار دیا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ پہونچیوں کے چمکتے ہوئے ننھے ننھے طلائی گیندوں نے اس کی کلائیوں میں نئی آب و تاب

پیدا کر دی تھی - جیسے کسی برفانی چوٹی کے بلوریں ماتھے پر یک بہ یک سورج چمک پڑے - سکینہ ایک معصومانہ شوخی کے ساتھ سر کو دائیں بائیں جھٹکتی ہوئی پلنگڑی پر یوں اچھلنے لگی جیسے دلکی چلنے والی گھوڑی پر سوار ہو - اس کے پہلو میں اس کی ماں بیٹھی ہوئی تھی جس کی مامتا بھری آنکھوں سے سچ مچ خوشی کے آنسو نکل رہے تھے -

مشقیں

۱ - نیچے لکھے ہوئے جملوں کا مطلب آسان زبان میں سمجھا کر لکھیے :-

(۱) وہ برسوں اینٹ گارے کی دنیا سے جنگ آزما رہا -
(۲) خوابوں کے محل یک بیک ڈھے پڑتے -
(۳) خدا داد کی کائنات مسکرا اٹھی -
(۴) خدا داد کا دل بلیوں اچھلنے لگا -
(۵) کائنات کے ذرے ذرے نے ایک نیا روپ دھار لیا تھا :-

۲ - نیچے لکھے ہوئے محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے :-
جان چھڑکنا - دیکھ بھال کرنا - پایہ تکمیل تک پہنچانا
کوڑی کوڑی کو دانتوں سے پکڑنا - پیچ و تاب کھانا -
روپ دھار لینا -

۳ - آپ کو یہ کہانی اچھی لگی ہو تو صادق حسین ، کی دوسری کہانیاں بھی پڑھیے - ان کے افسانوں کے مجموعے کا نام ہے ''بھولوں کے محل''

غلام الثقلین نقوی

غلام الثقلین نقوی ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء کو مقبوضہ کشمیر کے ایک گاؤں چوکی ہنڈن میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد سید امیر شاہ مرحوم محکمہ مال میں ملازم تھے۔ چار سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں بھڑتھ سادات ضلع سیالکوٹ میں آ گئے۔ والد صاحب اردو، فارسی، عربی اور علوم دینی کے عالم تھے اور غلام الثقلین نقوی کی تربیت انھیں کے زیر سایہ ایک روشن خیال مذہبی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔

میٹرک دیپالپور (ضلع ساہیوال) سے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۴۵ء میں پرائیویٹ طور پر بی۔اے پاس کیا۔ ۱۹۴۶ء میں بی۔ٹی کرنے کے بعد مدرس ہو گئے اور ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔

۱۹۴۶ء سے اب تک مختلف سکولوں اور کالجوں میں اردو کے استاد رہے۔ آجکل گورنمنٹ کالج لاہور کے اردو شعبہ میں استاد ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ۔ بھول، ہفتہ وار استقلال میں ۱۹۴۷ء میں چھپا۔ اس کے بعد سے ان کے افسانے برابر معروف رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ افسانوں کے دو مجموعے۔ بند گلی " اور " شفق کے سائے " طبع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ "نغمہ اور آگ" کے عنوان سے زیر طبع ہے۔ "جلی مٹی کی خوشبو " اسی مجموعے سے لیا گیا ہے۔

جلی مٹی کی خوشبو

پکی سڑک اگرچہ اس کے گاؤں تک تو نہیں جاتی تھی لیکن دس بارہ میل کا فاصلہ لاری پر طے ہو جاتا اور کوس دو کوس پیدل چل لینا کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ آج اسے سیالکوٹ سے بس نہیں ملی تھی کیونکہ جنگ کے بعد ابھی تک اس کا علاقہ آباد نہیں ہوا تھا اور آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی۔

وہ اللہ کا نام لے کر پیدل چل پڑا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ دھوپ میں حدت تھی، لیکن اس حدت میں نرمی تھی۔ سردیوں میں ایک دو اچھی بارشیں ہو گئی تھیں۔ سیالکوٹ سے نکلتے وقت اسے کھیتوں کا سماں بہت اچھا معلوم ہوا۔ ہریالی لہریں لے رہی تھی اور گندم کے پودے دھوپ میں نہا رہے تھے۔

جنگ سے لے کر اب تک وہ ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے پاس رہا تھا۔ اس نے گندم کی بوائی میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ نم دار مٹی کی باس بھی سونگھی تھی۔ یہ دھرتی بھی پرائی نہیں تھی پر اس مٹی کی خوشبو کچھ اور ہی تھی، اس لیے کہ اس میں اس کا اپنا خون پسینہ ملا ہوا تھا جب اس کو پتہ لگا کہ اُس کا علاقہ دشمن سے خالی ہو گیا ہے تو اس کے ہاتھ ہل کی ہتھی کو گرفت میں لینے کے لیے بے قرار ہو گئے تھے اور بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ اٹھی تھیں۔

پکی سڑک کے دونوں کناروں پر گھاس اگی ہوئی تھی اور درختوں پر شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ گھاس میں ایک بے نام سی خوشبو تھی۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔ "میرے کھیت

گھاس سے اٹ گئے ہوں گے ۔گھاس کتنی لچپال ہے؟ دھرتی کا ننگ نہیں دیکھ سکتی، پر جب ہم دھرتی کا سینہ پھاڑتے ہیں تو سب سے پہلے گھاس کو جڑ سے اکھاڑتے ہیں ۔" وہ سوچتے سوچتے رک گیا ۔ " میں ہل کہاں سے لاؤں گا اور بیلوں کی جوڑی.... گورا اور لاکھا.... اور بھوری جسے بچہ دیے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا اور ابھی تک اس کے دودھ سے کچی کلیوں کی خوشبو آ رہی تھی ...... شرر........ شرر .. .. شرر ....." وہ خود بخود مسکرا اٹھا ۔ اسے یوں لگا جیسے بھوری کے تھنوں سے دودھ کی دھارا پھوٹ بہی ہو اور پیتل کی بالٹی کا پیندا دھاروں کی مضراب سے دوتارے کی طرح بج اٹھا ہو اور جھاگ اٹھ رہا ہو ۔ سفید سفید جھاگ جس میں موتیے کی کلیاں اور چودھویں کی چاندنی گھل مل گئی ہو ۔

بھوری دودھ اور گھی کے لیے علاقے بھر میں مشہور تھی ۔ مست پور کا ذیلدار تہمد کی ڈب میں ہزار روپے کے نوٹ باندھ کر آیا ، پرمیں نے کہا "چوہدری ! بھوری میری جان ہے ۔ اپنی جان کو کون بیچتا ہے بھلا ؟ " پھر وہ یکایک اداس ہو گیا "نہ جانے اب بھوری کس کے پاس ہے، اس رات. . . "اسے جھرجھری سی آئی ۔ اس رات کا تصور بہت بھیانک تھا۔ نرم نرم چمکیلی دھوپ میں وہ اس اندھیری رات کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا ۔ اس نے رفتار تیز کر لی، لیکن اس کے خیالات اس سے بھی زیادہ تیز رفتار تھے ، گورا ، لاکھا اور بھوری بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے وہ انہیں چھو نہ سکتا تھا لیکن وہ گورے اور لاکھے کے پسینے کی باس سونگھ رہا تھا اور بھوری کے دودھ کی خوشبو.....

"ہوں! سڑک کے عین درمیان اتنا بڑا گڑھا۔" وہ چونک گیا "یہاں کوئی گولا گرا ہو گا۔" اس نے سوچا "میں اب وہاں پہنچ چکا ہوں جہاں جنگ ہوئی تھی۔"

جنگ!

جنگ کتنا چپکے سے آئی تھی جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہ ہوں۔ رات کے اندھیرے پر... وہ اس دن حسبِ معمول کنویں پر سو رہا تھا۔ لا کھے، گورے اور بھوری کے پاس کھاٹ بچھا کر۔ برسات بھرا کر نہیں لگی تھی اور دھان کے کھیتوں کو پانی دینے کے لیے لاکھا اور گورا سارا دن کنواں چلاتے رہے تھے اور اب وہ تھک کر لیٹ چکے تھے۔ وہ خود بھی تھک چکا تھا۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا اور ہر طرف خاموشی تھی۔ کھاٹ پر لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی تھی۔ وہ سو گیا تھا کہ وہ چپکے سے دبے پاؤں آ گئی۲۔

سڑک کے کنارے چلتے چلتے وہ یکدم رک گیا۔ یہاں سے ایک پگڈنڈی پھوٹتی تھی جو بل کھاتی ہوئی اس کے گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ اس رستے میں کنویں تھے اور گاؤں تھے اور ہر گاؤں کے باہر برگد یا آم کا درخت تھا جہاں لوگ بیٹھے حقہ پی رہے ہوتے۔ تعارف کے لیے صرف ایک "سلام علیکم" کی ضرورت تھی۔ پانی یا لسی کا ایک پیالا، حقے کے دو کش اور مسافر تازہ دم ہو کر آگے بڑھ جاتے۔ جب سے سڑک پکی ہوئی تھی۔ لوگ پگڈنڈی کو بھول گئے تھے لیکن جب دشمن نے سڑک پر قبضہ کر لیا تو لوگ اس پگڈنڈی کی راہنمائی میں امن کی جگہ تک پہنچ سکے تھے لیکن اب وہ پگڈنڈی غائب تھی۔ کھیتوں

۱- پوری طرح ۲- یعنی جنگ۔

کی مینڈیں ٹوٹ چکی تھیں اور کھلے میدان میں دور دور تک کوئی نشان ایسا نہیں تھا جو پگڈنڈی کو واضح کرتا ۔ تا ہم سڑک سے کچھ دور ہٹ کر درختوں کا وہ جھنڈ موجود تھا جو تھکے ہوئے مسافر کے لیے پہلی مہمان سرائے کا کام دیتا تھا وہ اس کی طرف چل پڑا ۔ درختوں میں گھرا ہوا کنواں غیرآباد تھا اور پتوں، گھاس پھوس اور سوکھی ہوئی شاخوں سے اٹ گیا تھا ۔ جھنڈ سے کچھ فاصلے پر بنے ہوئے مورچے ابھی تک موجود تھے ۔ وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اس کی چھاؤں میں بیٹھ گیا ۔

اس دن جب وہ رات کی پراسرار بوجھل خاموشی سے چونک کر بیدار ہوا تھا تو ایک انجانا خوف کوڑیالے سانپ کی طرح رینگ کر آیا تھا اور اس کے لمس سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے ۔ تب سرحد کی طرف سے گولیوں کے چلنے کی آواز آئی تھی اور پکی سڑک پر ٹرک اور جیپوں کے چلنے کا شور بلند ہوا تو وہ گاؤں کی طرف بھاگا ۔ وہ گورے، لاکھے اور بھوری کو کنویں پر چھوڑ آیا تھا حالانکہ بھوری اسے گاؤں کی طرف جاتے دیکھ کر تھان پر کھڑی ہو گئی تھی ۔ گاؤں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ جنگ کی لپیٹ میں آ چکے ہیں ۔ وہ سیدھا اپنے گھر گیا ۔ اس نے جیناں اور بچوں کو ساتھ لیا اور اسی پگڈنڈی پر آ پہنچا کیونکہ یہ سڑک سے دور دور چلتی تھی اور اس کے دونوں طرف کھیتوں اور درختوں کا حصار تھا ۔ یہ پگڈنڈی اس کے کنویں کے پاس سے گزرتی تھی لیکن وہ گورے، لاکھے اور بھوری کو ساتھ نہ لایا ۔ وہ نفسا نفسی کے عالم میں ان کو بھول گیا جو مدتوں سے اس کے دکھ سکھ کے ساجھی [1] تھے ۔ اس نے اپنی جان

---

[1] حصے دار ۔

کو عزیز سمجھا۔ وہ کتنا بے وفا نکلا تھا!

لیکن وہ رات قیامت کی رات تھی۔ اس رات باپ بیٹے سے اور ماں بیٹی سے بچھڑ گئی تھی اور اس کے ساتھ تو اس کے بال بچے تھے اور وہ انہیں ساتھ ساتھ لیے چل رہا تھا۔ یہ بھی کیا کم تھا کہ وہ انہیں نہیں بھولا تھا۔ ساری رات وہ چلتے رہے اور جب پو پھٹی تو وہ پگڈنڈی اور سڑک کے نقطۂ اتصال پر پہنچ چکے تھے۔ اس کنویں پر مورچے کھد رہے تھے اور توپوں کے دہانے آسمان کی طرف بلند تھے۔ "اب ہم محفوظ ہیں" اس نے کہا۔

لیکن ایک سپاہی نے اونچی آواز سے کہا "یہاں مت رکو۔ آگے بڑھ جاؤ۔ تم ابھی دشمن کی زد میں ہو۔"

ابھی وہ دو چار قدم آگے بڑھے تھے کہ درختوں کے جھنڈ پر پہلا گولا گرا اور ان کے قدموں کے نیچے زمین کانپ گئی۔ پھر آسمان سے گھور گھور کی آواز آئی۔ ایک ہوائی جہاز تڑ تڑ گولیاں برساتا ہوا ان کے سر پر سے گزر گیا۔ سارے سپاہی دھم سے زمین پر لیٹ گئے اور وہ اور جیناں بچوں کی انگلیاں پکڑے بت بن کر رہ گئے۔ ایک جوان نے آواز دی۔ "لیٹ جاؤ جوان! زمین پر لیٹ جاؤ۔ ہوائی جہاز ابھی پھر آئے گا۔"

وہ زمین پر لیٹ گئے اور چاروں طرف سے ڈز ڈز کی آوازیں آئیں۔ آسمان دھواں دھار ہو گیا اور پھر وہی جہاز ان کے سر پر سے گزرا تو ڈگمگا رہا تھا اور اس کی دم سے گاڑھا دھواں نکل رہا تھا۔ مورچے کے پاس لیٹے ہوئے سپاہیوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس نے جیناں کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور بچوں کو

انگلی کے سہارے اٹھایا تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور اس کا چہرہ کورے کاغذ کی طرح سفید تھا ۔ تب سورج نکل آیا اور سیالکوٹ شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں ۔

"جیناں ! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم بچ گئے ۔ وہ دیکھو سامنے شہر نظر آ رہا ہے۔"

" ہاں ! " جیناں نے کہا ۔

" اب ڈر کی کوئی بات نہیں ۔"

" ہاں ! " اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ۔ پھر وہ رو پڑی ۔

" واہ ! اب رونے کی کیا بات ہے بھلا ۔ اب ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا ۔ دشمن اب ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ۔"

"بھوری . . . . . " جیناں نے دبی دبی سسکیوں میں کہا ۔

"بھوری ! " اس نے قہقہہ لگا کر کہا ۔ "تمھیں بھوری یاد آ رہی ہے ۔ گورا اور لاکھا . . . . . . " اور قہقہہ اس کے گلے میں پھنس گیا ۔

" میں جب کنویں سے گاؤں آیا تھا تو تینوں تھان پر بندھے تھے ۔ "

" گورا اور لاکھا تو منہ زور ہیں۔ گولے پھٹیں گے تو ان کی آواز سن کر رسا تڑا لیں گے ۔ بھوری اور اس کا بال تھان پر بندھے بندھے . . . . . "

" جیناں ! " اس کا قہقہہ چیخ بن گیا ۔

" بھوری میرا انتظار کر رہی ہو گی ۔ میں نے رات اس کے لیے بنولے اور کھلی بھگو کر رکھ دی تھی ۔ وہ مڑ مڑ

کر گاؤں کی طرف دیکھتی ہو گی ۔ اس کا بال بھوک اور پیاس سے بلک رہا ہو گا ۔ وہ کھونٹے کے گرد چک پھیریاں لے رہا ہو گا ۔“

”جیناں خاموش رہو ۔ میں مجبور تھا ۔ برستی آگ سے میں کس کس کو بچا کر لاتا ۔“

” تم بھوری کی گردن سے رسہ ہی نکال آتے ۔“

” مجھے کیا پتہ تھا کہ اب کنوئیں پر جانا نصیب نہیں ہو گا ۔“

جیناں خاموش ہو گئی اور وہ اپنے خیالات میں ڈوب گیا ۔ وہ بچوں کو انگلی کا سہارا دیے چلتا رہا اور تھان پر بندھی بھوری ، جس نے اس کی غلامی کا قلاوہ اپنے گلے میں ڈال لیا تھا ، اس کی طرف معصوم آنکھوں سے تکتی رہی - جیسے کہہ رہی ہو - ”میں دس سال سے تمھارے پاس ہوں ۔ میرے دم سے تمھارے گھر میں دودھ کی نہریں بہہ رہی تھیں ۔ میں تمھارے بچوں کی دوسری ماں تھی ۔ میں تمھاری ماں تھی کیونکہ تم نے میرے تھنوں کا دودھ پیا ۔ اب وقت پڑنے پر تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے ۔ تم کتنے خود غرض ہو گئے میں تمھیں دودھ نہیں بخشوں گی ۔ نہیں مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں..... قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے ...... ۔“

”جیناں ! “

” کہو “

” تم حمزہ غوث کا راستہ جانتی ہو نا... اڈہ پسرور سے دکھن کی طرف نالہ ایک ، کا جو پل ہے نا.....“

” کہو “

" وہاں چوہدری کرم دین ہے - وہ کئی بار ہمارے گاؤں آیا تو ہمارے ہاں مہمان بن کر رہا - "

" ہاں میں اسے جانتی ہوں -"

" تم اس کے گھر چلی جانا -"

" اور تم ؟ "

"میں بھوری کو تھان سے کھول کر واپس آ جاؤں گا ...." اس نے بڑے گھمبیر لہجے میں جواب دیا -

جیناں چند لمحوں تک اس کی بات کو نہ سمجھ سکی- لیکن جلد ہی حقیقت، چڑیل کی طرح منہ پھاڑے آئی تو وہ اس کے دامن سے چمٹ گئی -

"جیناں! اگر میں نہ گیا تو بھوری تھان پر بندھی سسک سسک کر مر جائے گی - "

" نہیں " جیناں نے کانپتے ہونٹوں سے کہا -

" اب تم محفوظ ہو - مجھے جانے دو - "

" دیکھو تو ، آسمان سے آگ برس رہی ہے - تم برستی آگ سے زندہ سلامت کیسے نکل آؤ گے ؟ "

"میرا اللہ مجھے بچائے گا- فکر نہ کرو جیناں-"

جیناں نے اس کا دامن چھوڑ دیا اور بچوں کا ہاتھ پکڑ کر سیالکوٹ کا رخ کر لیا - وہ قدم قدم پر مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی - وہ چند لمحوں تک انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا- پھر وہ ایک قافلے میں مل کر گم ہو گئے تو زمین اس کے قدموں سے چپک گئی- وہ بے حسی کے عالم میں کھڑا رہا - تب اس نے اپنے گاؤں کی طرف منہ موڑ کر دیکھا - اس وقت سیالکوٹ کی طرف سے ایک گولا اڑتا ہوا آیا اور اس کے سر پر سے سیٹیاں بجاتا ہوا گزر گیا -

نہ جانے اس گولے کی منزل کہاں تھی لیکن تھرتھراتی ہوئی زمین نے اس کے قدموں کو آزاد کر دیا۔

وہ اسی پگڈنڈی کے متوازی چلتا رہا اور کھیتوں کی آڑ میں اپنے کنویں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گولے اس سے دور دور پھٹ رہے تھے اور گھرر گھرر ٹینک بھی چل رہے تھے۔ پھر اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ نہ جانے کس طرف سے دو جہاز اڑتے ہوئے آئے اور سڑک پر افراتفری مچ گئی۔ ٹینک کھیتوں میں بدحواس ہو کر ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ وہ ایک گڑھے میں لیٹ گیا۔ جہاز غوطہ لگا کر اس کے سر پر سے گزرتے، تو اسے یوں لگتا جیسے وہ درختوں کی پھننگوں سے ٹکرا جائیں گے۔ تب گولیوں کی بارش ہوتی۔ درختوں کی شاخیں کٹ کٹ کر گرتیں اور سڑک سے دھواں اٹھتا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک دوڑتے ہوئے دشمن کے ٹینک پر جہاز شکرے کی طرح لپکا۔ جہاز سے ایک شعلہ اٹھا اور ٹینک بھک سے اڑ گیا۔ اس کا دل دہل گیا۔ وہ خواہ مخواہ جہنم کی آگ میں کود پڑا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ چند منٹ بعد جہاز اس کے سر پر سے گزر کر دور فضاؤں میں گم ہو گئے لیکن دیر تک سڑک اور اس کے ارد گرد کئی جگہ سے دھوئیں کے بادل آسمان کی طرف بلند ہوتے رہے۔ وہ گڑھے میں لیٹا رہا اور اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟ پھر اچانک اسے اپنا فرض یاد آگیا۔ تب روح کے کسی گوشے سے طمانیت کی ایک لہر ابھری۔ اسے یوں لگا جیسے ان جہازوں نے اس کے سر پر اپنے پروں کا سایہ ڈال کر اسے حفاظت کے حصار میں لے لیا ہو۔ وہ دشمن کے نرغے میں اکیلا نہیں تھا۔

وہ پھر کھیتوں کی آڑ میں چلنے لگا اور سلامتی کا سایہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

جب وہ کنوئیں پر پہنچا تو شام پڑ چکی تھی۔ ہو کا عالم طاری تھا۔ بھوری تھان پر لیٹی بڑی بے کسی کے عالم میں گاؤں کی طرف نظر جمائے ہوئے تھی۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر وہ اک دم اٹھ بیٹھی۔ اس نے بڑھ کر بھوری کی گردن میں بازو ڈال دیے۔ اس نے کہا۔ "بھوری! دیکھ میں آن پہنچا۔" اس نے بھوری کے گیلے گیلے منہ پر ہاتھ پھیرا اور بھوری اس کا ہاتھ چاٹنے لگی۔ بھوری کا بال اپنے کھونٹے کے گرد چک پھیریاں لینے لگا۔ بھوری کے تھنوں میں دودھ بھرا ہوا تھا اور شیردان دودھ کے بوجھ سے اکڑ گیا تھا۔ اس نے بال کے گلے سے رسہ نکال دیا۔ بال، بھوری کی طرف لپکا اور بھوری کے تھنوں سے دودھ خود بخود ٹپکنے لگا۔ بچے نے تھنوں پر منہ ڈال دیا۔ وہ چسر چسر دودھ پیتا رہا۔ وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جب بچہ سیر ہو گیا تو اس نے تھن ہاتھ میں لیے اور شرر شرر دودھ کی دھاریں اس کے حلق میں گرنے لگیں۔ نیم گرم میٹھے دودھ کی دھاریں ......

اس نے بھوری کے گلے سے رسے کا "قلاوہ" نکال دیا اور کہا "بھوری! یہ سب کھیت تیرے ہیں۔ جب تک تیرا دانہ پانی ہے، تجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ کون جانے میری اور تیری قسمت میں کیا لکھا ہے"۔ بھوری دن بھر کی بھوکی تھی لیکن وہ تھان سے نہ ہلی۔ اس نے اس کے پٹھے پر ہاتھ رکھا اور وہ اس کے آگے آگے چل پڑی جوار کے کھیت میں پہنچ کر بھوری نے نوخیز پودوں میں منہ ڈالا تھا کہ وہ اندھیرے کی آڑ میں بھوری

سے جدا ہو گیا ۔ اس نے سیالکوٹ کا رخ کر لیا ۔ وہ تھک کر چور ہو چکا تھا ۔ اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا پر وہ خوش تھا کیونکہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا ۔ اب قیامت کے روز وہ بے زبان بھوری کے سامنے جواب دہ نہیں ہو گا ۔

وہ اٹھا اور پھر سڑک کے کنارے چلنے لگا۔ سڑک پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے ۔ کئی جگہ سڑک پس کر چورا ہو گئی تھی ۔ کھیت ویران تھے اور ان کی مینڈیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں ۔ قدم قدم پر ویرانیاں بڑھ رہی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین جل گئی ہو۔ وہ یکایک اداس ہو گیا، حالانکہ اب تک وہ کبھی مایوس نہیں ہوا تھا ۔ وہ اس کٹھن وقت میں بھی خوش رہا تھا جب وہ گھر سے بے گھر ہو گئے تھے ۔ جنگ کی خبریں سن سن کر اس کا خون چلوؤں بڑھا تھا بلکہ اس نے رگ رگ میں ایک نئے خون کو گردش کرتے ہوئے محسوس کیا تھا ۔ وہ ایک دلیر قوم کا جری جوان تھا جس کے کندھوں پر پوری قوم کا بوجھ تھا ۔ وہ اپنے گھر بار کی قربانی دے کر بہت مطمئن تھا کہ اس نے اپنا فرض ادا کیا ۔ وہ کسی سے پیچھے نہیں رہا تھا اور اب وہ فرض کی تکمیل کے لیے اپنے گاؤں جا رہا تھا اور مایوسی دھیرے دھیرے اس کے انگ انگ میں رچ بس رہی تھی ۔ ” مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیے ۔ “ اس نے سوچا : لیکن مایوسی کا بوجھ بڑھتا گیا ۔ جوں جوں ڈر آگے بڑھتا رہا ۔ بوجھ بھاری ہوتا رہا ۔ اس نے گاؤں تک کا فاصلہ اس تھکے ہوئے مزدور کی طرح طے کیا جس کے سر پر منوں بوجھ ہو اور منزل ابھی دور ہو اور ہر لمحہ بوجھ میں اضافہ کر رہا ہو ۔

اس کا گاؤں اجڑا ہوا تھا ۔ گلیوں میں ملبے کے ڈھیر تھے ۔

مکانوں کی چھتیں غائب تھیں ۔ دیواروں پر آگ اور دھوئیں کے نشانات ابھی تک تازہ تھے ۔ کواڑ جل گئے تھے اور راکھ اڑ رہی تھی ۔ وہ اپنے جلے ہوئے مکان کے سامنے چند لمحوں کے لیے رک گیا ۔ پھر ویرانی منہ پھاڑ کر دوڑی تو وہ ڈر کر کھلے کھیتوں کی طرف بھاگا ۔

کھیتوں میں دھول اڑ رہی تھی ۔ درخت کٹ چکے تھے ۔کنویں کے گرد درختوں کا جھنڈ غائب تھا ۔ کٹے ہوئے درختوں کے ٹھنٹھ دیکھ کر اس کا جی بیٹھ گیا " ڈھاری " کی چھت گر گئی تھی اور ہر چیز سے وحشت ٹپک رہی تھی ۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ تھان پر کھڑا تھا ۔ گورے، لاکھے اور بھوری کے کھونٹے موجود تھے اور ابھی تک رسوں کے گلے سڑے پیچ کھونٹوں کے گرد حلقہ کیے ہوئے تھے ۔ کنویں کی منڈیر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی ۔ لوہے کے ڈھول اور چکر تڑ مڑ کر چورا ہو گئے تھے ۔ زنگ آلود ٹکڑے دور دور تک بکھرے ہوئے تھے ۔ ماہل کنویں میں گر گئی تھی ۔ صرف ایک مڑا تڑا پودا سلامت تھا جس کی ایک شاخ سرسبز تھی اور اس پر بھورے رنگ کی ایک چڑیا بیٹھی اسے گول گول حیران آنکھوں سے تک رہی تھی ۔

یکا یک وہ چڑیا بول اٹھی " چوں ۰۰۰ چوں ۰۰ چوں" جیسے پوچھ رہی ہو " تم آ گئے ۔ میں کب سے اکیلی تھی اور تمھارا انتظار کر رہی تھی ۔"

وہ چونک کر جاگ اٹھا ۔ اس نے آنکھیں ملیں ۔ چڑیا کے نغمے سے روشنی کی ایک کرن پھوٹ نکلی تھی ۔

پھر وہ ڈھاری کی پشت پر کے کھیت میں چلا گیا تھا ۔

کھیت کی مٹی کا رنگ سیاہ تھا ۔ اس نے مٹی کی "لپ" بھر کر اسے سونگھا ۔ ابھی تک مٹی سے بارود کی بو آ رہی تھی ۔ اس نے مٹی کو پھینک کر سوچا ۔ "مٹی راکھ بن گئی ہے ۔ راکھ سے کوئی شے جنم نہیں لیتی" پھر وہ ڈھاری کے اندر گیا ۔ اس نے ملبے میں ٹامک ٹوئیاں ماریں ۔ اس کا ہاتھ ایک کسی پر پڑ گیا ۔ اس کا دستہ درمیان میں سے ٹوٹا ہوا تھا اور پھل زنگ کھا گیا تھا ۔ لیکن دستے پر ہاتھ کی گرفت خود بخود مضبوط ہو گئی اور بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اٹھیں ۔ وہ کسی کو ہاتھ میں لیے کھیت میں آ گیا ۔ اس نے اللہ کا نام لے کر کسی کو ہاتھوں میں تولا ۔ زمین پر پہلا پھٹ لگا تو چڑیا نے چوں چوں کا مسلسل راگ چھیڑا، جیسے وہ خوشی سے پاگل ہو گئی ہو ۔ ایک ٹپ ۔۔۔ دوسرا ۔۔۔ اور تیسرے ٹپ پر سرخ سرخ مٹی کے چند ڈھیلے باہر نکل آئے ۔ اس نے مٹی کا ایک ڈھیلا ہاتھ میں لیا اور اسے آہستہ آہستہ مٹھی میں پیسا ۔ پھر اس نے مٹھی کھول دی ۔ بھربھری مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو آئی اس خوشبو میں پھاگن کی بارش کی نمی تھی ۔ اسے یوں لگا جیسے مٹی سے زندگی کا چشمہ پھوٹ بہا ہو ۔

"مٹی زندہ ہے" اس نے خوش ہو کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادلوں کے سفید ٹکڑے اڑ رہے تھے ۔ اور سوندھی سوندھی خوشبو چارکھونٹ بکھر گئی ۔ ایک لہر کٹے ہوئے، جلے ہوئے درختوں سے ٹکرائی اور اس کے لمس سے شگوفے پھوٹ نکلے اور شاخیں ہری بھری ہو کر برگ و بار سے لد گئیں ۔ تھان پر گورا اور لاکھا جھومنے لگے اور بھوری کے تھنوں سے دودھ کی نہریں بہہ نکلیں ۔ روں روں رہٹ چلا ۔ چاندی کی لکیر

ہل کھا کر کھیتوں کی طرف رینگنے لگی اور تب یکایک کھیتوں میں سبزے کی چادریں بچھ گئیں اور ان پر سہ پہر کی سنہری دھوپ لہرانے لگی۔

ایک لمحے کے اندر اندر اس کا کنواں آباد ہو گیا تھا۔

اور وہ کسی ہاتھ میں تھامے، کھیتوں کی لہر بہر دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

سوالات اور مشقیں

(۱) ستمبر ۱۹٦۵ء کی جنگ کا ذکر ہر ایک نے سنا ہے۔ افسانہ نگار نے اسی جنگ کے واقعات کو افسانے کا پس منظر بنایا ہے۔ اس نے سب سے زیادہ زور وطن کی سوندھی مٹی کی محبت پر دیا ہے۔ ہم سب کو وطن کی مٹی بہت پیاری ہے۔ اس کسان کو بھی بہت پیاری تھی جس کا حال اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح ہم یہ افسانہ پڑھ کر ایک سبق تو یہ سیکھتے ہیں کہ ہمیں اپنے وطن کی مٹی سے ایسی ہی محبت ہونی چاہیے جیسی اس افسانے کے کسان کو تھی۔ افسانہ پڑھ کر اس کے علاوہ بھی ہم کئی اچھے سبق سیکھتے ہیں افسانے کو غور سے پڑھیے اور بتائیے کہ وہ سبق کیا کیا ہیں؟

(۲) افسانہ نگار نے افسانے میں کئی جگہ بڑی اچھی اچھی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ آپ کو جو پانچ تشبیہیں سب سے اچھی لگی ہوں ان کے جملے اپنی کاپی میں نقل کیجیے اور سوچیے کہ افسانہ نگار نے جب ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے تشبیہہ دی ہے تو اسے دونوں میں کیا مشابہت دکھائی دی تھی؟

مرزا ادیب

مرزا ادیب ۴ اپریل ۱۹۱۴ء کو لاہور کے ایک مغل گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کارپوریشن کے سکول میں حاصل کی۔ میٹرک تک اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ میں پڑھا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ علم و ادب سے فطری لگاؤ تھا اس لیے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی لاہور کے مشہور رسالے "ادب لطیف" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور سترہ سال تک یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ پانچ سال تک ریڈیو کی ملازمت کی۔ ۱۹۴۲ء میں بمبئی چلے گئے وہاں بھی ایک سال تک ایک ادبی اور فلمی رسالے "مصور" کی ادارت کی۔ کچھ عرصہ بچوں کا رسالہ "تعلیم و تربیت" بھی ترتیب دیتے رہے۔ آج کل ریڈیو پاکستان سے منسلک ہیں۔

مرزا صاحب افسانے اور ڈرامے کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "صحرا نورد کے خطوط" پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء میں چھپی تھی جو بہت پسند کی گئی۔ حال ہی میں اس کا آٹھواں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ "صحرا نورد کے رومان" ان کی دوسری کتاب ہے۔ اس کے بھی اب تک آٹھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈراموں کے چھ مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں "آنسو اور ستارے" "لہو اور قالین" "فصیل شب" "شیشے کی دیوار" "پس پردہ" اور "ماموں جان" جو ڈراما آپ

ابھی پڑھیں گے وہ ان کی کتاب "پس پردہ" سے لیا گیا ہے۔ اس کتاب کو چند سال ہوئے سال کی بہترین افسانوی تصنیف قرار دیا گیا تھا اور اس پر مصنف کو پانچ ہزار روپے انعام ملا تھا۔

مرزا صاحب نے بچوں کے لیے بھی ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ ریڈیو سے ان کے ڈرامے برابر نشر ہوتے رہتے ہیں۔ ڈرامے کی صنف کی جو عملی خدمت مرزا ادیب نے کی ہے اس کی مثال وہ آپ ہیں۔ اردو ڈرامے کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

★

مادرِ قوم

کردار :

کوسم سلطان	ـ	سلطنت عثمانی کی ملکہ
شاہ کوکو	ـ	ملکہ کی خاص خادمہ
نازلی	ـ	ملکہ کی خاص خادمہ
طلعت خانم	ـ	وزیر اعظم احمد پاشا مرحوم کی بیوہ
مصلح الدین قطب الدین	}	عثمانی حکومت کے دو رکن

(قسطنطنیہ کے شاہی محل میں دورِ عثمانیہ کی مشہور مدبر اور جلیل القدر ملکہ کوسم سلطان کا خاص کمرہ ۔ اس وسیع کمرے میں آرائش و زیبائش کا ساز و سامان اس قدر دلفریب ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے محل کے اس گوشے میں اونچی اونچی پرہیبت دیواروں کے درمیان خوابوں کی ایک فسوں ساز اور تخیل انگیز دنیا آباد ہے ۔ دروازوں پر نہایت قیمتی اور رنگ برنگ کے ریشمی پردے لہرا رہے ہیں۔ فرش پر اعلیٰ درجے کا بیش قیمت قالین بچھا ہے۔ جس میں جابجا شیروں اور عقابوں کی شکلیں نمایاں ہیں ۔ ہلکی نیلی ، چھت سے تین فانوس لٹک رہے ہیں اور صبح کی روشنی میں ان فانوسوں کے رنگین اور دل آویز موتی چمک چمک کر فضا میں عجیب پر تجمل کیفیت پیدا کر رہے ہیں ۔

اس وقت صبح ہو چکی ہے ۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا ۔ کوسم سلطان پلنگ پر سو رہی ہے ۔ اس کے دونوں ہاتھ سر کے گرد تکیے پر پڑے ہیں ۔ کوسم سلطان کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہے ۔ سر کے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی آ گئی ہے ۔ ماتھا فراخ ہے ۔ رخسار خشک ہیں۔ محنت شاقہ اور ہر وقت کی سوچ بچار نے اسے ایک لاغر اور نحیف و نزار عورت بنا دیا ہے ۔ ناک لمبی اور ستواں ہے ۔ مجموعی لحاظ سے چہرہ بارعب اور اثر انگیز ہے ۔ پلنگ سے دور ، دروازے کے پاس کوسم سلطان کی سب سے پرانی اور وفادار خادمہ شاہ کوکو نگاہیں قالین پر جمائے بربط پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہی ہے ۔ شاہ کوکو اپنی مالکن کی طرح دبلی ، پتلی ، ادھیڑ عمر کی عورت ہے ۔

چند لمحے گزر جاتے ہیں ۔ دروازے کا پردہ ہٹا کر

نازلی آتی ہے۔ متفکرانہ نگاہوں سے کوسم سلطان کی طرف دیکھتی ہے اور پھر خاموشی کے ساتھ شاہ کوکو کی دائیں طرف بیٹھ جاتی ہے۔ نازلی تیس پینتیس سال کی ہے۔ کوسم سلطان کی خادماؤں میں شاہ کوکو کے بعد اس کا نمبر ہے۔ ملکہ کے خاص کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ شاہ کوکو بدستور بربط بجانے میں مصروف ہے۔ کوسم سلطان پہلو بدل کر منہ دیوار کی طرف پھیر لیتی ہے۔ شاہ کو کو اور نازلی ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں۔ شاہ کوکو بربط سے انگلیاں ہٹا لیتی ہے۔)

نازلی : سو گئی ہیں اب تو !

شاہ کوکو : ساری رات بیدار رہ کر ابھی ابھی سوئی ہیں۔

نازلی : (سرگوشی کے انداز میں) آخر حضور ملکہ اس قدر بے چین کیوں ہیں ؟

شاہ کوکو : ایک خیال پریشان کر رہا ہے انہیں۔

نازلی : شاید انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ محل میں شہزادے کی مخالفت ہو رہی ہے۔

شاہ کوکو : ابھی مخالفت محل سے دور ہے۔ ملکہ کے خوف سے محل میں کوئی شخص بھی شہزادے کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

نازلی : مجھے یقین ہے ملکہ ضرور شہزادے ہی کے بارے میں بے چین ہیں۔ کیونکہ انہیں ہر لحمہ بیٹے ہی کا خیال ہے۔ شاید ہی دنیا میں کسی ماں کو اپنے بیٹے سے اتنی محبت ہوگی جتنی ملکہ کو اپنے لخت جگر سے ہے۔

شاہ کوکو : اس وقت یہاں بیٹھے بیٹھے آج سے پندرہ سال پہلے کی ایک رات یاد آرہی ہے۔ اس رات ملکہ آج ہی کی رات کی طرح بے چین تھیں۔

نازلی : بے چینی کی وجہ کیا تھی؟

شاہ کوکو : شہزادہ علیل تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بلکہ سارا دن، ساری رات بیٹے کے پاس بیٹھی رہیں۔ اس وقت نہ تو انھیں کھانے کی فکر تھی اور نہ کسی اور بات کا خیال، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے جسم سے روح نکالی جا رہی ہے۔ واقعی شہزادے کی زندگی سخت خطرے میں تھی!

نازلی : سوائے بیٹے کے ملکہ کا دنیا میں اور کوئی عزیز نہیں ہے؟

شاہ کوکو : تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے یہاں ایک عجیب واقعہ ہوا ہے۔

نازلی : وہ کیا؟

شاہ کوکو : حضرت ملکہ کو سوئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ ایک دم چونک اٹھیں۔ میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچی۔ پوچھا کیا ہے؟ حضور ملکہ! مگر انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اسی طرح بیٹھی رہیں، جیسے ان کے کانوں میں کوئی آواز آ رہی ہے۔ اور وہ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں نے جب دوسری مرتبہ پوچھا۔ تو کہنے لگیں یہ شور کیسا تھا؟

نازلی : رات تو بالکل خاموش اور پر سکون تھی!

شاہ کوکو : خدا جانے انھوں نے آوازیں کہاں سے سن لیں ۔
نازلی : کوئی بھیانک خواب دیکھا ہوگا ؟
شاہ کوکو : ہاں کہتی تھیں ۔ میں نے دیکھا ۔ برف و باد کے شدید طوفان میں کھڑی ہوں اور یہ طوفان لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا ہے ۔ یکا یک ایک سیاہ بادل چاروں طرف چھا جاتا ہے ۔ اور مجھے تاریکی میں کچھ بھی نظر نہیں آتا !
نازلی : عجیب بھیانک خواب تھا ۔
شاہ کوکو : رات ملکہ نے کئی بار شہزادے کی طبیعت کے بارے میں پوچھا ہے ۔ حالانکہ شہزادہ بالکل صحت مند اور خوش و خرم ہے ۔نازلی ! بیٹے کے معاملے میں عورت کتنی کمزور ہوتی ہے ؟
نازلی : ہاں ! ہماری ملکہ میں یہی ایک کمزوری ہے اور یہ کمزوری ہر ماں میں ہوتی ہے ۔

(کوسم سلطان پہلو بدلتی ہے)

شاہ کوکو : (ہونٹوں پر انگلی رکھ کر) خاموش !
نازلی : سو رہی ہیں ابھی !
شاہ کوکو : ذرا ٹھہرو ! یہ کیا آواز ہے ؟

(خاموشی میں ایسی آواز جیسے کچھ دور دروازے پر دستک ہو رہی ہے)

نازلی : دالان والے دروازے پر شاید دستک ہو رہی ہے ۔
شاہ کوکو : کون آسکتا ہے اس وقت ؟

(کوسم سلطان پریشان ہوکر آنکھیں کھول کر اِدھر آدھر دیکھتی ہے اور تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ جاتی ہے ۔ نازلی وہیں

کھڑی رہتی ہے۔ شاہ کوکو تیزی سے پلنگ کے پاس پہنچ جاتی ہے)۔

کوسم سلطان : کیا ہے یہ ؟

شاہ کوکو : دروازے پر شاید دستک ہو رہی ہے۔

کوسم سلطان : (شاہ کوکو سے) تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟

شاہ کوکو : دیکھتی ہوں جا کر ملکہ!

(اب کے زور سے دستک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ شاہ کو کو پردہ اٹھا کر دروازے سے نکل جاتی ہے۔ کوسم سلطان ٹکٹکی باندھ کر دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ شاہ کوکو آتی ہے)۔

کوسم سلطان : کون ہے ؟

شاہ کوکو : وزیراعظم احمد پاشا مرحوم کی بیگم آئی ہیں۔ شرف باریابی چاہتی ہیں۔

کوسم سلطان : مرحوم احمد پاشا کی بیگم۔ بلا لاؤ!

(شاہ کوکو کمرے سے نکل جاتی ہے چند لمحوں کے بعد اس کے ساتھ طلعت خانم آتی ہے۔ طلعت خانم پینتیس سال کی عورت ہے۔ چہرے پر حزن و ملال کے گہرے اثرات چھائے ہوئے ہیں۔ اس وقت وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس ہے۔ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی وہ وسط میں پہنچ جاتی ہے۔ پھر کوسم سلطان کا بارعب چہرہ دیکھ کر وہیں رک جاتی ہے۔کوسم سلطان پلنگ سے اٹھ کر پلنگ کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور طلعت خانم کو سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہے طلعت کوسم سلطان کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے)۔

کوسم سلطان : ماتمی لباس پہن کر یہاں آنے کا کیا مقصد ہے تمھارا؟

طلعت خانم : فریاد کرنے آئی ہوں ملکہ !

کوسم سلطان : کیا ناانصافی ہوئی ہے تم سے ؟ تمھیں معلوم نہیں میں امور سلطنت میں حصہ نہیں لیتی ۔ جو کچھ کہنا ہے سلطان ابراہیم سے جا کر کہو !

طلعت خانم : انصاف کرنے والا اگر خود ہی نا انصافی کرے تو پھر فریاد لے کر کہاں جائیں ؟

کوسم سلطان : (دبدبے سے) کیا مطلب ہے تمھارا ؟

طلعت خانم : میں نے یہ کہا ہے کہ حضور ملکہ نے سلطنت کے امور جس شخص کے سپرد کردیے ہیں ۔ اگر وہی ناانصافی اور ظلم کرے۔ تو پھر فریاد لے کر آپ کے پاس نہ آئیں تو کیا کریں ؟

کوسم سلطان : طلعت !

طلعت خانم : حضور ملکہ ! مجھے بیوہ بنانے والا ، میرے بچوں کو یتیم بنانے والا آپ کا بیٹا ہے ۔

کوسم سلطان : تیرا مطلب ہے ۔ وزیراعظم احمد پاشا کو سلطان ابراہیم نے قتل کیا ہے ؟

طلعت خانم : جی ہاں ! شہزادے نے میرے شوہر کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے ۔

کوسم سلطان : تجھے غلط فہمی ہوئی ہے طلعت ! شہزادہ کبھی ایسا ظلم نہیں کر سکتا ۔

طلعت خانم : یہ ایک ماں کا فیصلہ ہے ! میں سلطنت عثمانیہ کی انصاف پسند ملکہ کا فیصلہ سننے آئی ہوں ۔

کوسم سلطان : میں ماں بھی ہوں اور ملکہ بھی ۔ مگر ماں کی

محبت انصاف کی آنکھوں کو اندھا نہیں کر سکتی
تم نے شہزادے پر دنیا کا سب سے بھیانک الزام
لگایا ہے ۔ اس کا ثبوت دینا ہوگا تمھیں !

طلعت خانم : آپ اسے الزام سمجھیں یا کچھ اور، بہر حال یہ
حقیقت ہے !

کوسم سلطان : سلطان ابراہیم نے تمھارے شوہر کی زندگی کا
خاتمہ کر دیا ہے ۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ۔
سلطان ابراہیم نے کوسم سلطان کی چھاتیوں سے زندگی
کی حرارت حاصل کی ہے۔ جنت مکان خاقان مرحوم
کے سائے میں تربیت پائی ہے ۔ تم میرے
بیٹے پر الزام لگا کر شاہی خاندان کے غیور خون
کی توہین کر رہی ہو ۔ دورِ عثمانیہ کی مقدس
روایات کو خاک میں ملا رہی ہو ۔ میرا
ابراہیم کبھی اتنا بزدل نہیں ہو سکتا کہ کسی
شخص سے ڈر کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے ۔

طلعت خانم : جب پیار کا بھوت سر پر سوار ہو تو سب کچھ
ممکن ہو جاتا ہے ملکہ !

کوسم سلطان: پیار کا بھوت ؟

طلعت خانم : شہزادہ بد قسمتی سے ایک عورت کے عشق میں
گرفتار تھا ۔ اور یہ جرم اس نے اسی کے اشارے
سے کیا ہے ۔

کوسم سلطان : کون ہے وہ عورت ؟

طلعت خانم : ایک رقاصہ ، ہما خانم ۔

کوسم سلطان : وہ بھورے بالوں والی ، ذلیل رقاصہ ؟

طلعت خانم : ہاں! شہزادے اور رقاصہ کے درمیان مدت سے تعلقات قائم تھے اور سلطنت میں ہر شخص کو اس بات کا علم تھا۔

کوسم سلطان : میں نے آج تک شہزادے کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں سنی۔

طلعت خانم : سلطنت کے ذمہ دار ارکان سمجھتے تھے کہ شہزادہ سنبھل جائے گا۔ اس لیے یہ منحوس خبر سنا کر ملکہ کا دل نہ دکھایا جائے۔ میرے شوہر نے شاہی خاندان کا پرانا وفادار ہونے کی حیثیت سے شہزادے کو رقاصہ کے چنگل سے نکالنے کی انتہائی کوشش کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رقاصہ ان کی مخالفت پر اتر آئی۔ اس نے اپنی زہرآلود باتوں سے شہزادے کو اس قدر متاثر کر دیا کہ ایک دن شہزادے نے جوش غضب میں ان کے قتل کا حکم دے دیا۔

(کوسم سلطان ٹکٹکی باندھ کر طلعت خانم کی طرف دیکھ رہی ہے۔ محل کے نیچے شور بلند ہوتا ہے۔ کوسم سلطان کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے یک لخت شور تھم جاتا ہے۔ کوسم سلطان کھڑکی سے ہٹ کر شاہ کوکو کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باہر جاکر دیکھے یہ کیسا شور ہے؟ سلطان ابراہیم آتا ہے۔ سلطان ابراہیم پچیس سال کا وجیہ جوان ہے اس وقت اس کا رنگ پیلا پڑ گیا ہے)۔

کوسم سلطان : کیا ہے؟ میرے بیٹے!

سلطان ابراہیم : اماں جان! چند سر پھرے لوگوں نے میرے

خلاف سازش پھیلا دی ہے -

کوسم سلطان : (گرج کر) سازش ؟ سلطنت عثمانیہ میں کوئی ایسا شخص بھی ہے - جو میرے بیٹے کے خلاف سازش کر سکے ؟

سلطان ابراہیم : اماں جان ! لوگ مجھ پر حملے کی نیت سے آئے ہیں -

کوسم سلطان : (نازلی سے) ہجوم کے لیڈروں کو فوراً بلا کر لاؤ -

(نازلی کمرے سے نکل جاتی ہے - شور پھر برپا ہوتا ہے - ملکہ جوش غم و غصہ میں ٹہلنے لگتی ہے - قطب الدین اور مصلح الدین آتے ہیں - مصلح الدین آغا بوڑھا آدمی ہے - جسم توانا اور مضبوط ہے - چہرہ بڑا بارعب ہے - قطب الدین بھی مضبوط ڈیل ڈول کا آدمی ہے - اس کی سفید ڈاڑھی سینے پر بکھری ہوئی ہے- دونوں دروازے سے نکل کر سر جھکا کر کھڑے ہوجاتے ہیں -

کوسم سلطان : اس ہنگامے کا مطلب کیا ہے ؟

کوسم سلطان یہ کہتے ہوئے شیرنی کی طرح غضبناک نگاہوں سے دونوں کو دیکھتی ہے)

قطب الدین : (سینے پر ہاتھ رکھ کر) ہمیں اس کا بڑا افسوس ہے کہ قوم نے جوش غضب میں آکر شاہی محل پر حملہ کر دیا ہے -

کوسم سلطان : میری زندگی میں یہ جرأت ! یہ دلیری ؟

مصلح الدین آغا : ملک غم و غصہ سے دیوانہ ہو گیا ہے - ملکہ عالیہ !

کوسم سلطان : تم آج اپنی حقیقت بھول گئے ہو ، تمھیں معلوم

ہے، تم کیا تھے؟ اور ہم نے تمھیں کیا سے کیا بنا دیا ہے؟ تم دونوں کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی بھی میسر نہ تھی۔

قطب الدین : (مؤدبانہ جھک کر) ہمیں سب کچھ معلوم ہے۔ ہمارے جسموں کا ایک ایک ذرہ شاہی خاندان کے احسانات کے نیچے دبا ہوا ہے۔

کوسم سلطان : اور آج ان احسانات کا بدلہ اس طرح اتار رہے ہو کہ میری زندگی میں وحشی ہجوم کو ساتھ لے کر میرے لخت جگر کو قتل کرنے کے لیے آ گئے ہو!

قطب الدین : (جرأت سے) ہم اپنی محترم ملکہ کے اکلوتے بیٹے سلطان ابراہیم کو گرفتار کرنے نہیں آئے، ہم اس سلطان ابراہیم کو کیفر کردار تک پہنچانے آئے ہیں جس نے ہمارے ہردل عزیز وزیراعظم کو انتہائی سفاکی سے قتل کر دیا ہے۔

مصلح الدین آغا: اور اگر ہماری ملکہ نے ماں بن کر مجرم کو اپنے دامن میں پناہ دے دی ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ اپنی ملکہ کے حکم کے آگے ہمیں چون و چرا کی مجال نہیں ہے۔

قطب الدین : اگر سلطنت عثمانیہ کی ماں صرف سلطان ابراہیم کی ماں ہے تو ہمارے پاس کہنے کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ مقتول احمد پاشا کی بیوی صبر کر لے گی۔ مرحوم احمد پاشا کے یتیم بچے اپنے آنسو خشک کر لیں گے۔

مصلح الدین آغا : ملکہ ! ہمیں اجازت دیجیے کہ ہجوم تک آپ کے الفاظ پہنچا دیں - یقین رکھیے - کچھ دیر کے بعد محل کے ارد گرد آپ کو ایک شخص بھی نظر نہیں آئے گا -

(اس دوران میں کوسم سلطان ٹکٹکی باندھ کر مصلح الدین آغا اور قطب الدین کو دیکھتی رہتی ہے - وہاں سے اس کی نظریں بیٹے پر جم جاتی ہیں - جس کے چہرے پر اب زردی کی بجائے سرخی آ گئی ہے - قطب الدین اور اس کے ساتھی خاموش کھڑے ہیں) -

کوسم سلطان : قانون اپنے ہاتھ میں لے کر شاہی محل پر حملہ کر دینا کوئی معمولی جرم نہیں ہے !

قطب الدین : میں عرض کر چکا ہوں - غم و غصہ سے ہم لوگ دیوانے ہو گئے تھے - ہمیں بھی اپنے اس جرم کا اعتراف ہے -

(قطب الدین اور مصلح الدین دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں) -

کوسم سلطان : ٹھہرو ! کیا مقصد لے کر آئے تھے تم یہاں ؟

قطب الدین : قوم اپنا مجرم مانگتی ہے !

کوسم سلطان : جوش غضب میں محل پر حملہ کر دینا ایک بہت بڑا جرم ہے - تمھیں ثابت کرنا ہو گا کہ تمھارا غم و غصہ بجا تھا (شہزادے سے) میرے بیٹے ! قوم تم پر الزام لگا رہی ہے کہ تم نے وزیراعظم احمد پاشا کو ایک رقاصہ کے اشارے پر قتل کر دیا ہے -

سلطان ابراہیم : (خود اعتمادی کے ساتھ) اماں جان ! اس مردود

نے میری سخت توہین کی تھی۔

کوسم سلطان : (جس کے لہجے میں اب گرج اور غصہ ہے) تم اپنے جرم کا اقرار کر رہے ہو ؟

سلطان ابراہیم : (کانپ کر) اماں جان !

کوسم سلطان : جرم ثابت ہوگیا۔ (قطب الدین اور مصلح الدین آغا سے) لے جاؤ مجرم کو یہاں سے.... لے جاؤ...

(سب حاضرین پر سنسنی چھا جاتی ہے)

قطب الدین : ملکہ عالیہ !

کوسم سلطان : میں کوئی لفظ سننا نہیں چاہتی لے جاؤ اسے ... لے جاؤ۔

(کوسم سلطان بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بیٹے کی طرف بڑھتی ہے۔ اس کا گریبان پکڑ کر دروازے کی طرف لاتی ہے اور دھکا دے کر اسے باہر نکال دیتی ہے۔ باہر سے "مادر قوم زندہ باد" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ کوسم سلطان نڈھال ہوکر دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ شاہ کوکو بھاگی ہوئی آتی ہے)۔

شاہ کوکو : ملکہ ! ہجوم سلطان ابراہیم پر ٹوٹ پڑا ہے۔ شہزادہ .... آپ کا بیٹا قتل ہو رہا ہے.... ملکہ ! بیٹے کو بچائیے۔ جس کے بغیر آپ زندہ نہیں رہیں گی۔ جس کے بغیر آپ زندہ نہیں رہ سکیں گی۔

کوسم سلطان : (باوقار لہجے میں) شاہ کوکو کوڑکی بند کر دو۔ اس وقت کمرے سے چلی جاؤ۔ ہمیں تنہائی چاہیے .... جاؤ !)

(شاہ کوکو کھڑکی بند کرنے لگتی ہے۔ کھڑکی بند کرکے

وہ رکتی ہے - پھر چپ چاپ باہر نکل جاتی ہے - کوسم سلطان لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی پلنگ تک پہنچتی ہے اور اس پر دھم سے گر پڑتی ہے - باہر ہجوم کا شور برپا ہے .... "مادر قوم زندہ باد" ...."کوسم سلطان زندہ باد")

سوالات اور مشقیں

(۱) ڈرامے کے ابتدائی حصے میں ڈراما نگار نے کوسم سلطان کا جو مختصر حال بیان کیا ہے اس سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟ آپ کی جماعت میں جتنے طالب علم ہیں، ان میں سے کسی ایک کو غور سے دیکھیے اور اس کے لباس اور شکل و صورت کی تفصیل لکھیے -

(۲) ڈرامے میں ڈراما نگار نے مختلف چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ساتھ ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے ہمیں ان چیزوں کی صحیح حالت کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً اس نے محل کے سازو سامان کو "دلفریب" بتایا ہے اور اونچی اونچی دیواروں کو "پر ہیبت" کہا ہے - ان دونوں مثالوں میں "دلفریب اور پر ہیبت" صفت ہیں اور سازو سامان اور دیواریں موصوف - صفت اور موصوف سے مل کر جو مرکب بنتا ہے اسے مرکب توصیفی کہتے ہیں ' جیسے "دلفریب سازو سامان" اور 'پر ہیبت دیواریں' دونوں مرکب توصیفی ہیں -

اوپر کے سبق میں سے دس مرکب توصیفی تلاش کیجیے اور بتائیے ان میں کون سا لفظ صفت ہے اور کون سا موصوف ؟

(۳) اس ڈرامے میں " انصاف " اور " محبت " کی جنگ دکھائی گئی ہے - " انصاف " کو محبت پر فتح حاصل ہوئی ہے - اسلام کی تاریخ میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں - اپنے بڑوں سے

کہیے کہ وہ اس طرح کا کوئی واقعہ آپ کو سنائیں -

(۴) ذیل کی ترکیبوں کو جملوں میں استعمال کیجیے :-

محنت شاقہ - شرف باریابی - امور سلطنت - چون و چرا - جوش غضب -

مرزا اسد اللہ خان غالب

غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) کا تعلق ایک ترکمانی ایبک خاندان سے تھا اور اس بات پر انھیں بڑا فخر تھا - ان کے آباؤ اجداد مدتوں پہلے ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے تھے - مرزا آگرے میں پیدا ہوئے - پانچ سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا - ۹ برس کی عمر میں چچا کی بھی وفات ہو گئی ، اس لیے ان کی پرورش ننھیال میں ہوئی -

کم عمری ہی میں دہلی آ گئے اور پھر اسی کو مستقل وطن بنا لیا - شاعری میں بہت شہرت پائی - بادشاہ کے دربار میں بھی رسائی تھی - وہاں سے انھیں پچاس روپے مہینہ وظیفہ ملتا تھا - پہلے بہادر شاہ ظفر کے استاد شیخ ابراہیم ذوق تھے - ان کے انتقال کے بعد بادشاہ نے غالب کو اپنا کلام دکھانا شروع کر دیا - غدر ہوا تو ان کی پنشن بند ہو گئی - اس کی بحالی کے لیے گھر سے نکلے اور کئی شہروں کا سفر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے - بہادر شاہ کے علاوہ دوسرے راجا مہاراجا اور نواب بھی غالب کی بڑی عزت کرتے تھے - بعض ریاستوں سے مستقل وظیفہ بھی ملتا تھا - ان میں رام پور کی ریاست بھی شامل تھی - غالب کے خرچ بڑے شاہانہ تھے ' اس لیے ساری زندگی تنگ دستی میں کٹی - آخر ۷۳ سال کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے -

غالب کے خطوط دو مجموعوں میں چھپے ہیں ' ایک کا نام عود ہندی ہے ، دوسرے کا اردوئے معلّیٰ -

یہ خط اردو نثر کی تاریخ میں اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں لکھنے والے نے خط لکھنے کا ایک نیا اور انوکھا انداز اختیار کیا ہے۔ غالب سے پہلے کے جو خط ہمیں ملتے ہیں ان کی عبارتوں میں بڑا تکلف ہے اور وہ حد درجہ رسمی ہوتے ہیں۔ القاب اور آداب اور خط کو شروع اور ختم کرنے کا طریقہ سب خطوں میں تقریباً ایک سا ہوتا تھا۔ غالب نے پہلی مرتبہ خط اس طرح لکھنے شروع کیے جیسے وہ شخص جسے وہ خط لکھ رہے ہیں۔ سامنے بیٹھا ہے اور وہ اس سے بے تکلفی کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ "میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا" ان خطوں کی سب سے بڑی خصوصیت اور خوبی یہی ہے۔

ان خطوں میں ہر طرح کی باتیں لکھی گئی ہیں، اپنے ذاتی حالات، دوستوں کے حالات اور اپنے زمانے کی عام حالت۔ ان خطوں کو پڑھ کر غالب کی ذاتی زندگی اور ان کے زمانے کی سیاسی زندگی کا ایسا حال ہمارے سامنے آ جاتا ہے جیسے ہم نے یہ سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ خطوں میں شاعری کے علاوہ بہت سی علمی باتیں بھی ملتی ہیں۔ خطوں کی اس حیثیت نے انھیں شخصی ڈائری اور ایک خاص عہد کی تاریخ بھی بنا دیا ہے اور علمی معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ بھی۔

غالب کے خطوں میں جس طرح کی سادہ، سلیس ادبی نثر استعمال کی گئی ہے اس نے اردو نثر کی ترقی میں بہت زیادہ حصہ لیا ہے۔

غالب کے جو چھ خط نصاب میں شامل کیے گئے ہیں وہ انھوں نے اپنے مختلف دوستوں کو لکھے ہیں۔ آپ انھیں پڑھیے اور دیکھیے کہ غالب کی خطوط نگاری کی جن خصوصیتوں کا ذکر ابھی کیا گیا ہے انھوں نے ان خطوں میں کتنی عمدگی سے جگہ پائی ہے۔

★

مرزا تفتہ کے نام

صاحب! تم جانتے ہو کہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم، تم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ ہمارے تمھارے دوست دلی تھے۔ اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا۔ اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا۔ اور میں جس شہر میں ہوں۔ اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ! ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔

ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں ۔

اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا ؟ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں ۔ اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے ۔ راجہ صاحب نے صاحبان عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی ، یہ لوگ بچ رہیں ۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آبیٹھے ۔ اور یہ کوچہ محفوظ رہا ۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا ، امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار ، پینشن دار ، دولت مند ، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے ؛ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور وہ باز پرس اور داورگیرا میں مبتلا ہیں ۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں ۔ ہنگامے میں شریک ہو رہے ہیں ۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں ۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو ، خواہی مزدوری جانو ۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں ، میں نے دخل نہیں دیا ۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر کر شہر سے نکل نہیں گیا ۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے ۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی ۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں میری کیا حقیقت تھی غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں ۔ دروازے سے باہر نہیں نکلتا ۔ سوار ہونا

---

۱ - پکڑ دھکڑ

اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے - رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے - شہر میں ہے کون ؟ جو آوے - گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں - مجرم سزا پاتے جاتے ہیں - جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے - کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو معلوم نہیں - بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں - دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے - یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا - تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا - ابھی دیکھا چاہیے - مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں - بہر حال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا - اور یہ خط دکھا دینا - اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دے دیا -

شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء

مشقیں

اس خط میں ایک بات ایسی ہے جسے خاص طور سے ذہن نشین کر لینا چاہیے - یہ ۱۸۵۷ء کا لکھا ہوا ہے - یہ وہی سال ہے جس میں ہندوستانیوں نے (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے) انگریزوں کے خلاف بغاوت کی - اس بغاوت کو لوگ "غدر" کا نام دیتے ہیں - لیکن اصلیت یہ ہے کہ غدر "آزادی کی پہلی جنگ" ہے جو عوام نے انگریزوں کے خلاف لڑی - اس جنگ کا تھوڑا سا حال اس خط میں آیا ہے - خط کے اس حصے کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھیے -

مرزا حاتم علی مہر کے نام

حلیہ مبارک نظر افروز ہوا ۔ جانتے ہو کہ مرزا محمد یوسف علی خاں عزیز نے جو کچھ تم سے کہا اس کا منشا کیا ہے ۔ کبھی میں نے بزم احباب میں کہا ہوگا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے ۔ سنتا ہوں کہ وہ طرحدار آدمی ہیں ۔ اور بھائی تمھاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا ۔ جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کے نوکر تھے اور اس میں اور مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا ۔ تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے ۔ اس نے تمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے ۔ بہر حال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا ۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے ۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا ۔ کس واسطے کہ جب جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا ۔ اور دیدہ‌ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے ۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے ۔ وہ مزے یاد آئے ۔ کیا کہوں جی پر کیا گزرتی ہے ۔

جب ڈاڑھی ، مونچھ میں سفید بال آ گئے ۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے ۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ۔ نا چار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی ۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر

میں ایک وادی ہے عام، ملا ، حافظ، بساطی ، نیچہ بند ، دھوبی ، سقہ ، بھٹیارہ ، جولاہا ، کنجڑا ، منہ پر ڈاڑھی ، سر پر بال ۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی ۔ اسی دن سر منڈوایا ۔ لا حول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم ۔ کیا بک رہا ہوں ۔

اپریل ۱۸۵۸ء

مشقیں

اس خط کے آخری حصے کو پڑھیے اس میں غالب نے اپنے متعلق ایک بات لکھی ہے کہنے کو تو یہ صرف ایک مزیدار بات ہے ، لیکن اسے پڑھ کر ہمیں غالب کے مزاج کی ایک خصوصیت کا علم ہوتا ہے ۔ سوچ کر بتائیے وہ کون سی خصوصیت ہے ؟

یوسف مرزا کے نام

یوسف مرزا! کیونکر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر۔ یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر کی نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کسے کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جوانمرد، ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی، نہ قید فرنگ۔ ہاں صاحب وہ لکھتے ہیں کہ پنشن کا روپیہ مل گیا تھا۔ وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے جو مجرم ہو کر ۱۳ برس کو مقید ہوا ہو اس کی پنشن کیونکر ملے گی؟ رسید کس سے لی جائے گی۔ مصطفےٰ خاں کی رہائی کا حکم ہوا۔ مگر پنشن ضبط۔ ہر چند اس پرسش سے کچھ حاصل نہیں۔ لیکن بہت عجب بات ہے۔ تمہارے خیال میں جو کچھ آئے مجھ کو لکھو۔ دوسرا امر یعنی تبدیل مذہب، عیاذاً باللہ، علیؑ کا غلام، کبھی مرتد نہ ہوگا۔ ہاں یہ ٹھیک کہ حضرت چالاک، سخن ساز اور ظریف تھے۔ سوچے ہونگے ان دموں میں اپنا کام نکالو۔ اور رہا ہو جاؤ۔ عقیدہ کب بدلنا ہے۔ اگر یہ بھی تھا تو ان کا گمان غلط تھا۔

اس طرح رہائی ممکن نہیں - قصہ مختصر تمھاری دادی کا خط جو تمھارے بھائی نے مجھ کو بھیجا تھا - وہ میں نے تمھارے ماموں کے پاس بھیج دیا - ان کی جائداد کی واگزاشت کا حکم ہو تو گیا ہے - اگر ان کے بڑے بھائی کے یار، ان کو چھوڑ دیں - دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے - مظفر مرزا کو دعا پہنچے - تمھارا خط جواب طلب نہ تھا - تمھارے چچا کا آغاز اچھا تھا - خدا کرے انجام اسی آغاز کے مطابق ہو - ان کا مقدمہ دیکھ کر تمھاری پھوپھی کا اور تمھارا سر انجام دیکھا جاوے گا کہ کیا ہوتا ہے - ہوگا کیا ؟ اگر جائیدادیں مل بھی گئیں تو قرضدار دام دام لے لیں گے - رزاق حقیقی پنشن دلوا دے کہ روٹی کا کام چلے - جناب میر قربان علی صاحب کو میرا سلام نیاز اور میر کاظم علی کو دعا -

غالب

مرقومہ ۲۷ شوال (۱۹ مئی ۱۸۶۰ء)

مشقیں

۱ - اس جملے کو غور سے پڑھیے اور اس کا مطلب سمجھا کر لکھیے :-

"جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا ، نہ قید حیات رہی ، نہ قید فرنگ"

۲ - آپ نے شاید غالب کا یہ شعر سنا ہو -

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

آپ کو یہ شعر پسند ہو تو اسے زبانی یاد کر لیجیے اور اس کے معنی پر غور کیجیے -

علاؤ الدین علائی کے نام

جانِ غالب ! تم ثمر نورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہا ہوں۔ کیونکر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے۔ رہی دیدوادید، اس کی دو صورتیں ہیں۔ تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور میں معذور، خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے ؟

سنو ! عالم دو ہیں ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں کا ایک ہے .... ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم، عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم حبس دوام صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے۔ اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخمدار۔ مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم

زائل ہوگئی - بے حیا ہوں - سال گزشتہ بیڑی کو زاویہ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا - میرٹھ ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا - کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا - اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا - بھاگوں کیا ؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی - حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو - ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں گا - بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا - میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا -

جون ۱۸۶۱ء

سوالات اور مشقیں

یہ خط اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں غالب نے اپنی زندگی کے متعلق بہت سی باتیں بتائی ہیں - جو عبارت ''چنانچہ میں آٹھویں رجب '' سے شروع ہو کر ''حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو'' پر ختم ہوتی ہے اسے غور سے پڑھیے اور ذیل کے سوالوں کا جواب بتائیے -

۱ - آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو غالب کی زندگی میں کیا بات پیش آئی ؟

۲ - میرے واسطے ''حکم حبس دوام صادر ہوا'' میں حبس دوام کس چیز کو کہا گیا ہے ؟

۳ - ''دلی شہر کو زندان کیا'' سے غالب کی کیا مراد ہے ؟

۴ - نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا اس جملے میں غالب نے جو بات کہی ہے اس کا مطلب اپنے لفظوں میں لکھیے -

۵ - تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا - - - بلاد شرقیہ سے

یہاں کیا مراد ہے ؟ اور اس میں غالب کی زندگی کے کس واقعے کی طرف اشارہ ہے ؟

یوں سمجھیے کہ اوپر کے سوالوں کا جواب دے کر آپ پانچ معمے حل کریں گے ۔ ۔ ۔ ان معموں کے جواب اپنی کتاب کے آخری صفحہ پر دیکھیے ۔

میر مہدی مجروح کے نام

سید صاحب ! اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے ۔ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا ، میں میر مہدی نہیں کہ میرن صاحب پر مرتا ہوں ۔ میر سرفراز حسین نہیں کہ ان کو پیار کرتا ہوں ۔ علی کا غلام اور سادات کا معتقد ہوں ۔ اس میں تم بھی آ گئے ۔ کمال ہے کہ میرن صاحب سے محبت قدیم ہے ۔ دوست ہوں ، عاشق زار نہیں ۔ بندۂ مہر و وفا ہوں ، گرفتار نہیں ۔ تمھارے بھائی نے سخت مشوش بلکہ نعل در آتش کر رکھا ہے ۔ ایک سلام اصلاح کے واسطے بھیجا اور لکھا کہ بعد محرم کے میں بھی آؤں گا ۔ میں نے سلام رہنے دیا ۔ اور منتظر رہا کہ ڈاک میں کیوں بھیجوں وہ آئیں گے تو یہیں ان کو دوں گا ۔ محرم تمام ہوا ۔ آج سہ شنبہ غرۂ صفرا[1] ہے حضرت کا پتہ نہیں ۔ ظاہرا برسات نے آنے نہ دیا ۔

برسات کا نام آ گیا ۔ سو پہلے تو مجملاً سنو ۔ ایک غدر کالوں کا ، ایک ہنگامہ گوروں کا ، ایک فتنہ انہدام مکانات کا ، ایک آفت وبا کی ، ایک مصیبت کال کی ۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے ۔ آج اکیسواں دن ہے آفتاب اس طرح نظر آتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے ۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں ۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے ۔ مبالغہ نہ سمجھنا ۔ ہزارہا مکانات گر گئے ، سینکڑوں آدمی

---

۱ ۔ ماہ صفر کی پہلی رات ۔

جا بجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر کہ وہ آن کال تھا کہ مینہ نہ برسا۔ اناج پیدا نہ ہوا۔ یہ پن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوائے دانے بہ گئے جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا۔ وہ بونے سے رہ گئے۔ دلی کا حال اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں۔ جناب میرن صاحب کو دعا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

سہ شنبہ ۲۹ جولائی ۱۸۶۳ء

سوالات اور مشقیں

۱ - خط کے دوسرے پارے میں غالب نے ایک غدر اور ایک ہنگامے کا ذکر کیا ہے — یہ کون سا غدر اور ہنگامہ ہے

۲ - اس جملے کا مطلب سمجھا کر لکھیے ''وہ ان کال تھا بونے سے رہ گئے''۔ مطلب لکھتے وقت ''آن کال'' اور ''پن کال'' کی تشریح ضرور کیجیے۔

۳ - ''مبالغہ'' کے معنی لغت میں دیکھیے اور پھر کوئی ایسا شعر سنائیے جس میں شاعر نے مبالغے سے کام لیا ہو۔

مرزا تفتہ کے نام

آؤ مرزا تفتہ! میرے گلے لگ جاؤ۔ بیٹھو اور میری حقیقت سنو۔ سامعہ مر گیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہوگیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رام پور سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں۔ سال گذشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے۔ عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجیے تو میں سکہ لمبر سہی۔ ورنہ خیرات خوار سہی۔ اور اگر یہ عطیہ بشرط خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے۔ وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی۔ اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہ جوانمردی دیے جاتے ہیں۔ اور بھائی! تمھاری مشق چشم بددور صاف ہو گئی۔ رطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا۔ اور اگر خواہی نخواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے تو میری جان! میرے بعد کیا کروگے میں چراغ دم صبح و آفتاب سرکوہ ہوں۔ اناللہ و اناالیہ راجعون

نجات کا طالب غالب

۱۴ رجب ۱۲۸۲ء مطابق ۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء

سوالات اور مشقیں

۱ - ''سامعہ'' سننے کی قوت ہے، ''باصرہ'' دیکھنے کی - سونگھنے کی قوت اور چکھنے کی قوت کے لیے اسی ''وزن'' کے کون سے الفاظ استعمال ہوتے ہیں

۲ - چشم بہ‌دور - رطب و یابس - خواہی نخواہی کو جملوں میں استعمال کیجیے -

۳ - غالب نے اپنے متعلق یہ کیوں کہا کہ میں ''چراغ دم صبح'' اور 'آفتاب سر کوہ ہوں چراغ دم صبح'' اور آفتاب سر کوہ'' کے معنی اچھی طرح سمجھائیے -

★

نذیر احمد دہلوی

مولانا نذیر احمد کے حالات زندگی آپ اسی کتاب کے ابتدائی حصہ میں پڑھ چکے ہیں مولانا کی شہرت ان کے ناولوں کی بنا پر ہے لیکن انھوں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی اردو نثر کے بڑے پیارے نمونے ملتے ہیں ان خطوط میں انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں اور انسانی رشتوں کے بارے میں نہایت سلیس اور شستہ زبان میں اظہار خیال فرمایا ہے آیندہ چند صفحات میں آپ مولانا نذیر احمد کے دو خط پڑھیں گے پہلا خط انھوں نے اپنی بیگم کے نام لکھا ہے جس میں بیٹی کی وفات پر بیگم کو پرسہ دیا ہے دوسرا خط انھوں نے اپنے بیٹے بشیر الدین کے نام لکھا ہے -

موعظۂ حسنہ

خط ۱؎

بیوی صاحب کو سلام کے بعد معلوم ہو۔ یہ بھی ایک وفا کا دستور قرار پا گیا ہے کہ جب کسی کا کوئی عزیز قریب مر جاتا ہے تو لوگ اس کی ماتم پرسی کیا کرتے ہیں۔ میں تم کو یہ خط اس دستور کے مطابق نہیں لکھتا۔ کیونکہ مصیبت تنہا تم پر نہیں مجھ پر بھی ہے۔ میاں بی بی کا عجب رشتہ ہے کہ مرد و عورت نکاح کے ہو جانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کسی اور رشتے میں نہیں پائی جاتی۔ میرا تمھارا مال مشترک، گھر مشترک، کھانا پینا مشترک، اولاد مشترک، آبرو مشترک، خوشی مشترک، رنج و غم مشترک۔ اگر وہ لڑکی جیتی تو کیا تمھاری اکیلی کی بیٹی ہوتی؟ نہیں میری تمھاری دونوں کی، پس اگر مر گئی تو تمھاری اکیلی کی بیٹی مری؟ نہیں، میری تمھاری دونوں کی۔ پھر بھی میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اس سے بڑا قوی تعلق تھا لیکن روحانی تعلق کی وجہ سے شاید جس دن وہ مری ہے، میرا دل خود بخود بے قرار تھا اور میں نے اسی گھبراہٹ میں میاں بشیر کو خط بھی لکھا۔ تاریخ ملا کر دیکھو، غالب ہے کہ خط کی تاریخ اور اس کے مرنے کی تاریخ ایک ہوگی۔

۱۔ یہ خط بیٹی کی موت پر لکھا گیا تھا۔

ظہیر، نصیر۱ وغیرہ کے مرنے سے یہ تو بخوبی تجربہ کر چکے کہ موت پر انسان کا کچھ اختیار نہیں چلتا ۔ رہا رنج وہ بھی رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے، میں تم پر الزام نہیں لگاتا ۔ اپنا حال بیان کرتا ہوں کہ نصیر کو کس قدر پیار کرتا تھا ۔ اس کی قبر میری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ اور میں سوتا بھی ہوں، ہنستا بولتا بھی ہوں، دنیا کا کوئی کام مجھ سے نہیں چھوٹا، تو جب ظہیر، نصیر کے رنج کو ہم نے چند سال میں بھلا دیا ہے تو یہ لڑکی بیچاری کے دن کی تھی؟ آخر پھر دنیا اور دنیا کے کام ۔ کتابوں میں بہت ٹھیک لکھا ہے ۔ کہ دانا اور احمق دونوں صبر کرتے ہیں مگر فرق اتنا ہوتا ہے کہ احمق رو دھو کر چپ کرتا ہے اور دانا شروع سے خدا پر نظر کرکے چپ ہو رہتا ہے ۔ غرض صبر تو آخر کرنا پڑے گا ۔ پس کیا فائدہ کہ اتنا ثواب ضائع کریں ۔ دل کو مضبوط کر، آنسو پونچھ، سنبھل بیٹھو، خدا ہمارا مالک ہے ۔ اسی نے دیا اسی نے لے لیا، خدا کو ہم سے عداوت نہیں پر نہیں، جو کچھ وہ کرتا ہے ہمارے نفع کے لیے کرتا ہے لیکن کم فہمی کی وجہ سے ہم ان مصلحتوں کے سمجھنے سے قاصر ہیں ۔

دنیا کے انتظام پر نظر کرو تو تندرستی، مال، اولاد حکومت، شرافت، دینداری، ہزاروں طرح کی نعمتیں ہیں ۔ اور یہ نعمتیں خداوند کریم نے اپنی مرضی کے مطابق لوگوں میں تقسیم کی ہیں ۔ ایک سے ایک کو بڑھ کر بنایا ہے ۔ ہم کو بھی اس نے اپنی نعمتوں میں سے بہت بڑا حصہ

---

۱ ۔ دو بیٹوں کے نام ۔

عطا فرمایا ہے۔ تو کیا ہم ٹھیکہ دار ہیں کہ خدا کی سب نعمتیں اپنے گھر میں گھسیٹ کر بھر لیں۔ اور پھر اولاد سے بھی، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، ہم محروم نہیں۔ ان کی عمروں میں خدا برکت دے، ان کو دین و دنیا کی فلاح ہو، کافی ہیں۔ اب زیادہ اولاد لے کر کیا کروگی؟ انھیں پر اپنی محبت صرف کرو، ان کے حق میں خدا سے دعا مانگو اور مصیبت پر صبر کرو کہ خدا کی مرضی! شاید عاقبت میں انھیں مصیبتوں کے طفیل ہم پر رحم ہو۔ کسی استاد کا کیا اچھا قطعہ ہے:

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اے خدا! ہم کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین! آدمی کو چاہیے کہ جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہو تو دوسرے بندگان خدا کے حال پر نظر کرے۔ وہ پائے گا کہ ہزاروں آدمی اس سے بدتر حالت میں مبتلا ہیں۔ تم گھر کے گھر میں بیچاری ... کو دیکھو! بڑی ناشکری کی بات ہے کہ ہم ٹوکروں احسان اور چھکڑوں سلوک بھول جائیں اور تنکے بھر بھی رنج کی برداشت نہ کریں۔ بشیر بچہ ہے تم کو روتے دیکھ کر سہما جاتا ہو گا۔ اس کے حال پر رحم کرو، اپنے حال پر رحم کرو، کہ کیا تمھاری حالت ہو گئی ہے۔ آخر یہ کالبد خاکی سد سکندر تو نہیں ہے۔ اسی طرح رنجوں کے مارے اس کو تحلیل کر ڈالو گی، تو کیا انجام ہو گا۔

۴ جون ۱۸۷۶ء

خط - ۲

بشیر! ۷ ا کا خط پہنچا - بندۂ خدا! اتنی دیر مت کیا کرو - کیا کفایت شعاری اسی میں منحصر ہے کہ مجھ کو خط لکھنے میں کمی کی جائے؟ میں نے تم کو پہلے بھی لکھا ہے اور اب پھر لکھتا ہوں کہ امتحان کے بھروسے پر مت رہو، کسی طرح جماعت میں ترقی کرو اور آگے کو نصیحت پکڑو، مدرسے میں کامیابی اور ناموری کے ساتھ پڑھنا یوں تو نہیں ہو گا - مدرسے کے علاوہ گھر پر کم از کم تین یا چار گھنٹے روز دل لگا کر پڑھو گے تو خیر - ورنہ کیوں خود حیران ہوتے ہو؟ اور کیوں ہم سب کو حیران کرتے ہو؟ دنیا کی کاروائی کے لائق تم کو لکھنا پڑھنا آ ہی گیا ہے - بس میرے پاس رہ کر قانون یاد کرو - اور امتحان دو، مدرسے میں پڑھنا منظور ہے تو یاد رکھو! انٹرنس پہلی منزل ہے - بھلا کچھ نہ ہو تو بی - اے تک تو ہو -

بشیر! درجہ فضیلت حاصل کرنے کے یہ ڈھنگ نہیں جو تمھارے ہیں - ہر روز کے سبقوں کو بالالتزام مطالعہ اور پڑھنے کے بعد نظر تدقیق سے ان کو دیکھنا اور ذہن نشیں کرنا اور ایک درجہ اعتدال کے ساتھ محنت کا برابر جاری رکھنا، شرط ضروری ہے - تمھارا یہ حال ہے کہ پہلے ہی امتحان میں یہ تردد کہ پاس ہوئے یا نہیں، تو اگلے امتحان جو کہیں سخت ہیں، کیونکر ان سے عہدہ برآ ہو سکو گے؟ غرض پڑھنا ہے تو پڑھنے کے طور پر پڑھو - کہیں چاندنی چوک جا نکلے - کہیں عجائب خانے کی سیر کی، کچھ وقت قصے کہانیوں میں ضایع کیا، دو گھڑی

رات گئی اور سو رہے - یوں تو پڑھنا نہیں آتا - پڑھنا جب آسکتا ہے کہ تم ایک ایک منٹ کی قدر کرو اور جہاں تک تندرستی اجازت دے۔ محنت کرتے رہو - تم اب تک مجھ سے صرف عربی میں پوچھتے تھے - آئندہ ریاضی بھی پوچھا کرو - زیادہ نہیں تو انٹرنس تک تو بتاؤں گا - حساب و جبرو مقابلہ کی خامی متوجہ ہو کر نکال ڈالو - تاریخ کے واقعات بطور سوال جواب مرتب کرتے جاؤ - تب امتحان دینے کا مزہ ہے - نری دعا سے کام نہیں چلتا - شوق نہیں ورنہ مولوی صاحب کے ہوتے تم کو عربی کا حاصل کرنا کیا دشوار تھا - مدرسے کی چیزوں کا حیلہ اور ان میں بھی نقصان -

سوالات اور مشقیں

(۱) اوپر کے دونوں خط مولانا نذیر احمد کے ہیں - ان کے حالات اور ان کی تصانیف کا حال آپ کچھ پہلے پڑھ چکے ہیں - ان خطوں میں سے ایک خط نذیر احمد نے اپنی بیوی کو لکھا ہے اور ایک اپنے بیٹے کو - دونوں خطوں میں بڑے کام کی باتیں کہی گئی ہیں - ان خطوں کو غور سے پڑھیے اور نیچے لکھے ہوئے سوالات ۲ اور ۳ کا جواب لکھیے -

(۲) "دانا" اور "احمق" دونوں صبر کرتے ہیں ، لیکن ان دونوں کے "صبر" میں کیا فرق ہے ؟

(۳) آدمی پر جب کوئی مصیبت نازل ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے

(۴) نیچے کے جملے کا مطلب اچھی طرح سمجھا کر لکھیے :

"آخر یہ کالبد خاکی سد سکندر تو نہیں ہے"

سر سید احمد خاں

سید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) دہلی کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ شاہی زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، لیکن ان کے والد سید محمد تقی ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے انھیں اپنا وزیر بنانا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ سر سید کی والدہ بھی بڑی نیک اور دیندار خاتون تھیں۔ سر سید کی تعلیم و تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

۱۸۳۸ء میں سر سید نے سرکاری ملازمت کی اور سررشتہ دار کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے سب جج ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں وہ بجنور میں تھے۔ یہاں انھوں نے بہت سے انگریزوں کی جان بچائی۔ غدر میں سر سید نے مسلمانوں کی جو تباہی اور بربادی دیکھی تھی اس کا ان کے دل پر بڑا اثر پڑا اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ ساری عمر قوم کی خدمت میں صرف کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کے نزدیک قوم کے حق میں جو کچھ اچھا تھا وہی کرتے تھے۔ کسی طرح کی مخالفت انھیں ان کے نیک ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

سر سید نے یوں تو مسلمانوں کے لیے بہت سے اچھے اچھے کام کیے، لیکن ان کے دو کام خاص طور سے ایسے ہیں جن سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ پہلا کام تو یہ کہ ۱۸۷۷ء میں انھوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ یہ کالج آگے چل کر یونیورسٹی بنا اور آج تک قائم ہے۔

ہندوستان کے ہر حصے سے مسلمان یہاں پڑھنے آتے تھے اور یہاں کی قومی فضا سے متاثر ہوتے تھے - کالج کی تعلیم نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں قومی احساس اور قومی محبت کی لہر دوڑا دی تھی -

سر سید کا دوسرا بڑا کام رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا جاری کرنا ہے - اس رسالے میں مذہبی ، قومی ، دینی اور اخلاق پہلوؤں پر مضامین شائع ہوتے تھے - ان مضامین کی زبان صاف ، سادہ اور سلیس ہے - ہر بات دلیل اور معقولیت کے ساتھ کہی گئی ہے - اس نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر طرح کے سنجیدہ خیالات اس کے ذریعے ادا کیے جا سکتے ہیں - سر سید کی عبارت میں ہر جگہ متانت ہوتی ہے ، لیکن اس متانت سے عبارت میں خشکی نہیں پیدا ہوتی -

سر سید پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اردو میں اس صنف کو رواج دیا جسے انگریزی میں "Essay" کہتے ہیں - اردو میں اب ہم اسے انشائیہ کہتے ہیں - "تہذیب الاخلاق" کے مضامین نے اردو نثر کو جس بلند قومی اور اصلاحی مقصد کے لیے استعمال کیا اس نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور اس عہد کے سب لکھنے والے اس سے متاثر ہوئے - اس تحریک کی بدولت اردو نثر اور اردو ادب نے بہت ترقی کی - اسی لیے ہم اس عہد کو اردو نثر کا "عہد زریں" کہتے ہیں -

آگے چل کر آپ جو دو سبق پڑھیں گے وہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" سے لیے گئے ہیں -

★

کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں ۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا ، کام کاج محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا ، اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے ، مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قوئ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے ۔

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لیے نہایت ضروری ہے ، اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ بمجبوری اس کے لیے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں ۔ محنت کرنا اور سخت سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا ان کی طبیعت ثانی ہو جاتی ہے ، مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قوئ کو بیکار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں ۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے ، لیکن اگر انسان ان عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قوئ کو بیکار ڈال دے تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے ۔ انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک

حیوان ہے اور جب کہ اس کے دلی قویٰ کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے اور جسمانی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے اور انسانی صفت کو کھو کر پورا حیوان بن جاتا ہے - پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور ان کو بیکار نہ چھوڑے -

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اس کے اخراجات کو مناسب ہو اور اس کے حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے جیسا کہ ہمارے ہندوستان میں ملکیوں اور لاخراج داروں کا حال تھا ، اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بے کار ڈال دے تو اس کا حال کیا ہوگا - یہی ہوگا کہ اس کے عام شوق ، وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جاویں گے - شراب پینا اور مزے دار کھانا اس کو پسند ہوگا ، قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا اور یہی سب باتیں اس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں ، البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ ، بدسلیقہ ، وحشی ہوتے ہیں اور یہ ایک وضع دار وحشی ہوتا ہے - شراب پی کر پلنگ پر پڑے رہنا اور پیچواں کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے اور جنگل کی ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دھوئیں اڑانا اس کو پسند ہوتا ہے - پس پیچواں اور ناریل اور بچھونے اور ریت کے فرق سے کچھ مشابہت میں جو ان دونوں میں ہے کمی نہیں ہوتی -

ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لیے ایسے کام بہت کم ہیں جن میں ان کو قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے اور برخلاف اس کے اور ولایتوں

میں اور خصوصاً انگلستان میں وہاں کے لوگوں کے لیے ایسے موقعے بہت ہیں اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اگر انگریزوں کو بھی کوشش اور محنت کی ضرورت اور اس کا شوق نہ رہے جیسا کہ اب ہے تو وہ بھی بہت جلد وحشت پنے کی حالت کو پہنچ جاویں گے ، مگر ہم اپنے ہم وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے ، یعنی اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دیا ہے ۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش چاہیے کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہو ۔ اگر اس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اس کی فکر اور کوشش چاہیے کہ قصور وہ کیونکر رفع ہو ۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑا رہنا نہ چاہیے ، کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے ، تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی ، یعنی دل کو بے کار پڑا رکھنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے ۔ نہایت حکیمانہ قول ہے کہ :

"بے کار مباش کچھ کیا کر"

خوشامد

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جبکہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آیند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا ہی پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔

اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے، پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا

نہایت حق اور انصاف ہے ، جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی اس قدر ، قدر کرتے ہیں - جبکہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آ جاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہو جاتی ہے اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہے -

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینے سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا - جب کہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں - گو بسبب اس کمینے شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں ، مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے ، جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں - اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بعوض[۱] جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں ، کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں - ایک تیز مزاج اور چست چالاک آدمی اپنے موقع

۱- بجائے -

پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے کہ ایک روتی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کردیتی ہے، مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔ جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سےخود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے، دونوں شخص خوش ہوتے ہیں۔ ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے، مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوشنما معلوم ہو۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے، بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف، تعریف نہیں رہتی، بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا، مگر جب کسی کمزور

دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز بو کی مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اورعالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجے سے اوپر ہیں انھی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

سوالات اور مشقیں

۱۔ خوشامد اور کاہلی کے متعلق سرسید نے جو باتیں اب سے سو برس پہلے لکھی تھیں وہ آج بھی اتنی ہی سچ ہیں جتنی سرسید کے زمانے میں۔ ان دونوں سبقوں کو پڑھ کر آپ ''خوشامد'' یا ''کاہلی'' پر مضمون لکھیے۔

۲۔ اوپر کے سبقوں میں ذیل کی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں

محبت و مہربانی۔ حق اور انصاف۔ مکر و فریب۔ زر و زمین۔

ان چاروں ترکیبوں میں دو دو لفظوں کو آپس میں ''و'' اور ''اور'' کے ذریعے ملایا گیا ہے۔ ''و'' اور ''اور'' قواعد کی رو سے ''حرف عطف'' ہیں۔ اور اوپر کی چاروں ترکیبیں مرکب ''عطفی''۔ دونوں سبقوں میں سے چار ''مرکب عطفی'' اور تلاش کیجیے۔

مولانا محمد حسین آزاد

محمد حسین آزاد (۱۸۳۲-۱۹۱۰ء) دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی - پہلے گھر پر پڑھا - اس کے بعد دہلی کالج میں داخل ہوئے اور یہیں سے تعلیم کی تکمیل کی - ان کے والد مولوی محمد باقر اپنے زمانے کے عالموں میں شمار ہوتے تھے - دوسرے با اثر مسلمانوں کی طرح یہ بھی غدر کے زمانے میں گرفتار ہوئے - کچھ دن قید میں رہے - اس کے بعد انگریزوں نے انھیں گولی مار کر ختم کر دیا -

والد کے انتقال کے بعد آزاد لکھنؤ چلے گئے ، لیکن جب تک وہاں رہے ، اطمینان نصیب نہ ہوا - آخر ۱۸۶۴ء میں لاہور آ گئے اور زندگی کے باقی دن یہیں گزارے - پہلے محکمہ تعلیم میں پندرہ روپے مہینہ پر ملازم ہوئے - پھر اتالیق پنجاب اور پنجاب میگزین کے ایڈیٹر رہے - اس وقت ان کی تنخواہ ۵۷ روپیہ ماہوار تھی - ۱۸۶۵ء اور ۱۸۸۳ء میں ایران کا سفر کیا - کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی ، فارسی کے پروفیسر رہے - ۱۸۸۷ء میں شمس العلما کا خطاب ملا - ۱۸۸۹ء میں دماغ کے مرض میں مبتلا ہوئے اور اس کے بعد زندگی کے بیس سال کبھی دیوانگی اور کبھی غم دیوانگی کی حالت میں گزارے - تصنیف و تالیف کا سلسلہ اس زمانے میں بھی جاری رہا - آخر ۲۳ جنوری ۱۹۱۰ء کو انتقال ہوا -

آب حیات ، دربار اکبری ، سخندان فارس اور نیرنگ خیال ان کی مشہور تصانیف ہیں - اس کے علاوہ

بچوں کے لیے بھی کتابوں کا بہت اچھا سلسلہ مرتب کیا تھا - قصص ہند بھی ان کی بڑی دلچسپ کتاب ہے -

آزاد کا طرز تحریر بڑا دلکش اور دل نشیں ہے - ان کی ہر عبارت میں بڑی جدت اور تازگی ہوتی ہے - ایک ایک فقرہ رنگینی میں ڈوبا ہوا ہے - ان کی کوئی تحریر پڑھنا شروع کر دیں تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا - عبارت میں ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہوتا ہے - یہی وجہ ہے کہ کوشش کے باوجود کوئی لکھنے والا ان کے طرز تحریر کو اپنانے میں کامیاب نہیں ہوا - کسی نے ان کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ اردو کے واحد نثار ہیں جنھوں نے نثر میں شاعری کا لطف پیدا کیا ہے -

آگے چل کر آپ جو دو سبق پڑھیں گے ان میں سے ایک ''آب حیات'' سے لیا گیا ہے اور دوسرا ''نیرنگ خیال'' سے - آب حیات اُردو شاعری کی تاریخ ہے اور 'نیرنگ خیال' تمثیلی مضامین کا مجموعہ -

★

نظم اردو کی تاریخ

فلاسفہ یونان کہتے ہیں شعر خیالی باتیں ہیں - جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں - قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے - اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی - جب صبح کا نور ظہور دیکھتا

ہے تو کبھی کہتا ہے دیگ مشرق سے دودھ ابلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے دریائے سیماب موجیں مارنے لگا۔ کوئی مشرق سے کافور اڑاتا آتا ہے۔ صبح تباشیر بکھیرتی آتی ہے یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اس میں پیدا نہیں ہوئے۔ وہ کہتا ہے۔ سنہری گیند ہوا میں اچھالی ہے۔ صبح طلائی تھال سر پر دھرے آتی ہے۔ کبھی مرغان سحر کا غل اور عالم نور کا جلوہ، آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کرکے صبح کی دھوم دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ بادشاہ مشرق سبز خنگ فلک پر سوار، تاج مرصع سر پر رکھے، کرن کا نیزہ ہاتھ میں لیے، مشرق سے نمودار ہوا۔ شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے مغرب کے چھپر کھٹ میں آرام کیا، اور شنگرفی چادر تان کر سو رہا۔ کبھی کہتا ہے۔ جام فلک خون سے چھلک رہا ہے، نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی۔ تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لاجوردی چادر میں ستارے ٹکے ہوئے ہیں۔ دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے اور روپہلی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ غرض ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں مگر اصلیت سے انہیں کچھ بھی غرض نہیں ہے۔ باوجود اس کے صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت، صنائع الٰہی سے ہے۔ اسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ اول ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھتے ہیں اور نثر میں پڑھتے ہیں۔ پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ دیتے ہیں تو کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس میں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں:

۱ - وہ وصف خاص کہ جسے سب موزونیت کہتے ہیں۔

۲ - کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے اور مضمون میں ایسی تیزی آ جاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے -

۳ - سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں -

تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم و غصہ یا کسی ذوق و شوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے اور وہ قوت بیان سے ٹکراتا ہے تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے، جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے - اسی واسطے شاعر وہی ہے جس کی طبیعت میں یہ صفت خداداد ہو - قدرتی شاعر اگرچہ ارادہ کرکے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے مگر حقیقت میں اس کا دل اور خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں - قدرت کے کارخانے میں جو چیز اس کے حواس میں محسوس ہوتی ہے اور اس سے کچھ اثر اس کی طبیعت اٹھاتی ہے - وہ ہر شخص کو نصیب نہیں - خواہ لطف، شگفتگی ہو، خواہ آزردگی یا بیزاری - یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ اٹھاتا ہے اس کے لیے ڈھونڈتا رہتا ہے کہ کیسے لفظ ہوں اور کس طرح انہیں ترکیب دوں تاکہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے وہی کیفیت سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے اور وہ بات کہوں کہ دل پر اثر کر جائے -

شاعر کبھی ایک حجرے میں تنہا بیٹھتا ہے - کبھی سب سے الگ اکیلا پھرتا ہے - کبھی کسی درخت کے سائے میں تنہا نظر آتا ہے اور اسی میں خوش ہوتا ہے - وہ کیسی ہی خستہ حالی میں ہو - مگر مزاج کا بادشاہ اور دل کا حاتم ہوتا ہے - بادشاہ کے پاس فوج و سپاہ، دفتر، دربار اور ملک داری

کے سب کارخانے موجود ہیں، اس کے پاس کچھ نہیں۔ مگر الفاظ و معانی سے وہی سامان بلکہ اس سے ہزاروں درجے زیادہ تیار کر دکھاتا ہے۔ بادشاہ سالہا سال میں کن کن خطرناک معرکوں سے ملک یا خزانہ جمع کرتا ہے یہ جسے چاہتا ہے گھر بیٹھے دے دیتا ہے اور خود پروا نہیں کرتا۔ بادشاہ کو ایک ولایت فتح کرکے وہ خوشی حاصل نہیں ہوتی جو اسے ایک لفظ کے ملنے سے ہوتی ہے جو اپنی جگہ پر موزوں سجا ہوا ہے اور حق یہ ہے کہ اسے ملک کی پروا بھی نہیں۔

اس بات میں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ ابراہیم ذوق جس مکان میں بیٹھتے تھے تنگ و تاریک تھا۔ گرمی میں دل دق ہو جاتا تھا۔ بعض قدیمی احباب کبھی جاتے تو گھبراتے اور کہتے مکان بدلو، گھڑی بھر بھی بیٹھنے کے قابل نہیں۔ تم کیونکر دن رات یہیں کاٹتے ہو۔ وہ ہوں ہاں کرتے اور چپکے ہو رہتے۔ کبھی مسکراتے، کبھی جو غزل کہتے ہوتے اسے دیکھنے لگتے۔ کبھی ان کا منہ دیکھتے۔ خدا نے مکانات، باغ، آرام و آسائش کے سامان سب دیے تھے۔ مگر وہ وہیں بیٹھے رہے اور ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ اچھا ان کے قصاید اور غزلیں دیکھ لو۔ کسی بادشاہ کی سلطنت میں اس شان و شکوہ اور دھوم دھام کے سامان موجود ہیں؟۔ گویا سلطنت کے سامان سب انہی کا مال تھے کہ جس طرح چاہتے تھے اپنے کام میں لاتے تھے۔ جب وہ اپنے کلام کو پڑھتے تھے تو بادشاہ کو جو مالک سلطنت ہوتا تھا کچھ ان سے زیادہ خوشی نہ ہوتی ہوگی۔ کیونکہ اسے ان کا فکر بھی رہتا ہے۔ انہیں پروا بھی نہیں تھی۔

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق بے کچھ نہ کچھ

روئیدگی کے نہیں رہ سکتی - اسی طرح کوئی زبان اپنے اہل زبان کی حیثیت کے بموجب نظم سے خالی نہیں رہ سکتی - ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی زمین کی خاصیت ظاہر کرتی ہے - زبانوں کے سلسلے میں ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہل زبان کی شائستگی اور تہذیب عملی کے ساتھ لطافت طبع کے جلوے دکھاتی ہے۔

زبان اردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تصنیفات پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم آئے گی - اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے پھر باتیں کرنی سیکھے - ہاں نظم جوشِ طبع تھا اس لیے پہلے نکل پڑا - نثر شائستگی کے بوجھ سے گراں بار تھی، اپنی ضرورت کے وقت ظہور کیا - نثر اردو کی تصنیف ۱۱۴۵ھ[1] سے پہلے نظر نہیں آتی - البتہ نظم کی حقیقت زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر یہ نکلتی ہے کہ جب برج بھاشا نے اپنی وسعت اخلاق سے عربی، فارسی الفاظ کے مہمانوں کو جگہ دی تو طبیعتوں میں اس قدر روئیدگی نے بھی زور کیا - لیکن وہ صدہا سال تک دوہروں کے رنگ میں ظہور کرتی رہی، یعنی فارس کی بحریں اور فارسی کے خیالات نہ آتے تھے -

امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی - ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا - خالق باری[2] جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کتنی بڑی بڑی جلدوں میں تھی - اس فارسی کی بحروں نے اول اثر کیا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت

۱- یہ ملا وجہی کی کتاب "سب رس" کی تصنیف کا سال ہے -

۲- امیرخسرو سے منسوب ایک کتاب -

کون کونسے الفاظ مستعمل تھے جو اب متروک ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی پہیلیاں عجب عجب لطافتوں سے ادا کیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقے میں کیا لطف پیدا کیا۔ مکرنی ، انمل ، دو سخنے وغیرہ خاص ان کے آئینے کا جوہر ہے۔ ہر ایک کی مثال لکھتا ہوں۔ کیونکہ ان میں سے بھی اس وقت کی زبان کا کچھ نہ کچھ پتہ لگتا ہے :

نبولی کی پہیلی

تروور سے اک تریا آتری اس نے بہت رجھایا
باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہیں اپنا نام نبولی

آئینے کی پہیلی

فارسی بولی آئینہ   ترکی سوچی پائینہ
ہندی بولتے آرسی آئے   منہ دیکھے جو اسے بتائے

ناخن کی پہیلی

بیسیوں کا سر کاٹ لیا   نا مارا نا خون کیا

لال کی پہیلی

اندھا ، گونگا ، بہرا بولے گونگا آپ کہائے
دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے
بانس کا مندر وا کا باشا ، باشے کا وہ کھا جا
سنگ ملے تو سر پر رکھیں واہ کو راؤ و راجا
سی سی کرکے نام بتایا ، تا میں بیٹھا ایک

الٹا، سیدھا ہر پھر دیکھو، وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال
عربی، ہندی، فارسی تینوں کرو خیال

باوجود علم و فضل اور اعلیٰ خیالات شاعرانہ کے جب یہ لوگ پستی کی طرف جھکتے تھے تو ایسے تہ کو پہنچتے تھے کہ زمین کی ریت تک نکل لاتے تھے۔ ان الفاظ و خیالات پر نظر کرو۔ کیسے نیچر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے فطری خیالات اور دلوں کے ارمانوں کو کیا اصلی طور سے ظاہر کرتے ہیں۔ مکرنیوں کا انھیں موجد کہنا چاہیے۔

مکرنی ۱ - سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت جیا
اے سکھی ساجن، نا سکھی دیا

مکرنی ۲ - سرب سلونا[1] سب گن نیکا[2]
وا بن[3] سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہووے کون
اے سکھی ساجن، نا سکھی نون

مکرنی ۳ - وہ آوے تب شادی ہوئے
اس میں دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے وا کے بول
اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

۱- نمکین ۲- اچھا - ۳- اس کے بغیر -

ایک کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں - امیر خسرو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی - کنوئیں پر جاکر ایک سے پانی مانگا - ان میں ایک انھیں پہچانتی تھی - اس نے اوروں سے کہا - دیکھو یہی خسرو ہے - انھوں نے پوچھا کیا تو خسرو ہے ؟ جس کے گیت سب گاتے ہیں اور پہیلیاں ، مکرنیاں اور انمل سنتے ہیں - انھوں نے کہا ہاں ! اس پر ایک ان میں سے بولی - مجھے کھیر کی بات کہہ دے ، دوسری نے چرخے کا نام لیا - تیسری نے ڈھول ، چوتھی نے کتے کا - انھوں نے کہا مارے پیاس کے دم نکلا جاتا ہے ، پہلے پانی تو پلا دو - وہ بولیں - جب تک ہماری بات نہ کہہ دے گا - نہ پلائیں گی - انھوں نے جھٹ کہا :

انمل : کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا
لا پانی پلا

اسی طرح کبھی کبھی ڈھکوسلا کہا کرتے تھے کہ وہ بھی انھیں کا ایجاد ہے -

ڈھکوسلا : بھادوں پکی پیپلی چو چو پڑی کپاس
بی مہترانی دال پکاؤ گی یا ننگا ہی سو رہوں

دو سخنے : گوشت کیوں نہ کھایا ؟ ڈوم کیوں نہ گایا
گلا نہ تھا

جوتا کیوں نہ پہنا ، سموسہ کیوں نہ کھایا
تلا نہ تھا

انار کیوں نہ چکھا ، وزیر کیوں نہ رکھا
دانا نہ تھا

سوالات اور مشقیں

۱ ۔ آب حیات ، جیسا کہ آپ کو بتایا گیا ہے نظم اردو کی تاریخ ہے ۔ یہ بڑی سی کتاب ہے اور اس میں شاعروں کے حالات ایسے انداز سے لکھے گئے ہیں کہ پڑھ کر بڑا لطف آتا ہے ۔ ہر شاعر کے حال کے ساتھ کچھ دلچسپ لطیفے بھی ہیں ۔ ان لطیفوں کو کسی نے ''آب حیات کے لطیفے'' کے نام سے کتابی شکل میں چھپوا دیا ہے ۔ آپ یہ کتاب ضرور پڑھیے ۔ ایک مرتبہ پڑھیں گے تو جی چاہے گا کہ بار بار پڑھیں ۔

۲ ۔ جیسی پہیلیاں آپ نے ابھی پڑھیں ایسی اور پہیلیاں تلاش کیجیے اور اپنے ساتھیوں کو سنائیے ۔

★

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ ''اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کردیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں ۔ تو جو لوگ آپ اپنے تئیں بد نصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت سمجھیں گے'' ۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ ''اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی مصیبت ہی کو غنیمت سمجھتا'' ۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی ۔ خواب

میں دیکھتا ہوں کہ سلطان افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ "تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر کر دیں"۔ چنانچہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا۔ تجویز ہوا۔ اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔

ایک شخص سوکھا سہما، دبلا پے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا۔ اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا۔ جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بری معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا۔ جس کا دامن، دامن قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جنات کی تصویریں زردوزی کڑھی ہوئی تھیں اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب و غریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا تھا۔ اور لدواتا تھا۔ اور مقام مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتے دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا

تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا ۔ اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا ، صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں ۔ ایک شخص پرانے سے چکن کے چغے میں ایک بھاری سی گٹھڑی لیے آتا ہے ۔ جب وہ گٹھڑی انبار میں پھینکی ۔ تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا ۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا ۔ بدن سے پسینہ بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپا جاتا تھا ۔ اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی ۔ اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے ۔

بہت سی بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں ۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت ، کچھ موٹے موٹے ہونٹ ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے ۔ کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی ۔ مگر مجھے یہ حیرت تھی ۔ کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے ۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے ۔ مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے ۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا ۔ کہ ایک کبڑا ہے اور آدم زاد کے انبار رنج و الم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں ۔

اس انبار میں انواع و اقسام کے سقم اور امراض بھی تھے ۔ جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہمیوں نے خواہ مخواہ انھیں مرض سمجھ لیا تھا ۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا ۔ جو امراض ، آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں ان سب کا مجموعہ

تھا - یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراض نوجوانی ہاتھوں میں لیے آتے تھے - مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا - اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بداطواری پڑی ہوئی دکھائی نہ دی - میں یہ تماشا دیکھتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضعف جسمانی اور عیوب عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع ہاتھ نہ آئے گا - کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے -

اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پروا چلا آتا ہے - اس نے بھی ایک گٹھڑی پھینک دی- مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی پھینک گیا ہے - ساتھ ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے ہیں - میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم اور حیا کو پھینک گئے -

جب تمام ہی آدم اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے - مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خیالی ہے - چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے - ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے - مگر انھوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا - مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا - برخلاف اس کے بدن اور قد و قامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بے زار ہو گیا - اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اتار کر پھینک دیا - اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا - کہ ایک شخص نے چہرے

کو برا اور اپنے بدن کو ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرے کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہ پر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولائی کی ایک ایک بات کو تاک کر دیکھ رہے تھے۔ جو سلطان افلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے۔ جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کر لیں۔ اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔

یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے۔ اور بڑی ترت پھرت کے ساتھ اس انبار عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا۔ درد قولنج سے جان بہ لب تھا اور لا ولدی کے سبب اپنے مال و املاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے درد مذکور کو پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لے لیا مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا۔ کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا چنانچہ بڈھے نے کہا کہ اب برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھر دیجیے اور اپنا لڑکا لے لیجیے۔ کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجے بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ

مبادلہ پھر نہ ہو سکتا تھا۔

ایک بے چارہ جہازی غلام تھا۔ کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکالیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا۔ اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا اور سر پکڑے منہ بسور رہا ہے۔

غرض اس طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے۔ اور اپنے اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لیا تھا۔ وہ اس سے ناراض تھا، کسی کو بھوک نہ لگتی تھی۔ وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ، پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اسے چھوڑا تھا۔ اب وہ دردِ جگر مارا لوٹ رہا تھا۔ اور اسی طرح برعکس، غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی۔

سوالات اور مشقیں

۱ مصائب، تکالیف، انواع، اقسام، امراض، عیوب، آفات، املاک۔ یہ سب الفاظ جمع ہیں۔ ان کے واحد بتائیے۔

۲ ڈھیلی ڈھالی اور گورا چٹا۔ ان دونوں ترکیبوں کو غور سے دیکھیے۔ ان دونوں ترکیبوں میں اصل لفظ "ڈھیلی" اور "گورا" ہے۔ ڈھالی اور چٹا فالتو ہیں۔ لیکن ہماری زبان میں اس طرح کے بے شمار لفظ ہیں، جن میں لفظ کا دوسرا ٹکڑا محض زور دینے کے لیے لگا دیا گیا ہے۔ اس دوسرے ٹکڑے کو "تابع" کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں، پیچھے آنے والا۔ "تابع" دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کے کچھ معنی نہ ہوں جیسے ڈھیلی کے ساتھ ڈھالی، دوسرا وہ جس کے معنی ہوں، جیسے گورا کے ساتھ چٹا۔ پہلی طرح کے موضوع کو "تابع

مہمل" کہتے ہیں (مہمل کے معنی بے معنی) آپ نے ابھی جو سبق پڑھا اس میں جتنے تابع مہمل اور تابع موضوع آئے ہوں انھیں جمع کیجیے۔

۳ مختصر طور پر بتائیے کہ آپ نے اس سبق سے کیا نصیحت حاصل کی ؟

ذکاءاللہ

ذکاء اللہ (۱۸۳۲-۱۹۱۰ء) کے والد مولوی ثناء اللہ دہلی کے رہنے والے تھے - ذکاء اللہ دہلی ہی میں پیدا ہوئے - ۱۲ سال کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے - محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد بھی یہاں پڑھتے تھے ، اس لیے تینوں میں گہرے تعلقات تھے - ذکاء اللہ کو حساب سے بہت دلچسپی تھی - یوں بھی وہ پڑھنے لکھنے میں بہت ہوشیار تھے - اکثر اول نمبر پر کامیاب ہوتے اور وظیفے حاصل کرتے - بعض تمغے بھی انعام میں ملے -

تعلیم سے فارغ ہو کر دہلی کالج میں ریاضی کے اُستاد مقرر ہوئے - اس کے بعد کوئی سات سال تک آگرہ کالج میں فارسی اور اردو کے استاد رہے - ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے اور گیارہ سال تک اس عہدے پر فائز رہے - بالآخر میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پروفیسر مقرر ہوئے اور ۱۵ سال ملازمت کرکے ۱۸۸۵ء میں پنشن حاصل کی - عمر کے باقی ۲۴ سال تصنیف و تالیف کے کام میں گزارے اور ۱۹۱۰ء میں دہلی میں انتقال کیا -

ذکاء اللہ نے اپنی تصانیف کے ذریعے علم و فن کی بہت خدمت کی - ریاضی ، طبیعیات و ہیئت ، تاریخ ، جغرافیہ اور ادب و اخلاق کی ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں لکھیں - علمی خدمات کے صلے میں سرکار سے نقد انعام بھی ملے اور شمس العلماء اور خان بہادر کے خطاب بھی عطا ہوئے -

مولوی ذکاء اللہ کی تحریروں میں نذیر احمد ، آزاد اور شبلی کی سی شگفتگی نہیں ، البتہ صفائی اور روانی بہت ہے -

جو مضمون بھی لکھتے ہیں اسے بڑی وضاحت اور سنجیدگی سے لکھتے ہیں - اس لحاظ سے ان کی تحریروں میں معلومات تو بہت ہوتی ہیں لیکن طرز بیان کی دلکشی صرف کہیں کہیں ملتی ہے -

آگے چل کر آپ جو دو مضمو ن پڑھیں گے ان سے آپ کی معلومات میں بھی اضافہ ہو گا اور آپ کچھ اچھے سبق بھی حاصل کریں گے -

★

انسان اشرف المخلوقات

خدا تعالیٰ نے اپنی صنعت اور حکمت کی عجب شان انسان میں دکھائی ہے - ساری مخلوق میں اسی کو سب جانداروں میں برتر اور بہتر بنایا ہے - کسی حیوان کو اس کی سی خوبصورت شکل اور نیک عقل عطا نہیں فرمائی - گو اس کو نہ شیر کا زور دیا ہے - نہ ہاتھی کا سا ڈیل ڈول عطا کیا ہے نہ عقاب کی سی تیز نگاہ بخشی ہے نہ کتے کی سی سونگھنے کی قوت دی ہے - مگر اس کی ذات میں ان صفات سے کہیں زیادہ خوبیاں جمع کی ہیں -

انسان کا سیدھا قد بتا رہا ہے کہ وہ حکم دینے کے لیے کھڑا ہے - اور جانوروں کا خمیدہ قامت کہے دیتا ہے کہ وہ اس کی غلامی میں جھکے ہوئے ہیں- اس کے چہرے کا اوپر کی طرف دیکھنا اس کی بلند نگاہی اور عالی ہمتی کی دلیل ہے - اس کی رفتار کا خاموش انداز ایک متانت کے ساتھ ہونا اس کے بلند مرتبے کی

گواہی دیتا ہے ۔ اس کے چہرے میں عقل اور روح اپنی چمک دمک دکھا رہی ہے ۔ انسان کو اور چوپایوں میں فضیلت جسمانی ہاتھوں کے سبب حاصل ہوئی ہے ۔ اس کے یہ ہاتھ اور چوپایوں کی طرح جسم کے سہارنے اور اٹھانے کے کام نہیں آتے ۔ وہ تو اپنے دو پاؤں کے بل پر کھڑا رہتا ہے ۔ خدا نے اس کو یہ ہاتھ فقط اس کام کے لیے دیے ہیں ۔ کہ اس کے دل کے ارادوں اور خواہشوں کے کہنے میں چلا کریں ۔ انسان کے سارے ضروری کام یہی ہاتھ کرتے ہیں ۔ روٹی کپڑا پیدا کرنا ، گھر بار بنانا انھیں کے اختیار میں ہے ۔

قوت لامسہ اس کے ہاتھوں میں بھری ہوئی ہے ۔ یہ قوت حواسوں کی قوتوں پر غالب ہے ۔ آنکھیں ، کان ، نتھنے کھلے ہوئے دروازے ہیں ۔ جن میں روشنی ، آواز اور بو داخل ہوتی ہے ۔ خواہ اچھی ہو یا بری ۔ مجبوراً ان کو دیکھنا ، سننا اور سونگھنا پڑتا ہے ۔ آنکھوں کا یہ مقدور نہیں کہ وہ ناگوار روشنی کو نکال دیں ۔ کانوں سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ مکروہ آوازوں کو اپنے پاس نہ آنے دیں ۔ نتھنوں سے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ سڑی بد بو کو اپنے سے پرے ہٹا دیں ۔ یہ خوبی ہاتھوں ہی کی ہے کہ جو چیز ان کو اچھی لگے اس کو چھوئیں جو بری لگے اسے دھکیل دیں ۔

ہاتھوں کی یہ قوت فقط اپنا ہی کام نہیں کرتی ۔ بلکہ اگر کوئی اور حواس انسان کا جاتا رہے تو اس کا کام کرنے کو موجود ہوتی ہے ۔ اندھوں کو دیکھو کہ ان کی آنکھیں یہی ہاتھ ہوتے ہیں ۔ یہی ہاتھ لکڑی پکڑ کر ان کو ٹیڑھے ٹیڑھے رستوں میں چلاتے

ہیں - انھیں سے ٹٹول کر وہ اپنے عزیزوں کے چہروں کو دیکھتے ہیں - یہی ہاتھ ان کی کتابوں کے پڑھنے کے لیے آنکھیں بن جاتے ہیں - اور وہ پڑھنے سے گھنٹوں دل بہلاتے ہیں -

گونگے بہروں کی زبان کچھ بول نہیں سکتی اور کان سن نہیں سکتے - ان کے لیے بھی یہی ہاتھ زبان اور کان بن جاتے ہیں - تم نے دیکھا ہو گا - کہ وہ خود ہاتھوں کے اشاروں سے باتیں کرتے ہیں اور لوگوں کے اشاروں سے ان کی باتیں سمجھتے ہیں - دوسرے حواس کتنے ہی کامل اور قوی ہوں مگر یہ ہاتھ ان کی تائید اور تقویت کرتے ہیں - انھوں نے آنکھ کی دو مختلف طرح کی نقلیں اتار کر دوربین اور خردبین بنائی - جنھوں نے آنکھوں کو آسمان پر اور زمین پر ایک اور عالم دکھا دیا - دور کی چیزیں جو فاصلہ دراز کے سبب سے اور پاس کی چیزیں جو چھوٹی ہونے کی وجہ سے نظر نہ آتی تھیں وہ اب دکھائی دینے لگیں - آنکھوں کے لیے یہ سامان تیار کیا - اب کانوں کے لیے ساز اور آلات بنائے - جن سے وہ تعلیم پاتے ہیں اور اپنی قوت بڑھا کر حظ اٹھاتے ہیں - ناک کے لیے وہ کیسے کیسے خوشبودار پھول توڑتے ہیں اور عطر اور تیل نکالتے ہیں کہ جن سے آدمی کی روح خوش ہوتی ہے -

خلاصہ یہ ہے کہ ہاتھوں کی قوت لامسہ اپنے بھائی بہنوں کی خوب خدمت اور ٹہل کرتی ہے اور ان کی مشکلوں کو آسان بناتی ہے- یہی ہاتھ ہیں جو میدان جنگ میں تلوار چلا کر آدمی کی دلیری دکھاتے ہیں - یہی ہاتھ ہیں جو محفل میں ساز بجا کر دل خوش کرتے ہیں - یہی ہاتھ ہیں جو گھوڑے کی لگام پکڑ کر آدمی کے پر لگا دیتے ہیں - اور ہرن سے زیادہ اڑنے لگتے ہیں - یہی ہاتھ

ہیں جو ہل چلا کر زمین کو سرسبز بناتے ہیں اور جانوروں کا پیٹ پالتے ہیں - یہی ہاتھ ہیں ، جو پنسل سے نقشے اتارتے ہیں، قلم کی زبان سے مطلب ادا کرتے ہیں - کونسا کام ہے جو ہاتھ نہیں کرتے -

دخانی کل کیا ہے ؟ ایک بڑا ہاتھ ہے - جو کروڑوں ہاتھوں کا کام انہیں ہاتھوں کے بل پر کرتی ہے تار برق کیا ہے ؟ ایک بہت بڑا قلم ہے - جو سارے عالم میں دور سے بیٹھا ہوا انہیں ہاتھوں سے لکھ رہا ہے -

ریل ، جہاز اور بڑے بڑے مصنوعات انسانی کو یوں سمجھو کہ قوسوں نے اپنے تئیں ایک آدمی بنا کر اپنے زبردست ہاتھوں سے انہیں بنایا ہے - سارے کام جن سے انسان کو ذلت حاصل ہوتی ہے وہ ان ہاتھوں کے اختیار میں ہیں - سب سے مشکل کام بشر کے لیے یہی ہے کہ وہ ایسے کام کا انتخاب کرکے ہاتھ لگائے کہ جس سے منفعت زیادہ اور مضرت کم ہو - اور دو جہانوں میں بھلا بھی ہو -

ان ہاتھوں کے بعد ہماری آنکھیں ہیں جو ہمارے دکھ سکھ کا آئینہ ہیں - انہیں کی بدولت ہمارے دل میں کیفیات پیدا ہوتی ہیں اور وہی ان کو خود دکھاتی ہیں - غضب ، محبت ، حقارت ، شوخی ، حیا ان سب کو ہماری آنکھوں کی نگاہیں اور چتونیں بتلاتی ہیں -

آنکھیں دکھانا ، آنکھیں لگانا ، آنکھ اٹھانا ، آنکھیں نیچی کرنا ، اونچی نہ اٹھانا ، آنکھ چرانا ، چشم نمائی اور چشم پوشی کرنا کیا ہیں ؟ ہمارے دل کی حالتوں اور کیفیتوں کا آئینہ -

ہونٹوں سے مسکرانا ، پیشانی میں تیوری کا بل ڈالنا ، آواز سے واویلا مچانا کیا ہیں ؟ انہیں دیدوں کے کام ہے - اور جانوروں

کی آنکھیں بھی اپنی اپنی جدا منفعت رکھتی ہیں ۔ مگر انسان کی آنکھوں کی خوبیوں کو نہیں پہنچتیں ۔ گو ہم ایک صنف میں اپنی آنکھوں کو اور جانوروں سے تشبیہہ دیتے ہیں ۔ کسی کو آہو چشم ، کسی کو گربہ چشم ، کسی کو گاؤ دیدہ ، کسی کو شیر چشم کہتے ہیں ۔ شاعروں نے تو ان آنکھوں کے اثر ہی جدا گھڑے ہیں کبھی وہ اس ساغر سے دیکھنے والوں کو مست کر دیتے ہیں ۔ کبھی چشم بد دور آنکھیں موتی چور کہتے ہیں ۔ ہمارے گھروں میں جاہلوں کو اور ہی وہم میں ان آنکھوں نے پھنسا رکھا ہے ۔ انھوں نے آنکھوں کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ اپنی نظر سے جس کا چاہیں ، برا کریں ۔ سینکڑوں ٹوٹکے اور علاج، تعویذ اور دعائیں ان سے بچنے کے لیے موجود ہیں ۔

اب اپنی آنکھ کو دیکھو کہ وہ ایک مدور رقبہ دو جڑی ہوئی کمانوں میں رکھا ہے ۔ اس کے اندر ایک حلقہ ہے ۔ اور اس میں ایک کھڑکی ہے ۔ کھڑکی کے سامنے ایک جھالر دار پردہ پڑا ہوا ہے ۔ وہ کبھی اس پر پڑ جاتا ہے کبھی اٹھ جاتا ہے ۔ گرد و غبار سے بچاتا ہے ۔ میلا کچیلا نہیں ہونے دیتا ۔

ان کے سوا جن چیزوں نے انسان کو فرمانروا اور سب جاندار اور بے جان اشیا کو اس کا خدمت گزار اور فرمانبردار بنایا ہے ۔ وہ دو قوتیں عقل اور نطق ہیں ۔ حیوانوں میں بھی عقل ہوتی ہے ۔ جس کو ہم عقل حیوانی کہتے ہیں ۔ مگر عقل انسانی اور عقل حیوانی میں رات دن کا فرق ہے ۔ حیوانوں کی عقل میں افزائش کی قابلیت نہیں ۔ مکھیوں نے جس دانائی سے اپنی پہلی نسل کو خوبصورت چھتا بنا دیا تھا ۔ ویسا ہی ہمیشہ وہ بناتی چلی آتی ہیں ۔ اس میں بال برابر فرق آنے کا احتمال نہیں ۔

خلاصہ یہ ہے کہ حیوانات میں عقل حیوانی ایک ہی نسل میں اپنے درجۂ اعلیٰ کو پہنچ کر آگے نہیں بڑھتی - برخلاف عقل انسانی کے کہ وہ پیڑھی در پیڑھی ترقی کی سیڑھی پر چڑھتی چلی جاتی ہے اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے وہ منصوبے باندھتی ہے اور اسباب مہیا کرتی ہے -

دوسری قوت ناطقہ ہے - گو سب جانور بولتے ہیں - گھوڑا ہنہناتا ہے ، اونٹ براتا ہے - گدھا ڈھیچوں کرتا ہے - کتا بھوں بھوں ، بلی میاؤں میاؤں ، مرغ ککڑوں کوں ، مگر یہ سب آوازیں ہیں - نطق وہی ہے جو انسان میں ہے - اس قوت کے طفیل پہلوں کے تجربے اور خیالات پچھلوں تک پہنچتے ہیں - جانور اس نعمت سے محروم ہیں - ان میں یہ قابلیت نہیں کہ وہ اپنے خیالات اپنی اولاد کو پہنچائیں - وہ انسانوں کی طرح آپس میں باتیں نہیں کر سکتے - اپنے خیالات دوسروں کو نہیں بتلا سکتے - اس نطق ہی کے سبب سے لکھنے کا ہنر پیدا ہوا - جس نے زبان کو کانوں سے لے کر آنکھوں کو دکھایا - اور اس کو پتھر کی لکیر بنایا - اس لکھنے کے سبب سے ہم ان لوگوں سے باتیں ، زبان قلم سے کرسکتے ہیں - جو ہم سے دور بیٹھے ہیں - ان عاقلوں کی نصیحتیں اور قول سنتے ہیں - جن کی وفات کو ایک زمانہ گزر چکا ہے - پس یہ نطق اور عقل ہی ایسی صفات ہیں جنھوں نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے -

سوالات اور مشقیں

١ انسان کو کن چیزوں نے اشرف المخلوقات بنایا ہے ؟

٢ چھونے کی قوت لامسہ ہے ، سننے ، دیکھنے ، سونگھنے اور محسوس کرنے کی قوت کے لیے اسی وزن کے لفظ بتائیے -

٣ دکھ سکھ ، ڈیل ڈول - چمک دمک ، میلا کچیلا ، کو جملوں میں استعمال کیجیے -

علم اور فضیلت علم

علم کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کوئی چیز ہے۔ اس کو اسی طرح جانے۔ علم مال سے بہتر ہے۔ علم تیری حفاظت کرتا ہے اور تو مال کی۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم، مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے۔ علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ کوئی چیز علم سے بڑھ کر عزت والی نہیں کہ بادشاہ لوگوں پر حاکم ہوئے اور علما بادشاہوں پر حاکم ہوتے ہیں۔ علم کے ماتحت مال اور حکومت ہیں۔ جس خاصے سے کہ انسان کی تمیز چوپایوں سے ہوتی ہے، وہ علم ہے۔ انسان جب ہی انسان کہلائے گا کہ جس بات سے اس کو شرف ہو، وہ اس میں موجود ہو۔ انسان کی شرافت نہ تو جسم کے زور کے باعث ہے، اس لیے کہ زور میں اس سے اونٹ زیادہ ہے۔ نہ بڑا جثہ ہونے کی جہت سے ہے کہ ہاتھی اس سے بڑا ہے۔ نہ شجاعت کے سبب سے کہ درندے اس سے بھی زیادہ شجاع ہیں۔ نہ کھانے کی وجہ سے کہ بیل کا پیٹ اس سے کہیں بڑا ہے۔ غرض انسان کو جو شرافت ہے وہ فقط علم کے سبب سے ہے۔ علم کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔ جس کو علم نہ ملا۔ اس کو اور کیا ملا۔ اور جس کو علم ملا۔ اس سے اور کیا باقی رہا۔ دل کی غذا علم اور حکمت ہے۔ انہی دونوں سے اس کی زندگی ہے جس طرح بدن کی غذا کھانا ہے۔ جس سے وہ جیتا ہے۔ جس شخص کو علم میسر نہیں۔ اس کا دل بیمار ہے اور موت اس پر سوار ہے۔ مگر اس شخص کو اپنے دل کی بیماری اور موت کی

خبر نہیں ہوتی - اس لیے کہ دنیا کی محبت اور اس کے کاروبار میں لگے رہنے سے اس کی حس باقی نہیں رہتی - جیسے کہ خوف اور نشے کے غلبے میں زخم کا درد اس وقت نہیں معلوم ہوتا - اگرچہ واقع میں درد ہوتا ہے -

بعض حکما سے کسی نے سوال کیا کہ کونسی چیز ذخیرہ کی جائے؟ تو جواب دیا کہ "وہ چیز ذخیرہ کرنی چاہیے کہ جب تیری کشتی ڈوب جائے - تو وہ تیرے ساتھ تیرنے لگے" - یعنی علم ذخیرہ کرنے کے قابل ہے کہ جب کشتیٔ بدن غرقاب موت ہو تو بھی ساتھ رہے -

بعض حکما کا قول ہے کہ "جو شخص حکمت کو اپنی لگام بناتا ہے - لوگ اس کو امام بناتے ہیں" - جو شخص حکمت میں معروف ہوتا ہے لوگ اس کی عزت اور وقار کرتے ہیں - اگر آدمی مفلس بھی ہو جائے - مگر علم پاس ہو تو وہ بڑی دولت ہے - دل نور حکمت سے ایسا زندہ ہوتا ہے جیسے کہ زمین مینہ سے سرسبز ہوتی ہے - علما ہدایتوں کے چراغ ہوتے ہیں - ہر ایک اپنے وقت میں شمع ہوتا ہے- کہ اس سے اس کے عہد کے لوگ روشنی حاصل کرتے ہیں - انہی کے علم کی بدولت انسان حالت بہیمی سے نکل کر انسانیت کی سرحد پر پہنچتا ہے - یہی علم ہے کہ صبح سے لے کر شام تک ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا - تنہائی میں انیس ، سفر میں جلیس' خلوت میں گفتگو کرنے والا اور ذہن کا رہنما ، حالت تونگری میں اور افلاس میں چراغ اور دوستوں کے سامنے نائب اور اجنبی شخص کو اقرب بنانے والا ، دشمنوں کے حق میں ہتھیار اور راہ جنت کا مینار - اسی کے باعث خدا تعالےٰ کی اطاعت اور توحید اور عبادت و تحمید ہوتی ہے -

علم امام ہے ، عمل اس کا تابع ہے ، علم مہلک عادتوں ، بری خصلتوں سے بچاتا ہے ۔ عمدہ اخلاق اور سعادت کی طرف راہ بتاتا ہے ۔ اور عقل کو جلا دے کر پاک کرتا ہے ۔ علم کی ترقی ، امیروں کی قدرشناسی پر موقوف ہے ۔ جس علم کی وہ عزت کرتے ہیں ، عزیز ہوتا ہے ۔ جس کی وہ ذلت کرتے ہیں وہ ذلیل ہوتا ہے ۔

علم کی فضیلت کے معنی سے پہلے فضیلت کے معنی سمجھنے چاہییں ۔ فضیلت کا مادہ فضل ہے ۔ جس کے معنی زیادتی کے ہیں ۔ جب دو چیزیں کسی بات میں شریک ہوں اور ایک میں کوئی بات زیادہ ہو ۔ تو اس کو کہیں گے کہ یہ دوسری سے افضل ہے ۔ لیکن زیادتی ایسی چیز میں ہونی چاہیے جو اس کا کمال ہو ۔ اب علم کو بالذات فضیلت ہے ۔ کچھ اضافی فضیلت نہیں ہے ۔ نفیس چیز کی رغبت جو ہوتی ہے ۔ اس کی تین قسمیں ہیں ۔ ایک وہ کہ غیر کے لیے مطلوب ہو ۔ اور ایک وہ جو بالذات مطلوب ہو ۔ اور ایک وہ کہ بالذات اور غیر کے لیے مطلوب ہو ۔ ان تینوں قسموں میں سے جو بالذات مطلوب ہوتی ہے ۔ وہ اول کی بہ نسبت اشرف اور افضل ہے اور اول قسم کی جو چیزیں غیر کے لیے مطلوب ہوتی ہیں وہ روپیہ اشرفی ہیں کہ ان سے خود کسی طرح کا فائدہ نہیں ۔ آدمیوں کی حاجتیں ان سے روا نہ ہوں تو ان کا حال کنکروں کا سا ہو ۔ جو چیز بالذات بھی اور غیر کے لیے بھی مطلوب ہوتی ہے ۔ اس کی مثال بدن کی سلامتی ہے ۔ مثلاً پاؤں کی سلامتی اس جہت سے بھی مطلوب ہے کہ بدن درد سے سلامت رہے اور اس لیے بھی مطلوب ہے کہ اس سے چل کر اپنے مطالب اور مقاصد پورے کریں ۔

اب علم میں یہ تینوں اوصاف موجود ہیں ۔ وہ خود بالذات بھی لذیذ ہے اور اس سے بالطبع انسان کو بے غرض مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ اور وسیلۂ معاش و معاد ہے ۔ جس سے آخرت میں نجات اور دنیا میں عزت و وقار اور سلاطین پر حکم کرنا حاصل ہوتا ہے ۔ عالم کی قدر و منزلت طبیعتوں میں ضرور ہوتی ہے ۔ جیسے علوم مختلف ہیں ان کے فضائل میں بھی تفاوت ہے ۔ غرض علم کے افضل ہونے میں کچھ شبہ نہیں ۔ اس لیے اس کا سیکھنا افضل بات کا حاصل کرنا ہے ۔ اور سکھانا افضل امر کی تعلیم ہے ۔

انسان کے تمام مقاصد دین یا دنیا سے متعلق ہوتے ہیں اور دین کا انتظام بدوں دنیا کے انتظام کے نہیں ہو سکتا کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۔ پس جو علوم دنیا کے کام کے ہیں ، ان کا سیکھنا مقدم ہے اور ایسا ہی ضرور ہے جیسا دین کے علوم کا ۔ کیونکہ جب تک معاش درست نہ ہو ۔ معاد درست نہیں ہو سکتی ۔

جاہ و مال کی زینت ایسی ہے جیسے کہ آئینے کا رنگ مستعار ۔ علم و کمال کی شرافت ایسی ہے جیسے کہ عارض پر زلف و خال ۔ علم و کمال وہ حسن خداداد ہے کہ رنجوری و پیری سے باطل نہیں ہوتا ۔ نوشتہ دانش وہ نہیں ہے کہ مرگ سے صفحہ روزگار سے زائل ہو جائے ۔ اہل علم گو خود چلے جاتے ہیں مگر ان کے نقوش و آثار باقی رہتے ہیں ۔

حضرت علی مرتضیٰ کے کلام سے منقول ہے کہ علم کو ایسے شخص سے تمثیل دی ہے کہ جس کا سر تواضع ہو ۔ آنکھیں اس کی حسد سے بری ہوں ۔ گوش اس کے فہم

ہوں ۔ زبان اس کی راست گوئی ، حافظہ اس کا تفحص و تجسس اور دل اس کا نیک نیتی ، عقل اس کی معرفت اشیا ، ہاتھ اس کے رحمت ، (ضعیفوں اور درویشوں پر عطا سے دستگیری کرتے ہوں) پاؤں اس کے زیارت علما ہوں ۔ ہمت و قصد اس کا سلامت ہو ۔

سوالات اور مشقیں

۱- مندرجہ ذیل جملوں کے معنی سمجھا کر لکھیے :

(الف) علم ذخیرہ کرنے کے قابل ہے کہ جب کشتیٔ بدن غرقاب موت ہو تو بھی ساتھ رہے ۔

(ب) جو شخص حکمت کو اپنی لگام بناتا ہے لوگ اس کو امام بناتے ہیں ۔

(ج) علما ہدایتوں کے چراغ ہوتے ہیں ۔

(د) علم امام ہے عمل اس کا تابع ہے ۔

(ہ) علم کو بالذات فضیلت ہے ۔

خواجہ الطاف حسین حالی

حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۵ء) پانی پت میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں کلام پاک کے حافظ اور قاری ہو گئے۔ پھر عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں ان کی شادی ہو گئی، لیکن اس سے ان کے حصول علم کے شوق میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوئی۔ وہ پہلے دہلی گئے اور وہاں کے عالموں سے تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں مرزا غالب سے بھی ملتے رہے۔ ان ملاقاتوں میں انھوں نے غالب کے فارسی قصیدوں اور غزلوں کے معنی بھی ان سے سمجھے۔ ۱۸۵۵ء میں پانی پت واپس آئے، لیکن پڑھنے لکھنے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

۱۸۵۶ء میں حصار جا کر ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم ہو گئے، لیکن مئی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں وطن واپس آ گئے اور چار سال تک یہیں رہ کر اساتذہ سے منطق، فلسفہ اور حدیث کے سبق لیے۔ ۱۸۶۱ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق ہو کر جہانگیر آباد چلے گئے۔ ۱۸۶۹ء تک شیفتہ کے ساتھ رہے۔ یہاں سے لاہور گئے۔ اور وہاں چار سال قیام کیا۔ ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ بک ڈپو، لاہور میں نائب مہتمم مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۴ء میں جب "نیچرل شاعری" کی تحریک شروع ہوئی تو اسی سال انھوں نے اپنی مشہور نظمیں "برکھا رت" اور نشاط امید" لکھیں۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۹ء تک دہلی اور لاہور میں مختلف ملازمتیں کیں۔ ۱۸۸۹ء میں حیدر آباد سے وظیفہ مقرر ہو گیا تو مستقل طور پر پانی پت میں رہنے

لگے اور کوئی ۲۵ سال تک یہاں رہ کر علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے - اردو نثر اور نظم دونوں میں حالی کی حیثیت ایک مجتہد کی سی ہے - وہ اردو میں سوانح نگاری کے بھی بانی ہیں اور جدید تنقید کے بھی - سوانح عمریوں میں حیات سعدی ؛ یاد گار غالب اور حیات جاوید ان کے عظیم کارنامے ہیں - یادگار غالب، اردو کے عظیم شاعر اور نثّار غالب کی سوانح عمری اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے - حیات جاوید ، سرسید کی ضخیم سوانح عمری ہے - ان دونوں کتابوں نے غالب اور سرسید کی شخصیت اور کار ناموں کا تعارف اتنی اچھی طرح کرایا کہ آج بھی ہم ان دونوں کتابوں کو اس موضوع پر بہترین کتابیں سمجھتے ہیں - آئندہ صفحات میں جو دو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں ، ان میں سے ایک حیات جاوید سے ہے اور دوسرا یاد گار غالب سے -

حالی کی تصانیف نثر میں مقدمہ شعر و شاعری اور مجالس النسا' بھی بہت مشہور ہیں -

حالی ہر خیال کو آسان ، سیدھی سادی ، سلیس زبان میں ادا کرتے ہیں - ان کے نزدیک اصل اہمیت اس بات کی ہوتی ہے جو وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں اس لیے ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بات اس طرح کہی جائے کہ وہ آسانی سے پڑھنے والوں کی سمجھ میں آ جائے اور یہ مقصد اسی زبان کے ذریعے پورا ہو سکتا ہے جو ہماری بول چال کی زبان سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو -

اردو شاعری میں حالی کا جو مقام ہے اس کا ذکر آپ حصہ نظم میں پڑھیں گے -

سرسید کی راستبازی

اوّلاً راستبازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک راستباز آدمی میں ہونے ضروری ہیں۔ جیسے صدق، مؤدت، حمیّت، دلیری اور آزادی وغیرہ، سرسید کی خصوصیات میں سے تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "اگر سچائی کسی مجسم شکل میں ظاہر ہوتی تو ضرور شیر کی شکل میں ظاہر ہوتی۔" اس قول کی تصدیق جیسی سرسید کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ شاید ہی کسی دوسری صورت سے ہوتی ہو۔ اس نے محض اپنی راستبازی کی بدولت ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا۔ مگر جس بات کو سچ جانا اس کے کہنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ جس بات پر دل سے یقین کر لیا اسی کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا۔ جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی، اس کے کہنے اور کرنے میں کسی کی مخالفت کی کچھ پروا نہیں کی۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر جہاں تک ان کی طبیعت اور جبلت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنی کانشنس[1] کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔

جب کوئی بات کسی اپنے دوست سے سچائی کے خلاف سرزد ہوتی دیکھتے تھے۔ تو ان کو نہایت رنج ہوتا تھا۔ اور اکثر وہ اس کو متنبّہ کیے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ان کا ایک دوست جو اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے اخبار میں چند خط ایک عورت کے نام سے چھپے تھے۔ جب وہ پرچہ

۱۔ انگریزی لفظ، جس کا ترجمہ ہے ضمیر۔

سرسید کی نظر سے گزرا۔ تو انھوں نے اس کو لکھا۔ کہ "کیا آپ کو یقین دلی ہے کہ وہ خط درحقیقت کسی عورت کے لکھے ہوئے ہیں؟ اگر ایسا یقین نہیں ہے۔ تو کیا یہ کانشنس کے برخلاف نہیں ہے کہ جس بات کو تم صحیح نہ سمجھتے ہو۔ اس کو بطور سچ کے ظاہر کرو۔ میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو۔ کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو۔ آپ کا دل اس کو سچ مانتا ہے۔ یا نہیں۔ اگر نہیں جانتا اور اس کو سچ کے طور پر بیان کیا۔ تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمانداری کے کام کیا۔ آپ مجھ کو معاف کیجیے گا۔ یہ سبب اس کے کہ آپ سے محبت ہے یہ کڑوی نصیحت کی ہے۔"

جب ان کے ایڈیٹر دوست نے اس نصیحت کا شکریہ لکھا۔ تو جواب انھوں نے اس طرح لکھا:۔

"میں اس خیال سے کہ آپ میری کسی تحریر کا برا نہ مانیں گے، جو میرے دل میں آتا ہے لکھ بھیجتا ہوں، خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش یہ ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلیٰ درجے پر ہوں اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا جانیں اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے۔ ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے۔ ایسی ہی پرائیویٹ خطوط سے اور ایسی ہی اخبار سے۔"

ان کے ایک نہایت عزیز اور خالص دوست کو ایک زمانے میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا۔ جو نماز پڑھتے تعرض

کرتا تھا - اور اس امر کی اطلاع انھوں نے سرسید کو بھی کی تھی - ان کو اسی باب میں سرسید صاحب لکھتے ہیں :-

"بھائی ! کل میں سارا دن متردد رہا . کیونکہ تمھارا کوئی خط نہیں آیا تھا - آج خط آیا اور حال معلوم ہوا - گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا - دو دو اکٹھی ملا کر بھی پڑھ لیتا ہوں ، ریل میں جتنا سفر ہو ، مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی - یہ سب باتیں مجھ میں ہیں - اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے - مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا - نہایت لچر پنا کیا - نماز جو خدا کا فرض ہے - اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے ، جس خرابی سے ہو ، ادا کریں یا قضا کریں - لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو تو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا ، یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی - میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے - اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا ، میری سمجھ میں کفر ہے - جو کبھی بخشا نہ جائے گا - تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا - جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی - اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا - تو پھر لچلچانا اور گڑگڑانا ، اور حضور رخصت ہی دیں - تنخواہ کاٹ لیں - کہنا واہیات تھا - استعفٰی دے دینا تھا - صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان ، قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی - کیا ہوتا ؟

نوکری نہ میسر ہوتی - فاقے مر جاتے - نہایت اچھا ہوتا - والسلام -"

سرسید نے اگر سچ پوچھیے تو اپنی آزادانہ تحریروں سے اردو لٹریچر میں سچائی اور آزادی کی بنیاد ڈال دی - اس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ سچ بات کے کہنے میں کسی طعن و ملامت سے نہ ڈریں - تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے پہلے جو لوگ عام رائے کے خلاف کوئی بات کسی اخبار میں لکھنی چاہتے تھے - اس میں کبھی اپنا نام ظاہر نہ کرتے تھے - اس تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے کی یہ شرط قرار دی - کہ جو لوگ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا اور اپنا نام پبلک پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے - ان کا کوئی مضمون اس میں درج نہ ہوگا - چنانچہ رفتہ رفتہ لوگوں کی جھجک نکلنی شروع ہوئی - یہاں تک کہ ہر شخص اپنے نام سے کھلم کھلا اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا اور بڑے بڑے لائق، ذی علم اور دیندار لوگ صدہا مضمون عام رائے کے خلاف شائع کرنے لگے -

بعضے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرسید نے جو قرآن کی تفسیر لکھی اس میں اکثر آیات کے معنی جمہور کے خلاف بیان کیے ہیں - اس پر ان کو خود یقین نہیں ہے - بلکہ صرف یہ مقصود ہے کہ قرآن پر سائنس کی رو سے اعتراض وارد نہ ہو - یہ حال سرسید کو بھی معلوم ہوا انھوں نے نہایت جوش میں آ کر کہا - کہ "اگر دین اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا - تو میں فوراً اسلام ترک کر دیتا -"

سرسید نے اپنی راستی اور صاف گوئی سے صرف ان مسلمانوں ہی کو مخالف نہیں بنایا جو پرانے خیالات رکھتے تھے۔ اور جن سے کسی طرح موافقت کی امید نہ تھی۔ بلکہ جو بات اس کو حق معلوم ہوئی۔ اس کے کہنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص بھی اس بات میں میرے ساتھ اتفاق کرنے والا ہے یا نہیں۔ نیشنل کانگرس کے خلاف لکچر دینے سے پہلے تمام تعلیم یافتہ ہندو، بنگالہ سے کشمیر تک سرسید کو ملک کا سچا خیرخواہ جانتے تھے، ان کی نہایت تعریف کرتے تھے۔ مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ان کی قدر کرتے تھے۔ اخباروں میں ان کی نسبت مدحیہ آرٹیکل چھاپتے تھے۔ اپنی قومی مجلسوں کی طرف سے ان کے سامنے ایڈریس پیش کرتے تھے۔ پبلک سپیچوں میں ان کا ذکر خیر کرتے تھے۔ سرسید کو معلوم تھا کہ اگر کانگرس کے خلاف ایک حرف بھی کہا تو کم از کم تعلیم یافتہ ہندو مخالف ہو جائیں گے۔ مگر جب ان کو پختہ یقین ہو گیا کہ کانگرس کی اکثر خواہشیں ناممکن الوقوع اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور مسلمانوں کا اس میں شریک ہونا پولیٹیکل خطرات کا باعث ہوگا۔ انھوں نے نہایت زور شور سے مسلمانوں کو اس کی شرکت سے روکا۔ اور کانگرسی گروہ کی ناراضی کا کچھ خیال نہ کیا۔ بنگالیوں نے ان کو خود غرض اور اینگلوانڈیز کا خوشامدی اور ٹائم سرور، سب کچھ کہا۔ صدہا آرٹیکل بنگالی اخباروں میں ان کے خلاف چھپ گئے۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب جو

حضور ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند نے ان کو عنایت فرمایا ۔ اس کو بنگالیوں نے کانگرس کی مخالفت کا صلہ قرار دیا ۔ مسٹر ہیوم جو سرسید کے دوست تھے وہ ان سے بدگمان ہوگئے ۔ بعضے ایجوکیٹیڈ مسلمان بھی ان کی طرف سے کھٹک گئے ، مگر سرسید نے کسی بات کی کچھ پروا نہیں کی اور جہاں تک ممکن تھا ۔ مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے نہیں دیا ۔

سرسید کو کوئی بات اس سے زیادہ شاق نہیں گزرتی تھی کہ ان پر راستبازی کے خلاف کوئی الزام لگایا جائے کیونکہ یہ شخص فی الواقع راستبازی کو اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا ۔ جس زمانے میں وہ ولایت میں تھے ۔ انھوں نے ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر جو اس وقت یہاں جاری تھا ۔ ایک پمفلٹ لکھ کر شائع کیا تھا جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم پر بہت کچھ نکتہ چینی کی تھی ۔ ازانجملہ ایک دیہاتی مدرسہ کی نسبت ، جس کا انھوں نے ہندوستان میں خود معائنہ کیا تھا یہ لکھا تھا "کہ مکان مدرسہ میں گائے بندھی ہوئی تھی ۔ اور مدرس اور لڑکے سب غیر حاضر تھے" ۔ وہ جب ہندوستان میں پہنچا تو سر ولیم میور جو اس وقت شمال مغربی اضلاع میں لفٹیننٹ گورنر تھے ۔ ان کی نظر سے بھی گزرا ۔ چند روز بعد انھوں نے ایک پبلک سپیچ میں کہا "کہ میں نے ضلع میں دورہ کرتے ہوئے کافی طمانیت حاصل کی کہ تعلیم کی حالت عمدہ ہے اور اس محنت اور کوشش کے نشان ظاہر ہیں، جو سید احمد خاں کے نتائج کے مخالف ہے ۔"

یہ سپیچ مع اردو ترجمہ کے اخبار میں چھپ کر ولایت پہنچی ۔ اور سرسید کی بھی نظر سے گزری ۔ ترجمہ کے الفاظ

سے وہ یہ سمجھے کہ سر ولیم میور نے مجھ پر دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے - ان کو نہایت رنج ہوا - اور جب وہ ہندوستان واپس آئے تو الہ آباد میں ہزآنر سے مل کر نہیں گئے - سیدھے بنارس چلے گئے - ہزآنر کے پرائیویٹ سیکرٹری کی چٹھی سرسید کے نام بنارس میں پہنچی ، جس میں لکھا تھا کہ "نواب لفٹیننٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے ہیں - اور آپ کی خیرت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں اور اب تک انتظار کر رہے ہیں" -

سرسید نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی اور سید محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی - یہ چٹھی ۷ نومبر کی تھی - سر ولیم نے نویں نومبر کو اس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے :-

"مائی ڈیر سید احمد ! آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھ کو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا - اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف واقعہ بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہوگا - میں ان نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں اب بھی اختلاف رکھتا ہوں - مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا -

مجھ کو نہایت افسوس ہے - کہ آپ نے فوراً مجھ کو براہ راست کیوں نہ لکھا - آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھ کو اور بھی رنج ہوتا ہے - گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ مجھ

پر نہ کیا جس کی میں آپ سے امید کرتا تھا۔ اور شاید امید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا۔

اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہوں گا۔"

سر سید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ "آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اٹھ گیا۔"

کرنل گریہم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "سرولیم نے سید احمد خاں کو اجازت دے دی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں۔ اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا، مگر سید نے اس کو پڑھ کر ڈال دیا اور مجھ کو بڑی تلاش سے وہ چٹھی ملی۔"

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیریکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سر سید تھے بہت کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہ پر صوبے کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ ان کی دلجوئی کی گئی۔ مگر ہندوستانی شرفا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جو محض اپنی نمود کے لیے حکام کی ایسی تحریروں کو شائع کرنا جیسی سر ولیم کی تحریر سرسید کے نام تھی منکر اور حقیر بلکہ ایک کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ

گزرا - جب سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا مکان بن کر تیار ہوا تو صاحب ممدوح کو اس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لیے بلایا گیا تھا - ان کے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کی طرف سے ایام غدر میں کچھ شبہات تھے - اس لیے وہ رسم میں ان کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے - سر سید نے ان سے کہا "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اس کا پریذیڈنٹ بھی ہے ، اس کو شریک نہ کیا جائے -" انہوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم کی جائے - آخر مسٹر یویعلی نے جو علی گڑھ میں سیشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سر سید کے دوست تھے ، بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو راضی کیا - اور ان کو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی - سر سید کا اس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ ان کے نزدیک کمشنر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک الزام سے پاک جانتے تھے -

سر سید جیسے خود راستباز تھے - اسی طرح راستبازوں کی دل سے قدر کرتے تھے - جس زمانہ میں وہ مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اس وقت خاں بہادر منشی غلام نبی خاں مرحوم رئیس میرٹھ وہاں نوکری کے امیدوار تھے - پھر چند روز کے بعد وہ نائب سررشتہ دار کلکٹری مقرر ہو گئے تھے - اس وقت حسن اتفاق سے رہتک میں چند لائق اور ذی علم اہل کار سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں موجود تھے -

جن کی سر سید کے ہاں آمدورفت تھی ۔ خان بہادر نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھے سید صاحب سے ملوا دو ۔ انھوں نے کہا بہت اچھا ۔ مگر وہ لامذہب ہیں ۔ یہ فقہا کی اصطلاح سے ناواقف تھے ۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ سید صاحب قید اسلام سے آزاد ہیں ۔ ایک دن سید صاحب اور دیگر اہل کار ایک جگہ جمع تھے ۔ نماز کا وقت آ گیا ۔ سب نے سید صاحب کو امام بنایا ۔ منشی غلام نبی خاں چونکہ نہایت کھرے اور سچے آدمی تھے ان کو تعجب ہوا کہ ان لوگوں نے ایک لامذہب (غیر مسلم) کو کس طرح امامت پر کھڑا کر دیا ۔ جونہی سید صاحب نے نیت باندھی ۔ انھوں نے الگ چادر بچھا کر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا ۔ سر سید نے نماز ہی میں یہ معلوم کرکے نیت توڑ دی اور منشی صاحب سے کہا کہ آپ نماز پڑھائیے ۔ انھوں نے کہا میں امامت کی لیاقت نہیں رکھتا ۔ لیکن آپ اپنا مذہب مجھے بتلائیں ۔ اس وقت اگر میرا دل ٹھکے گا میں خود آپ کا مقتدی بنوں گا ۔ ورنہ مجھے معاف فرمائیے گا ۔ سید صاحب نے کہا ۔ میں شافعی مذہب رکھتا ہوں ۔ منشی صاحب نے کہا تو بسم اللہ میں آپ کے پیچھے بڑی خوشی سے نماز پڑھوں گا ۔ آخر سر سید ہی نے نماز پڑھائی ۔

یہ واقعہ منشی صاحب نے خود مجھ سے بیان کیا تھا اور کہتے تھے کہ اس موقع پر میری یہ صفائی دیکھ کر سید صاحب مجھ پر زیادہ مہربان ہو گئے تھے ، باوجودیکہ اس وقت ان کے ایک ادنیٰ ماتحت اہل کار کی حیثیت رکھتا تھا ۔ جس روز میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا ۔ وہ بلا تکلف میرے مکان پر تشریف لے آتے تھے ۔ حالانکہ ان کی عادت کسی کی سفارش

کرنے کی نہ تھی - باوجود اس کے انھوں نے گرمی صاحب جھٹ مجسٹریٹ رہتک سے ایک نہایت نازک موقع پر میری سفارش کی - دوسری دفعہ جو وہ ایک مہینے کے لیے رہتک بدل کر گئے تو مکان علیحدہ کرایہ کو نہیں لیا - بلکہ صرف اس نظر سے کہ وہاں لوگوں کی نگاہ میں میری وقعت زیادہ ہو - میرے ہی غریب خانے پر آ کر اترے - اور مہینہ بھر تک وہیں قیام فرمایا - پہلی دفعہ جب وہ علیحدہ مکان میں رہتے تھے - ایک روز میں سخت بیمار ہو گیا - جس سے پیشاب اور پاخانہ بند ہو گیا - مجھے نوکر ہوئے چند روز گزرے تھے اور میری تنخواہ صرف تیس روپے ماہوار تھی اور ایک آدمی کے سوا کوئی نوکر نہ تھا - غرضیکہ عجیب بے کسی کی حالت تھی - صدر اینسی کے ناظر نے جو میرے مکان کے قریب رہتا تھا میرے حال کی اطلاع پا کر سید صاحب کو رات کے نو بجے خبر کی - تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ سید صاحب یونانی حکیم کو ساتھ لیے چلے آتے ہیں - اور ڈاکٹر کو جیل خانے سے لانے کے لیے آدمی بھیج کر آئے ہیں - تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آ گیا - مگر حکیم کو دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر ان کے علاج سے فائدہ نہ ہو تو پھر مجھے اطلاع دی جائے - اور یہ کہہ کر چلا گیا - اتفاق یہ کہ حکیم صاحب کے علاج سے کچھ نفع نہ ہوا - سید صاحب نے ڈاکٹر کو پھر بلایا - اور رات کے دو بجے اس نے آ کر جلاب دیا - یہاں تک کہ صبح کی نماز کے وقت جا کر مجھے اجابت ہوئی اور میری تکلیف بالکل رفع ہو گئی - سید صاحب تمام رات میرے غریب خانے پر جاگتے رہے اور جب مجھے افاقہ ہو لیا - تو صبح کی نماز پڑھ کر اپنے مکان پر تشریف

لے گئے - جس شفقت اور بزرگانہ عنایت کے ساتھ انھوں نے میری تیمارداری کی اس کو میں تمام عمر فراموش نہ کروں گا۔

منشی صاحب کہتے تھے - کہ دہلی میں مولوی امام بخش صہبائی نے سید صاحب سے پوچھا - کہ تم نے غلام نبی میں کیا بات دیکھی - جو اس پر اس قدر مہربان ہو - سید صاحب نے کہا کچھ نہیں صرف اتنی بات ہے جیسا میں سڑا ہوں ایسا ہی وہ سڑا ہے -

جس زمانے میں سر سید انگلستان میں تھے - اور ان کی آزادانہ تحریریں جو ہندوستان میں آکر بذریعہ سوسائٹی اخبار میں شائع ہوتی تھیں - ان پر چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑتی تھی - ان دنوں سید مہدی علی خاں ان کو برابر ممانعت کے خط بھیجتے تھے - کہ ایسی تحریریں یہاں نہ بھیجنی چاہیں - ایک دفعہ انھوں نے گردن مروڑی مرغی کا ذکر نہایت صفائی اور آزادی سے لکھ بھیجا - جس پر یہاں بہت لے دے ہوئی - اور مولوی صاحب ممدوح نے اپنے خط میں اس تحریر پر بہت افسوس ظاہر کیا - اس کے جواب میں سر سید نے ان کو ایک لطیف تحریر بھیجی - جس کے چند فقرے یہاں نقل کیے جاتے ہیں - وہ لکھتے ہیں :

" جن لفظوں میں ، میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا ہے اور جن پر آپکو افسوس ہوا ، اس کا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں - ہاتھ جوڑ کر ہندوستانی طور پر ، نہ شرعی طور پر ، توبہ کرتا ہوں - افسوس کہ مجھے ایسے الفاظ لکھنے نہ آئے - جن سے آپ کو افسوس نہ ہوتا - برائے خدا معاف کیجیے - جب میں وہ لفظ لکھ رہا تھا - تم میرے دل میں

اور میری آنکھوں کے سامنے تھے - میں جانتا تھا کہ تم اسے ناپسند کرو گے - بھائی ! تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں برا کروں اور اس کو اس لیے چھپاؤں کہ لوگ برا کہیں گے - ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے - جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے - جو بات کہتے ہیں ، سن لیتا ہے - جو دل میں لاتے ہیں - جان لیتا ہے - ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے نہ زمین پر چھوڑے - نہ رات کو الگ ہو نہ دن کو الگ ہو - نہ غیر ذبح شرعی کھاتے وقت چھوڑے - پس جب میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی خاں سے کیا ڈر کرتا - میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں - والئی مصر کے ساتھ بعض علمائے مصر بھی تھے - سب انگریزوں کے ساتھ غیر ذبح کیے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے - بہرحال اس میں گفتگو نہیں کرتا - شاید میں غلطی پر ہوں - صرف معافی چاہتا ہوں -"

سوالات اور مشقیں

۱- سر سید کی راست بازی کے کچھ واقعات اپنی کاپی میں لکھیے -

۲- راست باز آدمی میں کون کون سے اوصاف ہوتے ہیں ؟ سر سید نے یہ کیوں کہا کہ سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے ؟

۳- اوصاف وصف کی جمع ہے - غور کرکے مندرجہ ذیل جمع لفظوں کے واحد بتائیے :

اوقات ، اولاد ، اوضاع ، اوراق -

۴- سوال نمبر ۳ کے لفظوں کے معنی لغت میں تلاش کیجیے -

۵- تصدیق کرنا ، تامل کرنا ، تعرض کرنا ، ٹٹی کی اوجھل (یا آڑ) شکار کھیلنا - شاق گزرنا کو جملوں میں استعمال کیجیے -

مرزا غالب کے اخلاق و عادات

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے - وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا - نہایت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے - جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا -

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا - باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے ، بااین ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے - ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

"جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا - اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا - اور اصلاح دیتا تھا اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے ، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے - کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بہ سبب کبرسنی کے خدانے فرض اور پیغمبر نے سنت معاف کردی تھی - میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار سے مجھے معاف کریں - خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا -"

باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے - ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے بہ سبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی - اس کے جواب میں لکھتے ہیں - "لا حول ولا قوۃ ! کس ملعون نے بہ سبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی - اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار ، میں نے تو بطریق "قہر درویش بر جان درویش" لکھا تھا - جیسے اچھی جورو برے

خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہو گئی تھی۔ اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا مگر وہ غریبوں، محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹیننٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسب معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لیفٹیننٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہو گا! اس لیے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر فروخت کرنے کے لیے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ جو گردش روزگار سے بگڑ گئے تھے۔ نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دہلی کے عمائد میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے۔ اور غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہو گئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ چغوں کے سوا ایسا کوئی غیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن

پر دیکھ کر دل بھر آیا ۔ ان سے پوچھا "کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی ؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوئی ہے ۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیجیے" ۔ انھوں نے کہا "یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے ، اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے اگر آپکو پسند ہے تو یہی حاضر ہے" ، مرزا نے کہا "جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں ۔ مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے ۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے" ؟ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کھونٹی سے اپنا مالیدے کا نیا چغہ اتار کر انھیں پہنا دیا ۔ اور اس خوبصورتی سے وہ چغہ ان کی نذر کر دیا ۔

جیسی مرزا کی طبیعت میں دراکی ، اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا ۔ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا ۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے ۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی ۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے ۔ جس کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں ۔ کلکتے میں لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کیے تھے ۔ جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی "باد مخالفت" لکھی تھی ۔ ان کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علئحیدہ علئحیدہ بھیجی تھیں ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں ان کو مفصل بیان کیا ہے ۔ برہان قاطع پر جو کچھ انھوں نے لکھا ۔ وہ محض اپنی یادداشت

کے بھروسے پر لکھا تھا - فکر شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے - اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمربند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے - اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے -

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا - اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے - وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا - لطف سے خالی نہ ہوتا تھا - ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا -

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تھا تو قلعے میں گئے - بادشاہ نے پوچھا - مرزا! تم نے کتنے روزے رکھے ؟ عرض کیا "پیرو مرشد! ایک نہیں رکھا" ایک دن نواب مصطفے خاں کے مکان پر ملنے کو آئے - ان کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا - جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب ان کے لینے کو کھڑے تھے - مرزا نے ان کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا - ع

"کہ آب چشمہ حیوان درونِ تاریکی است"

جب دیوان خانے میں پہنچے تو اس کے دالان میں بہ سبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی - مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا - ع

"ایں خانہ تمام آفتاب است"

ایک صحبت میں مرزا، میر تقی کی تعریف کر رہے تھے شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے۔ آنھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا "میں تو تم کو میری سمجھتا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں" مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے، وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھڑی تنگ و تاریک تھی جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھڑی میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔ اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا۔ اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھڑی میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے۔ اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے۔ کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا۔ کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے۔ مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔ مرزا نے کہا۔ "قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے۔ مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے۔ وہ یہی کوٹھڑی ہے"۔

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی ان کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ہو جاتی۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا۔ اور دستر خوان بچھا۔ برتن تو بہت سے تھے، مگر کھانا نہایت قلیل تھا۔ مرزا نے مسکرا

کر کہا - "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجیے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے - اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیے تو بایزید کا" -

فواکہ میں سے مرزا کو آم نہایت مرغوب تھا - ان کے دوست دور دور سے انھیں عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے - اور وہ خود بھی اپنے بعض دوستوں سے تقاضا کرکے آم منگواتے تھے - ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے - باغ حیات بخش یامہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے - آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے - یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آ سکتا تھا - مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے - بادشاہ نے پوچھا - "مرزا ! اس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو" ؟ مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا - "پیرومرشد ! جو کسی بزرگ نے کہا ہے -

بر سر ہر دانہ نوشتہ عیان
کای فلاں ، ابن فلاں ، ابن فلاں

اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں" - بادشاہ مسکرائے اور اسی روز عمدہ عمدہ آموں کی بہنگی مرزا کو بھجوا دی -

حکیم رضی الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے - ان کو آم نہیں بھاتے تھے - ایک دن وہ مرزا کے مکان پر برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے - ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا - آم کے

چھلکے پڑے تھے ۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیے ۔ حکیم صاحب نے کہا ۔ "دیکھیے ! آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا ۔ مرزا نے کہا ۔ "بے شک گدھا نہیں کھاتا"۔

سوالات اور مشقیں

۱ - مرزا کے اخلاق و عادات کے متعلق ایک چھوٹا سا مضمون لکھیے ۔

۲ - مندرجہ ذیل الفاظ میں جو واحد ہیں ان کی جمع اور جو جمع ہیں ان کے واحد لکھئے :

اخلاق ، عادات ، شعر ، خدمت ، فرائض ، طور ، عائد ، نقش ۔

۳ - ''قہر درویش بر جان درویش'' اور ''کہ آب چشمہ حیوان درون تاریکی است'' کے معنی اچھی طرح سمجھیے اور ان دونوں کو جملوں میں استعمال کرنے کی کوشش کیجیے ۔

۴ - ذیل کے جملے سے کیا دو مطلب نکلتے ہیں ۔

''میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں ۔

شبلی نعمانی

پورا نام محمد شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) ہے - ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ میں وکیل تھے - شبلی وہیں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی - اس کے بعد مولانا محمد فاروق سے تعلیم حاصل کرنے غازی پور گئے - یہاں منطق و فلسفہ کی تکمیل کی - اس کے بعد رامپور ، لاہور ، سہارن پور وغیرہ کا سفر کیا اور مختلف عالموں سے فقہ ، حدیث اور عربی ادب کی کتابیں پڑھیں - ۱۹ سال کی عمر میں حجاز کا سفر کیا اور مدینہ منورہ کے کتب خانوں کی سیر کی - وہاں سے واپسی پر مطالعے ، تحقیق اور تصنیف کے کام میں مصروف ہو گئے اور زندگی اسی میں گزار دی - والد کے کہنے سے وکالت کا امتحان پاس کیا لیکن اس پیشے میں جی نہ لگا اور جلد ہی اسے ترک کر دیا -

شبلی ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ میں پروفیسر ہوئے - یہاں انھیں سرسید کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان کے اعلیٰ درجے کے کتب خانے سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا - ۱۸۹۲ء میں انھوں نے اپنے استاد مسٹر آرنلڈ کے ساتھ جن سے انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی تھی ، قسطنطینیہ کا سفر کیا - وہاں سے واپس آکر اپنا سفرنامہ "سفرنامہ مصر و روم و شام" لکھا - ۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہوا تو شبلی علی گڑھ سے اعظم گڑھ آ گئے - کچھ عرصے حیدرآباد میں بھی ملازم رہے - ۱۹۰۷ء میں اتفاقیہ بندوق چل جانے سے ان کا ایک پاؤں سخت زخمی ہوا اور اس کی وجہ سے ان کی ٹانگ کاٹ دی گئی -

سیرۃ النبی، الفاروق، المامون، سوانح مولانا روم، شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر ان کی مشہور کتابیں ہیں ۔ ان کتابوں میں ایک تو عالمانہ شان ہے اور دوسرے ان کا انداز بیان بڑا شگفتہ ہے ۔ شبلی نے رنگینی بیان اور سادگی اور سلاست کے ملاپ سے ایسا طرز تحریر پیدا کیا ہے کہ فلسفے، تاریخ اور تنقید کی کتابوں میں بھی پڑھنے والے کو خشکی محسوس نہیں ہوتی ۔ سرسید کے ہم عصروں میں حالی اور شبلی دو ادیب ہیں جن کے طرز کی پیروی بہت کی گئی ہے اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ دور میں اردو نثر نگاری کے جو انداز اور اسلوب رائج ہیں ان پر یا تو حالی کا اثر ہے یا شبلی کا ۔ تو بے جا نہ ہوگا ۔

''شاعری کے اجزا'' ان کی تصنیف ''شعر العجم'' کا ایک ٹکڑا ہے اور مامون کے اخلاق و عادات'' المامون سے لیا گیا ہے ۔

★

شاعری کے اجزا

ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں ۔ اس میں وزن ہوتا ہے، محاکات ہوتے ہیں یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے ۔ خیال بندی ہوتی ہے ۔ الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں، بندش صاف ہوتی ہے ۔ طرز ادا میں جدت ہوتی ہے ۔ لیکن کیا یہ سب چیزیں شاعری کے اجزا ہیں ؟ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر، شعر نہ ہوتا ۔ اگر ایسا نہیں اور قطعاً

نہیں ہے - تو ان تمام اوصاف میں خاص ان چیزوں کو متعین کر دینا چاہیے جن کے بغیر شعر، شعر نہیں رہتا - عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے - اسی لیے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں، لیکن محققین کی یہ رائے نہیں - وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں - تاہم ان کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے -

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوری ہے - لیکن یہ بھی صحیح نہیں - اگر کسی شعر میں تخئیل ہو اور محاکات نہ ہوں تو کیا وہ شعر نہ ہوگا ؟ سینکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کی بجائے صرف تخئیل ہے - اور باوجود اس کے وہ عمدہ اشعار خیال کیے جاتے ہیں - شاید یہ کہا جائے - کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخئیل اس کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی - اس لیے تخئیل بھی محاکات ہے - لیکن یہ زبردستی ہے - آگے چل کر جب ہم محاکات اور تخئیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں - گو یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی سرحدیں مل جائیں - حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے - محاکات اور تخئیل - ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر ، شعر کہلانے کا مستحق ہوگا - باقی اوصاف یعنی سلاست ، صفائی ، حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں -

محاکات کی تعریف

محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے -

تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادی اشیا کے علاوہ ، حالات ، یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے - چنانچہ اعلیٰ درجے کے مصور انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں کہ چہرے سے جذبات انسانی مثلاً رنج ، خوشی ، تفکر ، حیرت ، استعجاب ، پریشانی اور بے تابی ظاہر ہو - جہانگیر کے سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی - جس کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں - تلووں کے سہلاتے وقت چہرے پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرے سے نمایاں تھا - تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی - سینکڑوں گوناگوں واقعات ، حالات اور واردات ہیں جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں -

ایک بڑا فرق مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے - اس کا ایک ایک خال و خط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی - بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں - شاعر اکثر صرف ان چیزوں کو لیتا ہے اور ان کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے - باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندوزی میں ان سے خلل نہ آئے - فرض کرو ایک پھول کی تصویر کھینچنی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھائے - لیکن شاعر کے لیے یہ ضروری نہیں - ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں

صورت میں دکھائے ۔ تاہم مجموعے سے وہ اثر پیدا کر دے ۔ جو اصلی پھول دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے ۔

ایک اور بڑا فرق مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جزو نمایاں کرکے نہیں دکھاتا ۔ تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے ۔ سبزے پر شبنم دیکھ کر وہ اثر پیدا نہیں ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے ۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصل کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے ۔ لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے ۔ یعنی نہ اصل کی پوری تصویر کھینچ سکتا ہے ۔ کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی ۔ نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتی ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ تصویر صحیح نہیں کھینچی ۔ اس موقع پر اس کو تخئیل سے کام لینا پڑتا ہے ۔ وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب و تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے ۔ لیکن وہ قوت تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے لوگوں نے اسے امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا ۔ اس لیے اس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا ۔

سوالات اور مشقیں

۱ - بتائیے مندرجہ ذیل الفاظ کن لفظوں کی جمع ہیں -
اجزا - عوارض - اشعار - اشیاء

۲ - ذیل کے الفاظ اور ترکیبوں کے معنی اچھی طرح سمجھ کر انھیں جملوں میں استعمال کیجیے :
دسترس ، خال و خط ، اثراندوزی ، آب و تاب -

۳ - محاکات کے آپ کیا معنی سمجھے -

۴ - محاکات اور مصوری کا جو فرق مصنف نے بتایا ہے اسے اپنے لفظوں میں بیان کیجیے -

مامون کے اخلاق و عادات

مامون کی نسبت مؤرخین کے متفقہ الفاظ یہ ہیں ۔ ”تمام خلفائے بنی عباس میں کوئی تخت نشین ، دانائی ، عزم ، بردباری ، حلم ، رائے ، تدبیر ، شجاعت ، عالی حوصلگی ، فیاضی میں اس سے افضل نہیں گزرا“ ۔ ہارون رشید اکثر کہا کرتا تھا کہ ”میں مامون میں منصور کا عزم ، مہدی کی خداپرستی ، ہادی کی شان و شوکت پاتا ہوں“ ۔ ان باتوں پر اگر اس کے عفو و انکسار ، بے تکلفی ، سادہ مزاجی کی صفتیں بڑھا لی جائیں تو افضیلت کا دائرہ تمام سلاطین اسلام کو محیط ہو جاتا ہے ۔

مامون کا قول تھا کہ ”مجھ کو عفو میں ایسا مزہ ملتا ہے کہ اس پر ثواب ملنے کی توقع نہیں“

عبداللہ بن طاہر کا بیان ہے کہ ایک بار مامون کی خدمت میں حاضر تھا ۔ اس نے غلام کو آواز دی مگر صدائے بر نخاست ۔ پھر پکارا ،تو ایک ترکی غلام حاضر ہوا ۔ اور آتے ہی بڑبڑانے لگا ، کہ ”کیا غلام کھاتے پیتے نہیں ۔ جب ذرا کسی کام کے لیے باہر گئے تو آپ ”یا غلام یا غلام“ چلانے لگتے ہیں۔ آخر یا ”غلام“ کی کوئی حد بھی ہے “

مامون نے سر جھکا لیا اور دیر تک سربگریباں رہا ۔ میں نے سمجھا ، بس اب غلام کی خیر نہیں ۔ مامون میری طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ ”نیک مزاجی میں یہ بڑی آفت ہے کہ نوکر اور غلام شریر اور بدخو ہو جاتے ہیں ۔ مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کے نیک خو کرنے کے لیے میں بد مزاج ہوں “۔

ایک دن دجلے کے کنارے بیٹھا تھا ۔ ارکان دولت دست بستہ کھڑے تھے ۔ سامنے پردہ پڑا ہوا تھا ۔ ایک ملاح یہ کہتے ہوئے جاتا تھا کہ "مامون جس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا ، کیا ہماری آنکھ میں عزت حاصل کر سکتا ہے؟ ۔"

مامون یہ سن کر مسکرا دیا اور ارکان دولت کی طرف مخاطب ہو کر کہا ۔ "کیوں صاحبو ! آپ ایسی بھی کوئی تدبیر بتا سکتے ہیں کہ میں اس جلیل القدر آدمی کی نظروں میں مؤقر ہو سکوں ۔"

مامون کا دعوےٰ تھا کہ "بڑے سے بڑا جرم بھی میرے حلم کو متزلزل نہیں کر سکتا ۔" ایک شخص سے جو متعدد بار نافرمانیاں کر چکا تھا ، اس نے کہا "تو جس قدر گناہ کرتا جائے گا میں بخشتا جاؤں گا ۔ یہاں تک کہ آخر عفو تجھ کو تھکا کر درست کر دے گا ۔"

مامون کی اس رحم دلی پر لوگوں کو اس قدر بھروسا ہو گیا تھا کہ بے تکلف اس کے سامنے اپنی خطاؤں کا اعتراف کر دیتے تھے ۔ عبدالملک جس کی شکایت کی بہت سی عرضیاں گزر چکی تھیں ، مامون نے اس کو بلا کر پوچھا کہ "اصل بات کیا ہے ؟" عبدالملک نے مطلقاً انکار کیا ۔ مامون نے کہا مگر مجھ کو تو اس کے خلاف خبریں پہنچتی ہیں ۔ عبداللہ نے عرض کیا ۔ "امیر المومنین ! اگر کوئی بات ہوتی تو میں خود اقرار کر دیتا ۔ حضور کا عفو تو ہر حالت میں میری حمایت کے لیے سپر بن سکتا تھا ۔ پھر میں سچائی کی دولت کو دانستہ کیوں کھوتا "

مامون اگرچہ ملک کے ایک ایک جزئیات کی خبر رکھتا

تھا اور اس شوق میں ہزاروں لاکھوں روپے صرف کر دیتا تھا ، مگر غمازوں[1] کا جانی دشمن تھا ۔ اس بات میں اس کے مقولے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ۔ اس کے سامنے جب غمازوں کا ذکر آتا تھا تو اکثر کہتا تھا کہ "ان لوگوں کی نسبت تم کیا خیال کرتے ہو، جن کو خدا نے سچ کہنے پر بھی لعنت کی ہے" اس کا قول تھا کہ "جس شخص نے کسی کی شکایت کر کے اپنی عزت میری آنکھوں میں گھٹا دی ، پھر کسی طرح اس کی تلافی نہیں کر سکتا" ۔

مامون اگرچہ بڑی عظمت و شان کا بادشاہ تھا اور ناموری کے دفتر میں عام مؤرخین نے اس کے جاہ و جلال کی داستانیں جلی خط سے لکھی ہیں ، مگر ہمارے خیال میں جو چیز اس کی تاریخ زندگی کو نہایت مزین اور پر اثر بنا دیتی ہے، وہ اس کی سادہ مزاجی اور بے تکلفی ہے ۔ ایک ایسا شہنشاہ جو تخت حکومت پر بیٹھ کر کل اسلامی دنیا کا ذمہ دار بن جاتا ہے ، کس قدر عجیب بات ہے کہ عام دوستوں سے ملنے جلنے میں شان سلطنت کا لحاظ رکھنا بالکل پسند نہیں کرتا ۔ اکثر اہل علم و ارباب کمال راتوں کو اس کے مہمان ہوتے تھے ، اور اس کے بستر سے بستر لگا کر سوتے تھے ۔ مگر اس کا عام برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کہ ایک سادہ خالص دوست کا دوست کے ساتھ ہوتا ہے ۔ قاضی یحییٰ ایک رات اس کے مہمان تھے ۔ اتفاقاً آدھی رات کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی اور پیاس معلوم ہوئی ۔ چونکہ چہرے سے بے تابی کا اثر ظاہر ہوتا تھا ، مامون نے پوچھا ۔ "خیر ہے "؟ قاضی صاحب نے پیاس کی شکایت کی ۔ مامون خود چلا گیا اور

۱۔ چغلخوروں ۔

دوسرے کمرے سے پانی کی صراحی اٹھا لایا ۔ قاضی صاحب نے گھبرا کر کہا ۔ "حضور نے خدام کو ارشاد کیا ہوتا!" مامون نے کہا نہیں ۔"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ۔ "سید القوم خادمہم" راتوں کو خدام سو جاتے تھے تو خود اٹھ کر چراغ اور شمعیں درست کر دیا کرتا تھا ۔

ایک بار باغ کی سیر کو گیا ۔ قاضی یحییٰ بھی ساتھ تھے ۔ مامون ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ٹہلنے لگا ۔ جانے کے وقت دھوپ کا رخ قاضی صاحب کی طرف تھا ۔ ادھر سے واپس آتے وقت مامون کی طرف بدل گیا ۔ قاضی صاحب نے چاہا کہ وہ پہلو خود لے لیں تاکہ مامون سائے میں آ جائے ۔ لیکن اس نے گوارا نہ کیا ۔ اور کہا کہ "یہ انصاف سے بالکل بعید ہے ۔ پہلے میں سائے میں تھا اب واپسی کے وقت تمہارا حق ہے" ۔

مامون کے عہد تک تمام دربار اب تک اسی قسم کے آئین و آداب کا پابند تھا ۔ مامون کو ایک بار چھینک آئی ۔ حاضرین میں سے کسی نے سنت نبوی کے طریقے پر یرحمک اللہ نہیں کہا ۔ مامون نے سبب پوچھا ۔ درباریوں نے عرض کیا کہ "آداب شاہی مانع تھا ۔" مامون نے کہا کہ "میں ان بادشاہوں میں سے نہیں ہوں جو دعا سے عار رکھتے ہیں ۔" چونکہ مامون اس قسم کے بیہودہ آداب و مراسم کو پسند نہیں کرتا تھا ، اہل دربار نے بھی تکلف کی قید سے آزادی پائی ۔

عرب مؤرخین نے مامون کی سخاوت و دریا دلی کا ذکر فخر اور جوش کے ساتھ کیا ہے اور چونکہ مامون کے اصلی اور عملی کارنامے اس قسم کی حیرت انگیز فیاضیوں سے معمور ہیں ان کو ایشیائی عبارت آرائی کی ضرورت نہیں پڑی ۔ ان صفات کے

متعلق جس قدر مبالغہ کیا جا سکتا ہے خوش قسمتی سے وہ مامون کے اصلی واقعات ہیں۔

سوالات اور مشقیں

۱ - ذیل کے لفظوں ، ترکیبوں اور محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے :

سر بکریاں ہونا ، ارکان دولت ، متزلزل ، اعتراف ، آب زر ، معمور

۲ - مامون کے جن اوصاف کا ذکر اس سبق میں کیا گیا ہے ان کی فہرست بنائیے۔

۳ - لوگ مامون کے سامنے اپنی خطاؤں کا اعتراف کیوں کرلیتے تھے۔

۴ - اس جملے کا مطلب سمجھا کر لکھیے

" ان باتوں پر اگر اُس کے عفو و انکسار ، بے تکلفی ، سادہ مزاجی کی صفتیں بڑھا لی جائیں تو افضلیت کا دائرہ تمام سلاطین اسلام کو محیط ہوجاتا ہے۔

درس زندگی

(زندگی کو کسی نے انسان کی سب سے بڑی درسگاہ کہا ہے - زندگی ہر وقت آدمی کو کچھ نہ کچھ سکھاتی رہتی ہے - جوں جوں وہ بڑا ہوتا رہتا ہے زندگی کے متعلق اس کے تجربات اور معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے ، یہاں تک کہ آخر عمر میں اس کے تجربات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ ہر شخص ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے - درس زندگی کے عنوان سے ہم نیچے اپنی قوم کے چھ بڑے آدمیوں کے خیالات درج کر رہے ہیں - ان بڑے آدمیوں نے مختصر طور پر ہمیں یہ بتایا ہے کہ ان کے زندگی بھر کے تجربوں کا نچوڑ کیا ہے؟ - آپ ان تحریروں کو پڑھیے تو آپ کو ان کے ایک ایک لفظ میں کوئی کام کی بات ملے گی اور آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ زندگی کے کیا معنی ہیں -

جس کتاب میں سے یہ تحریریں لی گئی ہیں وہ اردو کے مشہور ادیب پطرس بخاری نے مرتب کی ہے - جیسے چھ سبق آپ ابھی پڑھیں گے "درس زندگی" میں اس طرح کے اور بہت سے سبق ہیں - آپ یہ کتاب حاصل کرکے پڑھیے - آپ اسے پڑھیں گے تو آپ کا جی چاہے گا کہ اس کتاب کو ہمیشہ اپنے پاس رکھیں - یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اچھی کتاب سے اچھا ساتھی اور کوئی نہیں) -

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(۱)

میرا بچپن میرٹھ ضلع کے ایک دور افتادہ گاؤں میں گزرا ،

جہاں میری ننھیال تھی - گھر کے قریب مسجد تھی اور پاس ہی مکتب تھا - یہاں لوگوں کی زندگی عجب عالم بے خبری میں بسر ہوتی تھی - باہر کی دنیا کی خبر گاہے گاہے آ گئی تو آ گئی ، ورنہ کچھ نہیں - اس زمانے کی ایک بات مجھے اب تک یاد ہے - ایک روز نا معلوم کیونکر سارے گاؤں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ روس آ رہا ہے - یہ سنتے ہی ہم سب سہم گئے - اور گھروں کے دروازے بند کرلیے - ہم بچے چوری سے چھت پر چڑھ کر روس کے آنے کی راہ دیکھنے لگے - اب جو کبھی یہ بات یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے - روس کی ہیبت جیسی اس وقت تھی اب بھی اس سے کچھ کم نہیں - آخر اسی "روسیہ" میں کوئی بات تو ہے - جو امن عالم کے داعیوں کے لیے دعوت فکر ہے -

اس گاؤں سے میں جلد ہی چلا آیا - دوسرے کئی مقامات پر رہنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا - آخر میں جب مدرستہ العلوم مسلمانان (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) علی گڑھ کے سکول اور دارالاقامہ میں داخل ہوا - تو میری آنکھیں کھلیں - ایسا معلوم ہوا کہ میں ایک نئی دنیا میں آ گیا ہوں - سید نے یہ بستی کچھ سوچ ہی کر بسائی تھی - یہاں عام پڑھائی کے سوا کچھ اور بھی تھا - اس کی فضا میں قومیت اور اسلامیت کی مہک تھی جو کہیں اور نہیں پائی جاتی تھی - پہلے دور سے دو تین سال بعد قریب سے کالج کے بانی سرسید کو دیکھنے ، بات چیت کرنے ، پاس اٹھنے بیٹھنے اور ساتھ کام کرنے کا موقع ملا - تو یہ راز کھلا کہ "بڑا آدمی" کسے کہتے ہیں - ان کے راستے میں ناقابل بیان مشکلات اور اوگھٹ گھاٹیاں تھیں - مگر وہ اپنے خلوص و صداقت ، فراست اور اخلاقی جرأت سے سب پر غالب

آ گئے ۔ ان کی بڑائی اس میں تھی کہ انھوں نے اصول پر وقتی مصلحت کو ترجیح نہیں دی اور باطل سے مرعوب نہیں ہوئے ۔

علی گڑھ کالج کے بعد مدت تک حیدرآباد دکن میں رہا ۔ یہ بالکل دوسری دنیا تھی ۔ سر سید کے علاوہ اپنی قوم کے بعض اور بڑے لوگوں سے بھی ملنے جلنے اور ان کے ساتھ کام کرنے اور ان کی زندگی کے ظاہر و باطن کو دیکھنے کا موقع ملا ۔ اس خاصی بڑی عمر میں (جو اس وقت ۸۶ سال کے لگ بھگ ہے) میری نظر سے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز اور اقبال و زوال کے منظر گزرے ہیں ۔ ان واقعات اور تجربات سے جو سبق حاصل ہوئے ہیں وہ میرے دل پر نقش ہیں ۔ ایک تو یہ کہ بے مقصد زندگی ، زندگی نہیں آوارگی ہے ۔ دوسرا یہ کہ انسان اپنی قسمت خود بناتا اور بگاڑتا ہے ۔ اس میں شک نہیں ۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تائید غیبی (قدرت کی طرف سے ہو یا کسی دوسری جانب سے) یا اتفاقات حسنہ ہماری زندگی میں داخل ہو کر کچھ دیر کے لیے ہماری منزل کی صعوبت آسان کر دیتے ہیں ۔ لیکن یہ سہارے ناپائدار اور کمزور ہوتے ہیں ۔ انسان کی کامیابی اس کی خود اعتمادی ، خلوص ، اخلاقی جرأت اور قوت ایمانی میں ہے ۔ مایوسی اور ناکامی لوازم زندگی میں سے ہیں ۔ ایک باعزم شخص ان سے ہراساں ہو کر پیچھے نہیں ہٹتا ۔ یہ ہماری قوت ایمانی کو ابھارتی اور سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتی ہے ۔

تیسری بات جو مختلف افراد اور جماعتوں کے حالات زندگی کے دیکھنے سے مجھ پر آشکار ہوئی ۔ وہ یہ ہے کہ دوسروں کی خوشی ہی میں اپنی خوشی ہے ۔ اور یہ صرف خدمت سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ خدمت میں وہ سب کچھ آ جاتا ہے جس سے

کسی کے دل کی کلی کھل جائے۔ ذاتی تجربہ اور تاریخ و سوانح کے مطالعہ سے ایک بات یہ بھی واضح ہوئی کہ حصول مقصد کے لیے خلوص بلاشبہ لازم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ عقل بھی درکار ہے۔ نادان مخلص خطرناک ہوتا ہے۔

سوالات اور مشقیں

۱۔ مطلب لکھیے :

(۱) بے مقصد زندگی، زندگی نہیں آوارگی ہے۔

(۲) دوسروں کی خوشی ہی میں اپنی خوشی ہے اور یہ صرف خدمت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(۳) نادان مخلص خطرناک ہوتا ہے۔

۲۔ آپ ''سر سید'' کی راست بازی پر حالی کا مضمون پڑھ چکے ہیں۔ اس مضمون میں بھی ان کے کچھ اوصاف کا ذکر آیا ہے۔ ان چیزوں کو سامنے رکھ کر سر سید پر ایک مضمون لکھیے۔

میاں بشیر احمد

(۲)

غور کرتا ہوں کہ زندگی کیا ہے؟ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جو اتنی عام اور اتنی ارزاں ہے، کیوں اس قدر حیرت انگیز اور ناقابل بیان ہے؟ یہ ہم میں سے ہر ایک کو بلا قیمت اور بے پوچھے ملتی ہے۔ ہم اس سے کس طرح چمٹے رہتے ہیں، لیکن باوجود اس کے ہم اس کی صحیح قدر و قیمت نہیں جانتے۔ ہر ایک جیتا ہے، لیکن صحیح جینے کا ڈھنگ کتنوں کو آتا ہے؟۔

مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ زندگی سے تم نے کیا سیکھا ہے؟

میں سمجھتا ہوں اور شک کرتے ہوئے بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس دنیا اور کائنات میں اور اس کے پیچھے اور اندر ہی اندر کچھ اور بھی ہے - یہاں کوئی اور ہے جو اس سب "کچھ" کی روح و رواں ہے - اس دنیا کا کوئی مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول میں انسان کا ایک اہم حصہ ہے - میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ نیکی اور حسن، زور صداقت، جادۂ حیات کی مشعلیں ہیں - جن کی رہنمائی سے تاریکیون پر روشنی پڑتی ہے - اور عشق و محبت وہ کشش ہے جس سے ہماری دنیا کا ذرہ ذرہ ایک دوسرے کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے - اور جس سے ہم ایک ہمہ گیر طاقت حاصل کر سکتے ہیں -

بلاشبہ زندگی مشکل کام ہے - لیکن اس کی مشکلات کو خواہ مخواہ اور مشکل نہ بناؤ - یہ تو روز کی باتیں ہیں - ان سے کیا گھبرانا ہے -

زندگی میں سینکڑوں رنج ہیں - لیکن اس میں ہزاروں خوشیاں بھی ہیں - کچھ رنج ایسے ہیں کہ آکر رہیں گے - کچھ خوشیاں ایسی ہیں کہ صبح و شام ہمارے انتظار میں ہیں - یہاں کانٹے بھی ہیں، پھول بھی ہیں - جو چاہو چن لو - جھگڑے، جھمیلے، غم، مصیبتیں یہ تو ہیں ہی - کسی کے لیے زیادہ کسی کے لیے کم - انسان انہیں کو کاٹنے اور ختم کرنے اور ختم ہونے کے لیے آیا ہے - لیکن ان کے ساتھ ہی کچھ اور بھی ہے - وہ کیا ہے؟ علم و ادب و فن کے خزانے، پہاڑوں، سمندروں اور آسمانوں کے دلکش نظارے، ننھے بچوں کے قہقہے اور کھیل کود، عزیزوں، دوستوں کا تبسم اور محبت اور ہمدردیاں اور بیسیوں اور چیزیں - غرض ایک دل ہو تو یہاں ہزاروں خوشیاں

ہیں - آگے بڑھو اور ان کو اپنے دامن میں سمیٹ لو۔ع

"دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم"

اس دنیا میں ہمیں کچھ کام کرنے ہیں ، ان میں بعض ایسے ہیں جو ہم دوسروں کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں - مثلاً ایک ایسے معاشرے کا قیام جس میں منجملہ اور باتوں کے ہر شخص کی بنیادی ضروریات پوری ہوں ، اور جس میں ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق معاشرے کے لیے کوئی نہ کوئی مفید کام کرتا رہے - لیکن کئی ایسے کام ہیں جو ہم خود ہی کر سکتے ہیں - ان میں سب سے مقدم، اور اہم، آپ اپنی اصلاح ہے، جو ہر ترقی کی بنیاد ہے - اپنے کاموں میں ہم آزاد بھی ہیں اور مجبور بھی - اپنی آزادی کا کما حقہ ، استعمال کرنا اور اپنی مجبوریوں کو بخوشی قبول کر لینا ، یہ ہے کامیاب زندگی کا راز !

روزمرہ کی باتوں میں عموماً اعتدال کی راہ اختیار کرو - لیکن وقت کی پکار ہو تو انتہائی قربانیوں سے بھی گریز نہ کرو - ع

"جس میں نہ ہو انقلاب ، موت ہے وہ زندگی"

یقین رکھو کہ تم دوسروں کے ساتھ مل کر اس دنیا کو بہتر دنیا بنا سکتے ہو - دلوں سے ربط پیدا کرو - "یہی فردوس بر روئے زمیں ہے" !

آؤ ہم ہر ملک اور ہر قوم اور ہر جماعت کے اندر ایک ایسی فضا پیدا کریں جس سے نوع انسان کے موجودہ تعصبات کم ہو کر دنیا بتدریج ایک "اُمت واحدہ" کی صورت اختیار کر لے - جس میں حقانیت اور اخوت اور عالمگیر محبت کا دور دورہ ہو - یہ بات بہت دشوار ہے - اور جلد ہو سکنے والی نہیں -

لیکن کیا کوئی واقعی شاندار بات آسان ہوتی ہے اور جلد ہو سکتی ہے ؟ یہ منزل نظر سے دور ہے - لیکن دل سے دور نہیں -

مشقیں

۱- مطلب لکھیے :

۱- حسن اور صداقت جادۂ حیات کی مشعلیں ہیں -

۲- دلوں میں ربط پیدا کرو - یہی فردوس بر روئے زمین ہے -

۳- عشق و محبت وہ کشش ہے جس سے ہماری دنیا کا ذرہ ذرہ ایک دوسرے کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے -

۲- مضمون کے آخری پارے کو خوش خط اپنی کاپی پر لکھیے -

عبدالمجید سالک

(۳)

خدا ترس اور نیک والدین کی تربیت اور بچپن کے مذہبی ماحول کی وجہ سے یہ عقیدہ ابتدا ہی سے میری فطرت میں راسخ ہو گیا کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک خدا ہے - جو ہمارے افعال کو دیکھتا اور ہمارے مافی الضمیر کو جانتا ہے اور نیکی اور بدی کی جزا و سزا یقینی ہے - اس عقیدے نے زندگی بھر میری رہنمائی کی ہے - زندگی کی مسرتوں میں مجھے بے خود نہیں ہونے دیا اور آلام روزگار میں ہمیشہ سہارا دیا -

میں بے حد ذکی الحس ہوں - کسی عزیز یا دوست سے خلاف توقع ناگوار رویے کا ظہور، کسی کا ذرا سا طعنہ، کوئی ذرا سی پریشانی ، میرے توازن طبع کو گھنٹوں تلپٹ رکھنے کے لیے کافی ہے - لیکن میں نے سالہا سال کی خود تربیتی اور بے حد دشواری سے صبر و تحمل کا وہ مقام حاصل کیا ہے کہ بعض لوگ میرے ظاہری سکون سے دھوکے میں آ کر مجھے بے حس تصور کر لیتے ہیں . اس تحمل نے مجھے ہمیشہ ناگوار حالات سے محفوظ رکھا ہے

اور میری زندگی کا سکون زیادہ تر اسی ضبط و تحمل کا شرمندۂ احسان ہے۔

میرا معمول یہ رہا ہے کہ ضرورت مندوں اور محتاجوں کی امداد اپنی استطاعت اور اپنے اثر و نفوذ کی آخری حد تک کروں۔ رشتہ داروں، دوستوں اور عام شناساؤں سے میرا سلوک ہمیشہ خدمت اور ایثار پر مبنی رہا ہے۔ خود تکلیف اٹھا لینا اور دوسروں کو تکلیف سے حتی الوسع محفوظ رکھنا میرا طبعی شعار ہو گیا ہے۔

زندگی کی جد و جہد اور حاجات و آلام میں خدا کے سوا کسی اور کی امداد پر تکیہ کرنا میرے معمول کے خلاف رہا ہے۔ لیکن شاید اسی کا اثر ہے کہ مجھے دوستوں سے اکثر مخلصانہ اعانت حاصل رہی ہے اور اس معاملے میں مجھے مایوسی سے کم سابقہ پڑا ہے۔

میری قوت فیصلہ کمزور تو نہیں، لیکن سست رفتار ضرور ہے یعنی میں کسی اقدام کا فیصلہ قطعی تو کر سکتا ہوں لیکن جلد تر نہیں کر سکتا۔ اور جب پورے غور و فکر کے بعد فیصلہ کر لیتا ہوں تو پھر میرے عزم میں کوئی تامل یا تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔ اور میں پوری قوت و ہمت اس کی کامیابی کے لیے صرف کر دیتا ہوں۔ تکلیفیں آتی ہیں، غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، مایوسیاں راستہ روکتی ہیں، لیکن میں سب تھپیڑوں کو سہتا ہوا اندھا دھند چلا جاتا ہوں۔

میں نے اپنی ذاتی ضروریات کو حتی الوسع سادہ اور محدود رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس رجحان نے مجھے ہر حال میں قانع اور مسرور رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ابنائے زمانہ مادی ترقی و خوشحالی کی حقیقی اہمیت کا اندازہ کریں اور

"جدو جہد" اور "حرص و ہوا" کے درمیان امتیاز کے لیے ایک خط فاصل کھینچیں۔ دولت کی اندھادھند فراہمی، بڑی بڑی جائدادوں اور کارخانوں کی ملکیت اور تسلط و اقتدار کی متواتر بھاگ دوڑ نے نسل انسانی کو اخلاق و معاشری اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ بلکہ انسانیت کی مستقل اور دائمی اقدار کو مجروح کر دیا ہے۔نوع انسان کے حقیقی خیر خواہ وہی لوگ ہیں جو ان اقدار کی بحالی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ اگر سب انسان ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت اختیار کریں، خدمت اور ایثار کو اپنا معمول بنائیں، معاشری ذمہ داریوں کو خندہ پیشانی سے پورا کریں، لڑائی جھگڑے کے رجحانات کو کسی حالت میں سر نہ اٹھانے دیں، انسانی معاشرے میں امن و سکون کے لیے ایثار کریں، سادہ زندگی اختیار کریں، خیالات و افکار کو بلند رکھیں، فنون لطیفہ اور علوم عالیہ کے دوائر میں بہتر سے بہتر تخلیقات کے درپے رہیں تو وہ انفرادی اور نوعی دونوں اعتبار سے کامیاب ہو سکیں گے۔ اور یہ دنیا جس کو حرص و ہوا نے جہنم بنا رکھا ہے، سچ مچ بہشت کا ٹکڑا بن جائے گی۔

سوالات اور مشقیں

۱۔ شرمندہ احسان ہونا، امداد پر تکیہ کرنا، سابقہ پڑنا، غلطی سرزد ہونا کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

۲۔ مافی الضمیر، آلام روزگار، ذکی الحس، جزا و سزا کے معنی پر خوب غور کیجیے اور ایک جملہ ایسا بنائیں جس میں یہ چاروں لفظ استعمال ہو جائیں۔

جسٹس ایس ۔ اے ۔ رحمٰن

(۴)

داستان حیات سے میں نے کیا سیکھا ؟ شاید اس سوال کا جواب آسان نہیں ۔ مظاہر زندگی شعوری اور غیر شعوری دونوں طریقوں سے انسان کے قلب و نظر پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ پھر شعوری اثرات بھی کسی نفسیاتی بھٹی سے گزر کر اپنی ہمیئت بسا اوقات اس طرح تبدیل کر لیتے ہیں کہ انہیں نئے روپ میں پہچان لینا خود فرد کے لیے مشکل ہو جاتا ہے ۔ تاہم یہ کہنا غلط نہیں کہ فرد اور ماحول کی باہمی کشمکش ہر شخص کے لیے ایک راہ عمل متعین کر دیتی ہے جس کے پس منظر میں ایک نظریہ حیات کارفرما ہوتا ہے ۔ خواہ اس کی جزئیات شعور سے بیگانہ رہیں ۔

گزشتہ زندگی کا تجزیہ کرتا ہوں تو پہلی بات جو شعور میں ابھرتی ہے ۔ وہ روایت ہے ۔ جو میں نے والدہ مرحومہ کی زبانی سنی ۔ بچپن ہی سے میں سایہ پدری سے محروم ہو گیا تھا ۔ بیان ہوا کہ والد مرحوم ایک وقت میں ریلوے میں ایک معمولی آسامی پر فائز تھے۔ ان کے اکثر ہم کار، ریلوے سٹور کی چیزیں بغیر اجازت اپنے تصرف میں لاتے تھے ۔ والد مرحوم کا مسلک اس بارے میں اوروں سے مختلف تھا ۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا "میں اپنی حلال کی کمائی میں حرام ملا کر اپنے بچوں کو نہیں کھلانا چاہتا ۔" یہ بات میرے لیے شمع ہدایت بن گئی اور اسے اپنانے سے مجھے قلبی راحت نصیب ہوئی ۔

اس اصول کے ضمیمہ کے طور پر مجھے یہ عملی گر معلوم ہوا کہ اپنا فرض پوری تن دہی سے ادا کرو ۔ لیکن دوسروں

کی کمزوریوں پر انگشت نمائی سے حتی الوسع احتراز کرو۔ ہمسائے کی آنکھ میں تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھ کے شہتیر کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر گرد و پیش کے حالات متزلزل ہوں تو یہ اور بھی ضروری ہے کہ میں اپنی ذات میں ایک نقطہ حیات قائم کروں۔ محاسبہ نفس، اصلاح ملت کی پہلی منزل ہے۔

اس گر کی تہ میں میرا یہ ایقان مضمر ہے کہ ہر انسان میں خیر کا جوہر موجود ہے۔ ہر جوہر کسی آمرانہ نظام کے تحت پنپ نہیں سکتا۔ اس کے لیے آزاد فضا کی ضرورت ہے۔ جو فرد کی اخلاقی صلاحیتوں کو نمو پانے کا موقع دے۔ ایک پائدار معاشرہ آزادی سے اپنائی ہوئی اخلاق اقدار ہی کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے۔ جہاں استبداد کی کڑی زنجیریں دل، دماغ اور زبان کو ماؤف کر دیں۔ وہاں انسان ایک زندہ جھوٹ یا چلتی پھرتی لاش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اصل تہذیب احترام آدم ہے۔ جب دل میں خود داری اور وقار انسانی کا احساس باقی نہ رہے تو برے بھلے کی تمیز بھی اٹھ جاتی ہے۔ اور مصلحت، اخلاق کی مسند لے لیتی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ صحیح اخلاقی اقدار کے بغیر ایک مستقل معاشرے کا تصور ایسا ہی ناممکن ہے جیسا آکسیجن کے اخراج کے بعد کسی جاندار کا ہوا میں سانس لینا۔ بین الاقوامی حلقے میں بھی مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ عالمی بحران کا ذمہ دار ہمارا اخلاق اقدار سے اغماض ہے۔ ہر مملکت قومی مصلحتوں کو آفاقی حقیقتوں کا رنگ دے کر پیش کرتی ہے۔ اہل سیاست کی زبانیں دلوں کی رفیق نہیں۔ سرد جنگ کی ایک وجہ یقیناً وہ شکوک ہیں جو ایک دوسرے کے حالات کی بے خبری پر مبنی ہیں۔ بین الاقوامی اداروں کی افادیت اس بارے میں مسلم ہے۔

لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قوموں کی گروہ بندی بڑی حد تک عظیم طاقتوں کی جنگ اقتدار کی علامت ہے۔ جب تک اقوام عالم ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو ایک ہی اخلاقی میزان میں تولنے کی خوگر نہ ہو جائیں۔ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ عالمی ضمیر کامل طور پر بیدار ہو چکا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ظاہری مناقشات کے باوجود کاروان انسانی اس افق کی جانب رواں ہے جس کے ملحق امن و انصاف کی بستی جلوہ گر ہے۔

سوالات اور مشقیں

۱۔ ذیل کے جملوں کا مطلب وضاحت کے ساتھ لکھیے:

(۱) فرد اور ماحول کی باہمی کشمکش ہر شخص کے لیے ایک راہ عمل متعین کر دیتی ہے، جس کے پس منظر میں ایک نظریہ حیات کار فرما ہوتا ہے۔

(۲) یہ بات میرے لیے شمع ہدایت بن گئی۔

(۳) ہمسائے کی آنکھ کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھ کے شہتیر کی فکر کرنی چاہیے۔

(۴) محاسبہ نفس، اصلاح ملت کی پہلی منزل ہے۔

(۵) جہاں استبداد کی کڑی زنجیریں دل و دماغ اور زبان کو ماؤف کر دیں وہاں انسان ایک زندہ جھوٹ اور چلتی پھرتی لاش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

(۶) اہل سیاست کی زبانیں دلوں کی رفیق نہیں۔

۲۔ ذیل کی ترکیبوں کے معنی اچھی طرح سمجھیے:

عالمی ضمیر، جنگ اقتدار، احترام آدم، اخلاق اقدار، انگشت نمائی سرد جنگ۔

شائستہ سہروردی اکرام اللہ

(۵)

ویسے تو بچپن ہی سے ہمیں اخلاقی اصولوں کی تعلیم دی جاتی ہے - لیکن تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہی کہیں ان کے صحیح معنی ہماری سمجھ میں آتے ہیں - اور پھر ہم ان میں سے چند ایک کو اپنی زندگی کے بنیادی اصول کے طور پر انتخاب کرتے ہیں - میں اپنے تجربے سے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی - نیکی کا بدلہ ملتا ہے اور ضرور ملتا ہے۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ جس سے ہم نے نیکی کی ہے - اسی سے ہمیں نیک بدلہ بھی ملے - بہت دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس سے ہم نے نیکی کی ہو - اس سے نہ صرف نیک بدلہ نہیں ملتا - بلکہ الٹا نقصان اور تکلیف پہنچ جاتی ہے - تاہم نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی - اور وہ لوگ جو مصیبت میں دوسروں کے کام آتے ہیں یا ضرورت کے وقت ان کی مدد کرتے ہیں - انہیں بھی ضرورت کے وقت کوئی نہ کوئی ہمدرد اور مددگار مل جاتا ہے - یہ ہمدرد اور مددگار بسااوقات ان سے اچھی طرح شناسا بھی نہیں ہوتا - اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ قانون فطرت کے مطابق یہ لازم ہے کہ جنھوں نے کبھی کسی اور سے نیکی کی ہو - ضرورت کے وقت دست غیب سے ان کی بھی مدد ہو - جیسا میں پہلے کہہ چکی ہو - میں ذاتی تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں اور میں نے اپنی زندگی میں ایسے واقعات دیکھے ہیں - مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں نیکی کا ایک بیت المال ہے اور ہم سب کا فرض ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ جمع کرتے رہیں - تاکہ اس میں کمی نہ ہونے پائے - اگر ہم نیکی کے بیت المال میں کمی نہ

ہونے دیں گے تو اپنی ضرورت کے وقت ہمیں بھی کوئی کمی محسوس نہ ہوگی ۔

جس طرح میں نے نیکی کو کبھی رائیگاں ہوتے نہیں دیکھا اسی طرح کسی قسم کی "مصلحت اندیشی" کے لیے حق و باطل کے درمیان مفاہمت کی کوشش کو کبھی کامیاب ہوتے نہیں پایا ۔ سیاست کی زندگی میں عموماً اس قسم کی "مصلحت اندیشی" عقلمندی کی دلیل سمجھی جاتی ہے ۔ لوگ اصول اور اخلاق کو آئے دن "مصلحت اندیشی" کے قدموں پر بھینٹ چڑھاتے رہتے ہیں ، لیکن اس کے باوجود ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ جس مقصد اور جس غرض کے لیے "مصلحت اندیشی" کی جاتی ہے ، اس میں بالآخر کامیابی نہیں ہوتی ۔ سیاسی مفاد کے لیے اصول اخلاق کو قربان کر کے جو سمجھوتے ہوتے ہیں ۔ ان کو کبھی پائداری نصیب نہیں ہوتی ۔ بین الاقوامی سیاست پر نظر ڈالیں یا اپنے سیاسی حالات پر غور کریں تو ہمیں "مصلحت اندیشی" کی ناکامی ہی کے ثبوت ملتے ہیں ۔ اس لیے میرا ایمان ہے کہ ۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

میرے لیے یہ دونوں عقیدے مشعل راہ ثابت ہوئے ہیں ۔ اور زندگی کی دشوار اور تاریک راہ گزاروں کو طے کرنے میں مجھے ان سے بہت مدد ملی ہے ۔

مشقیں

۱ ذیل کے جملوں کی تشریح کیجیے :

۱ ۔ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی ۔

۲ ۔ دنیا میں نیکی کا ایک بیت المال ہے ۔ ہم سب کا فرض ہے

کہ اس میں کچھ نہ کچھ جمع کرتے رہیں۔

۳۔ سیاسی مفاد کے لیے اصول اخلاق کو قربان کر کے جو سمجھوتے ہوتے ہیں ان کو کبھی پائداری نصیب نہیں ہوتی۔

۲ اس مضمون میں جو شعر نقل کیا گیا ہے وہ اقبال کی نظم کا ہے جس کا عنوان ہے ''سلطان ٹیپو کی وصیت'' کتاب کے حصہ نظم میں یہ نظم موجود ہے۔ اسے پڑھیے اور یاد کیجیے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

(۶)

اس نصف صدی سے کچھ زیادہ کی زندگی میں میری بہت سی آرزوئیں پوری ہوئیں اور ان سے خوشی بھی حاصل ہوئی۔ لیکن کوئی خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی. ایسے رنج نے تو دو ایک مرتبہ غلبہ پالیا، جس کا کنارہ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن ایسی خوشی کبھی میسر نہ آئی۔ جو کم از کم ابتدا ہی میں لازوال نظر آتی۔

میں نے دیکھا کہ خوشی ہو یا رنج، دونوں روح کو امتحان میں ڈالتے ہیں۔ اس امتحان میں خدا پر بھروسا ہی کام آتا ہے۔ عقل سے تو شاید خدا کا وجود کوئی ثابت نہ کر سکا۔ لیکن جس دل کی گہرائیاں خدا کے وجود کی شاہد ہوں، وہ آزمائش میں شکست نہیں کھاتا۔ اس لیے نہیں کہ ایسی حالت میں خوشی یا رنج کا دل پر اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس وجہ سے کہ خدا پر بھروسا اس کا توازن درست رکھتا ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ کامیابی کا پیمانہ دوسروں کی تعریف یا اپنی سربلندی نہیں ہے۔ حقیقی کامیابی کوشش کی معراج ہے۔ اس سے قلب کو صحیح طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ مجھے زندگی میں کامل کامیابی کا احساس

نہیں ہوا - اس لیے کہ مجھے کامل کوشش کی کبھی توفیق نہیں ہوئی - ہر کوشش میں کہیں نہ کہیں پہنچ کر طبیعت تھک گئی - البتہ میرا دل کامل کوشش کی آرزو سے ابھی تک خالی نہیں ہے - یہ آرزو ہی زندگی کا سہارا ہے ورنہ زندگی کبھی کی بے معنی و مقصد ہو چکی ہوتی -

کامل کوشش کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ، میں نے بے صبری کو پایا - جب کوشش کی تکمیل سے پہلے نتیجے کا انتظار ہو - تو کوشش کا پوری طرح جاری رہنا ناممکن ہو جاتا ہے - اس مرض کا علاج یہ ہے کہ کوشش میں مقصد و منہاج تو پیش نظر رہیں - لیکن نتیجے کی ہوس نہ ہو - جو شخص دل سے "السعی منی والاتمام من اللہ" کا معتقد ہوگا - اس کی کوشش میں استواری پیدا ہوگی اور بے صبری اس سے دور رہے گی -

میرا اگر کوئی کام بگڑا ہے تو بے صبری سے ، میری بہت سی مشکلیں صبر نے حل کر دیں - مثلاً مجھے کبھی کسی کے خلاف سازش کا سلیقہ نہ آیا ، نہ میں سازش کا جواب سازش سے دینے کی قابلیت پیدا کر سکا - لیکن میں نے اکثر دیکھا کہ میرے صبر سے دوسروں کی سازشیں بے کار ثابت ہوئیں اور اگر کینہ ساز کبھی کامیاب بھی ہو گئے تو میری شکست میرے قلب اور میرے صبر کو مجروح نہ کر سکی -

اگر ماحول ناسازگار ہو تو یہ بھی بڑی کامیابی ہے ، کیونکہ اس سے ماحول کو درست کرنے کا بہت بڑا موقع حاصل ہوتا ہے -

البتہ صبر تعطل کا نام نہیں ہے - اگر کوشش کے چھوڑ

دینے کو صبر سمجھا جائے تو پھر صبر زہر قاتل ہے۔ اس لیے کہ کوشش زندگی اور تعطل موت ہے۔

سوالات اور مشقیں

۱ اس عبارت کا ایک ایک لفظ غور سے سمجھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ عبارت کو غور سے پڑھیے اور ذیل کے پاروں کا مطلب سمجھا کر لکھیے :

۱ - میں نے دیکھا .... اس کا توازن درست رکھتا ہے

۲ - میرا عقیدہ ہے .... صحیح طمانیت حاصل ہوتی ہے

۳ - البتہ صبر تعطل .... تعطل موت ہے

۲ غلبہ ، میسر ، لازوال ، توازن ، بے صبری سے جملے بنائیے۔

عبدالحق

ڈاکٹر مولوی عبدالحق (۱۸۷۰-۱۹۶۱ء) ضلع میرٹھ کے قصبے ہاپوڑ میں پیدا ہوئے - والد کا نام شیخ علی حسین تھا - ابتدائی تعلیم پہلے فیروز پور اور پھر علی گڑھ میں حاصل کی - سکول اور کالج کی تعلیم بھی علی گڑھ ہی میں ہوئی اور یہاں انھیں سرسید، سید محمود، محسن الملک اور حالی جیسی عظیم شخصیتوں کی صحبت نصیب ہوئی - ملک اور قوم کے بعض نامور اشخاص مثلاً ڈاکٹر ضیاء الدین، مولانا ظفر علی خاں، میر محفوظ علی، خواجہ غلام الثقلین نقوی وغیرہ ان کے ہم جماعت تھے - ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ سے بی - اے کیا - آگے چل کر علمی خدمات کے صلے میں الہ آباد یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۱ء میں ڈی - لٹ کی ڈگریاں ملیں -

۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک حیدرآباد میں رہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو کے لیے مختلف طرح کی خدمات انجام دیں - ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مقرر ہوئے، ۱۹۳۵ء تک حیدرآباد میں، پھر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک دہلی میں اس خدمت پر فائز رہے - پاکستان بنا تو جنوری ۱۹۴۹ء میں ہجرت کرکے کراچی آ گئے - یہاں انجمن کی بنیاد رکھی اور پہلے اس کے سیکرٹری اور بعد میں، انتقال کے وقت تک اس کے صدر رہے -

مولوی صاحب کی زندگی، خدمت و ایثار اور عزم و استقلال کا مکمل نمونہ ہے - انھوں نے اپنی ساری عمر اردو کی خدمت کرنے اور اس کی ترقی اور بقا کے لیے

طرح طرح کی لڑائیاں لڑنے میں بسر کی ۔ اس خدمت کے صلے میں قوم نے انھیں ''بابائے اردو'' کا لقب دیا ۔

بابائے اردو کا شمار عہد حاضر کے بلند پایہ نثاروں میں ہوتا ہے ۔ انھوں نے اردو کے متعلق لاتعداد تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے ۔ ان مضامین کے کئی مجموعے " خطبات عبدالحق " اور " مقدمات عبدالحق " اور ''تنقیدات عبدالحق'' کے نام سے چھپ چکے ہیں ۔ ''چند ہم عصر'' کے نام سے بھی ایک کتاب چھپی ہے، جس میں مختلف شخصیتوں پر لکھے ہوئے مضامین شامل ہیں ۔ ''نام دیومالی'' اسی کتاب سے لیا گیا ہے ۔ مولوی صاحب نے نثر میں سرسید اور حالی کی پیروی کی ہے ۔ سادگی اور سلاست اس تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔ لیکن سادگی اور سلاست کے باوجود اس میں بڑا زور ہے ۔ ان کی نثر میں کہیں خشکی نہیں ۔ تحریروں میں ہر جگہ شگفتگی موجود ہے ۔ یہ نثر دلی کی ٹکسالی زبان اور روزمرہ کا بہترین نمونہ ہے ۔

★

نام دیو ۔ مالی

نام دیو ، مقبرۂ رابعہ دورانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا ۔ ذات کا ڈھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے ۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے ۔ سچائی ، نیکی ، حسن کسی کی میراث نہیں ۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں ۔

قیس ہو ، کوہ کن ہو ، یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا - میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا - میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام، نام دیو کے سپرد کیا - میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا ۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی - اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا - لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا - بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا یعنی مثلاً - کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے - تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا - پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا - پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا - دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا - یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوتی اور خوشی بھی - کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے - بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے -

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی - یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا مگر اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے - وہ اپنے کام میں مگن رہتا - اس کے کوئی اولاد نہ تھی - وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا - ان کو سرسبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی

ہے ۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا ، ان کو پیار کرتا ، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے ۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے اور پھولتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا تھا ۔ ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی ۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا ۔ یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا ۔ بازار سے دوائیں لاتا ۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا ۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا ۔ اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے ۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا ۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا ۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی شناخت ہو گئی تھی ۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی ۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے ۔ وہ اپنے باغ ہی سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا ۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے ۔ وہ بلا تامل چلا جاتا ، مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہ لیتا ۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا ۔ اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا ۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا ۔ کیا مجال جو کہیں گھاس پھونس یا کنکر پتھر پڑا رہے ۔ روشیں باقاعدہ ، تھانولے درست ، سنچائی اور شاخوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر ، جھاڑنا بہارنا ، صبح و شام روزانہ ، غرض سارے چمن

کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے اندر داروغہ (عبدالرحیم خان فینسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں۔ اور دوسروں سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یا بیڑی پینے لگے یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آتی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے۔ وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار۔ لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا اور وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انھیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا؟ یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی۔ لیکن یہ گدلا پانی پودوں کے حق میں آب حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں

کے پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا ۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے ۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خوش آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سید سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کو تفویض ہوا ۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوق باغبانی مشہور تھا ۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا ۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا ۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سر سبز و شاداب اور آباد نظر آتا ہے ۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا ۔ وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے ۔ اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے ۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا ۔ کئی کئی نگران کار اور بیسیوں مالی ، اور مالی بھی کیسے کیسے ؟ ٹوکیو سے جاپانی ، طہران سے طہرانی اور شام سے شامی آئے تھے ۔ ان کے بڑے ٹھاٹھ تھے ۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اپج تھی ۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے ۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا ۔ اس نے نہ فن باغبانی کی کہیں تعلیم پائی تھی نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا ۔ البتہ کام کی دھن تھی ، کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت تھی ۔ شاہی باغ میں بھی اسی کا کام سہا کاج رہا ۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے ، سیندھی ، شراب پیتے ۔ یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا ۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی ، بس یہ تھا اور اس کا کام ۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی - سب مالی بھاگ کر چھپ گئے - نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے وہ اپنے کام میں لگا رہا - اسے کیا معلوم تھا کہ قضا سر پر کھیل رہی ہے - مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا - اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا - آخر اسی میں جان دے دی - میں کہتا ہوں اسے شہادت نصیب ہوئی -

وہ بہت سادہ مزاج ، بھولا بھالا اور منکسرالمزاج تھا - اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی - چھوٹے ، بڑے ہر ایک سے جھک کے ملتا - غریب تھا اور تنخواہ بھی کم ملتی - اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا - کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا -

گرمی ہو یا جاڑا ، دھوپ ہو یا سایہ وہ دن رات برابر کام کرتا رہا - اسے کبھی یہ خیال نہ آیا - کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے اسی لیے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا - وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا - اسے کسی سے بیر نہ تھا - وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا - وہ غریبوں کی مدد کرتا - وقت پر کام کرتا ، آدمیوں ، جانوروں ، پودوں کی خدمت کرتا ، لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے - نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا - نیکی، نیکی نہیں رہتی -

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں - ہر

شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے - اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے - درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے - لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے - حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تونے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی - وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں - وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا - اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا - اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی -

تھا تو وہ ذات کا ڈھیڑ، پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا -

سوالات اور مشقیں

۱- ذیل کی عبارتوں کا مطلب اچھی طرح سمجھا کر لکھیے :

(الف) "قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے ..... عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں "

(ب) " کام اسی وقت .... بیکار ہے "

(ج) " نیکی اسی وقت تک .... نیکی نہیں رہتی"

۲- اس سبق میں ایک ترکیب استعمال ہوئی ہے "ہمہ تن مصروف " اردو میں اسی طرح کی بعض اور ترکیبیں بھی استعمال ہوتی ہیں جیسے "ہمہ تن گوش" اور "ہمہ تن انتظار" - ان تینوں ترکیبوں سے جملے بنائیے -

۳- اوسان خطا ہونا ، میسر آنا ، خوشی کی لہر دوڑ جانا ، تنگی ترشی ، منکسرالمزاج ، بلا تامل اور ' لبساط سے بڑھ کر ' کو جملوں میں استعمال کیجیے -

۴- سبق میں کچھ لفظ ایسے آئے ہیں جن کے ساتھ " تابع " لگے ہوئے ہیں - انھیں تلاش کرکے اپنے کاپی میں لکھیے -

۵- نام دیو کس لحاظ سے ''نیک'' بھی تھا اور ''بڑا'' بھی ؟

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت (۱۹۰۴-۱۹۵۵ء) ریاست پونچھ کشمیر میں پیدا ہوئے - تعلیم لاہور میں حاصل کی - تعلیم سے فارغ ہو کر ایک سکول میں مدرس ہو گئے - لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اس لیے جلد ہی صحافت سے تعلق پیدا کر لیا - پہلے کلکتہ گئے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ''پیغام'' میں کام کرنے لگے - ۱۹۲۸ء میں مولانا ظفر علی خاں کلکتہ گئے تو انھیں اپنے ساتھ لاہور لے آئے - ''زمیندار'' کے ادارے میں شامل ہو گئے اور اس کا مزاحیہ کالم لکھنے لگے - اس کے بعد کئی اور اخباروں، مثلاً، احسان، احرار اور شہباز میں کام کیا - پھر ایک فکاہی ہفت روزہ ''شیرازہ'' کے نام سے نکالا - اس کے بعد کئی ملازمتیں کیں - پہلے آل انڈیا ریڈیو میں رہے - اس کے بعد حکومت پنجاب کے ہفت روزہ ''پنچایت'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے -

۱۹۳۹ء میں فوجی اخبار کے ایڈیٹر ہوئے اور اس حیثیت سے میجر کے عہدے تک پہنچے - اسی ملازمت کے دوران میں ملایا کا سفر کیا - جنگ ختم ہوئی تو فوج کی ملازمت ختم ہو گئی - اس کے بعد اخبار ''امروز'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے - ۱۹۵۱ء میں پھر ریڈیو کی ملازمت کرلی اور ریڈیو پاکستان کے لیے قومی پروگرام مرتب کرنے لگے - ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو وفات پائی -

مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت پائی - معمولی سے معمولی واقعے میں مزاح کا پہلو پیدا کر لینا ان کے طرز کی نمایاں خصوصیت ہے -

"پربت کی بیٹی" "مردم دیدہ" اور "حرف و حکایت"
ان کی زیادہ مشہور کتابیں ہیں۔

★

خوجی

لیجیے ، ان سے ملیے ان کا نام خوجی ہے۔ وطن لکھنؤ پیشہ امیروں کی مصاحبت ، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں ، چھوٹا سا قد ، کالی کالی رنگت ، گلیور ، صاحب کے سفرنامے میں آپ نے بونوں کی بستی کا حال پڑھا ہوگا۔ میاں خوجی کو دیکھ کر بے اختیار بونے یاد آ جاتے ہیں۔

خوجی کا اصل نام کیا ہے؟ ان کے باپ دادا کون تھے؟ انھوں نے بچپن اور جوانی کا زمانہ کس طرح گزارا؟ یہ باتیں ہمیں معلوم نہیں ، ہاں خود ان کی زبان سے ان کی ابتدائی زندگی اور اصل و نسل کے متعلق بعض باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مثلاً میاں خوجی کا بیان ہے کہ ان کا اصل نام خواجہ بدیع الزمان ہے۔ اودھ کی بادشاہت کے آخری زمانے میں وہ دگلہ والی پلٹن میں کمیدان تھے ، لیکن خوجی کی بات کا کیا اعتبار؟ ہاں اتنا ضرور ہے کہ انھیں اگر خوجی کہہ کر پکارے تو فوراً بگڑ جائیں گے۔

خواجہ بدیع الزماں یا خواجہ صاحب کہیے اور اگر وہ اپنی کمیدانی کا ذکر چھیڑ دیں تو انھیں ٹوکیے نہیں۔ ورنہ لڑ پڑیں گے۔

ایک تو میاں خوجی بالشتیے ہیں۔ اس پر افیون کے رسیا

جب دیکھو آنکھیں بند ہیں - سر گھٹنوں میں جھکا ہوا ہے - باتیں کرتے کرتے افیون پینے کا وقت آ پہنچا - جسم ٹوٹنے لگا - جمائیوں پر جمائیاں چلی آتی ہیں - جب تک چسکی نہ لگائیں یہی حال رہے گا - افیون کے سوا انھیں دنیا بھر میں اور کوئی شوق ہی نہیں - اور یہ شوق بھی ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر پورا ہو جاتا ہے - ان کا کیا ہے ؟ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا - اکیلا دم ہے کسی امیر کے ہاں پڑ رہے - دو وقت کا کھانا اور تھوڑی سی افیون مل گئی اور کیا چاہیے - اور اتنے میں میاں خوجی مسخرا کیا مہنگا ہے ؟ روتوں کو ہنسانا ، ان کا کام ہے - ایک آنکھ سے ہنستے ہیں ، ایک آنکھ سے روتے ہیں - سینکڑوں ہزاروں لطیفے یاد ہیں اور پرانے لطیفوں کو کیا کیجیے گا یہ خود لطیفہ ہیں - فارسی میں بھی شدبد ہے - الٹے سیدھے شعر بھی کہہ لیتے ہیں - پھبتی کہنے میں بھی بند نہیں - غرض میاں خوجی کا دم غنیمت ہے اس قسم کے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں -

میاں خوجی یوں تو ڈیڑھ پسلی کے آدمی ہیں - پھر افیون کا شوق سونے پر سہاگہ - لیکن لڑنے مرنے سے نہیں ڈرتے - ذرا طبیعت کے خلاف کوئی بات ہوئی فوراً لپٹ پڑے - اب چاہے رستم مقابلے پر ہو - کیا مجال کہ قدم پیچھے ہٹے - وہ پیٹتے پیٹتے تھک جائے یہ پٹتے پٹتے نہیں تھکتے - پٹخنیاں کھاتے ہیں - لیکن پھر جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں - خم ٹھونکتے ہیں اور لپٹ جاتے ہیں - جہاں ہاتھ نہیں چلتا - وہاں زبان چلتی ہے - یعنی چیختے ہیں ، چلاتے ہیں ، شور مچاتے ہیں ، اپنی جوانی کے زمانے اور دگلہ والی پلٹن کی کمیدانی

کو یاد کرتے ہیں ۔ افسوس کے لہجے میں کہتے ہیں کہ "نہ ہوئی قرولی ورنہ پیٹ میں بھونک دیتا،، قرولی بڑے شکاری چاقو کو کہتے ہیں ۔ افسوس کہ میاں خوجی کو عمر بھر قرولی میسر نہ آئی ۔

میاں خوجی کو صرف اپنی طاقت ہی پر ناز نہیں ۔ اپنی طرحداری پر بھی گھمنڈ ہے ۔ ہر موقع پر اپنی شکل صورت ، اپنے قد کاٹھ کی تعریف کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے ہیں ۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ لوگ نہ ان کی طرحداری کے قائل نہ پہلوانی کے ۔ جہاں انھوں نے یہ ذکر چھیڑا لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا ۔ اب خوجی اچھلتے ہیں ، کودتے ہیں ، ڈراتے ہیں ، دھمکاتے ہیں ، قرولی کو یاد کرتے ہیں ۔ لیکن لوگ ہیں کہ ہنستے چلے جاتے ہیں ۔

خوجی کی ابتدائی زندگی کا حال معلوم نہیں ۔ ہم نے جب انھیں پہلی دفعہ دیکھا ۔ ان کا بڑھاپا تھا اور لکھنؤ کے ایک خاندانی رئیس کے ہاں ملازم تھے ۔ نواب بڑے بھولے بھالے تھے ۔ مصاحب سب کے سب گرگے ۔ نت نئی تدبیروں سے نواب کو لوٹتے تھے ۔ خوجی بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور لوٹ کے مال میں کچھ حصہ انھیں بھی مل جاتا تھا ۔ اتنے میں نواب کے ہاں ایک نئے مصاحب آئے ۔ نام محمد آزاد لکھنؤ ہی کے رہنے والے تھے ۔ عالم ، فاضل ، شاعر ، انگریزی ، فارسی ، عربی کے ماہر ، پہلوان ، لکڑی ، بانک ، پٹہ اور شمشیرزنی میں طاق ، نواب کو بٹیر بازی کا شوق تھا ۔ اس شوق پر روپے خرچ ہوتے تھے ۔ خاص طور پر ایک بٹیر بہت پیارا تھا اور اس کا نام انھوں نے صف شکن رکھ چھوڑا تھا ۔ آزاد کو دل

لگی جو سوجھی تو صف شکن کو اڑا لیا ۔ اب مصاحبوں نے بھولے نواب کو بنانا شروع کیا ۔ ایک نے کہا ۔ صف شکن بٹیر نہیں تھا ۔ ولی تھا ۔ دوسرا بولا ۔ میں نے اسے نماز پڑھتے دیکھا ہے ۔ تیسرے نے کہا ۔ صف شکن روٹھ کے چلے گئے ہیں میاں آزاد سے کہیے انھیں منا لائیں ۔ غرض آزاد صف شکن شاہ کو منانے کے لیے بھیجے گئے ۔ بیچ میں کئی پیچ ہوئے ۔ اور میاں خوجی نواب کو چھوڑ کر آزاد کے رفیق بن گئے ۔

اب آزاد کی نسبت ایک تعلیم یافتہ لڑکی حسن آرا سے ٹھہری، ان دنوں ترکی اور روس میں جنگ چھڑی ہوئی تھی ۔ بیاہ کی شرط یہ تھی کہ میاں آزاد ترکوں کی فوج میں بھرتی ہوکے لڑیں ۔ جنگ کے بعد ان سے حسن آرا کا بیاہ رچا دیا جائے گا ۔ آزاد ترکی گئے ۔ جنگ میں شریک ہوئے ۔ تمغے لٹکائے واپس آئے اور حسن آرا سے شادی ہو گئی ۔ خوجی اس سفر میں بھی آزاد کے ساتھ تھے ۔ وہ تلواریں مارتے تھے یہ ایک کونے میں بیٹھ کے افیون گھولتے تھے ۔ اور کوئی آفت پڑتی تھی تو لازماً میری "قرولی" کا شور مچاتے تھے ۔

میں نے خوجی کا مختصر حال بتا دیا ۔ اسے سن کر شاید آپ میں سے کسی کو خیال ہو کہ خوجی ایسے دلچسپ آدمی سے ضرور ملنا چاہیے ۔ اور کیا عجب آپ میں سے کوئی صاحب یہ بھی پوچھ بیٹھیں کہ خوجی زندہ ہے یا مر گیا ۔ اور زندہ ہے تو اس سے ملاقات کہاں ہو سکتی ہے ؟ خوجی زندہ تو ضرور ہے اور ابھی بہت مدت تک زندہ رہے گا ۔ یہ نہ سمجھیے کہ لکھنؤ یا دلی کے کسی گلی کوچے ، افیونیوں کی کسی مجلس ، یا امیروں کی کسی محفل میں اس سے ملاقات ہو سکتی

ہے ۔ اس سے ملنے کے لیے آپ کو فسانۂ آزاد کے ورق الٹنے پڑیں گے ۔

فسانۂ آزاد پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصنیف ہے ۔ سرشار لکھنؤ کے رہنے والے تھے ۔ اور یہ کتاب جو بڑی بڑی چار جلدوں میں ہے ، انھوں نے آج سے کوئی ساٹھ برس پہلے لکھی تھی ۔ ان دنوں پرانے زمانے کے امیروں کے دربار قائم تھے ۔ بٹیر بازی اور پتنگ بازی زوروں پر تھی ۔ رئیسوں کو خوشامدی مصاحبوں نے گھیر رکھا تھا ۔ سرشار کی اس کتاب میں اس زمانے کی صحیح زندگی کے نقشے ملتے ہیں ۔

خوجی کی قسم کے مسخرے ، سرشار کی نظر سے ضرور گزرے ہوں گے؟ لیکن خوجی کا پتلا خود سرشار نے تراشا ہے ۔ اور اس میں اس طرح روح پھونک دی ہے کہ وہ سچ مچ چلتا ، پھرتا ، جیتا ، جاگتا ، گوشت اور پوست کا بنا ہوا انسان معلوم ہوتا ہے ۔ خوجی کے حالات پڑھتے وقت ہمیں لمحہ بھر کے لیے بھی یہ خیال نہیں گزرتا کہ وہ صرف کہانی کا مسخرہ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی گھڑنت ہے ۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اسے بارہا گلی کوچوں میں چلتے پھرتے ، قہقہے لگاتے ، ہنستے ہنساتے ، لوگوں سے پٹتے دیکھا ہے ۔ اور ”لانا میری قرولی“ کے نعرے لگاتے سنا ہے ۔ اور سچ پوچھیے تو یہ کمال ہے کہ کوئی قصہ نویس ایسا جیتا جاگتا کاغذی پتلا بنا کے کھڑا کر دے جس پر سچ مچ کے انسان کا گمان ہو ۔

اس سے یہ نہ سمجھیے کہ جو لوگ کہانیاں لکھتے ہیں وہ ایسے ان جانے ، ان بوجھے انسانوں کی خیالی تصویریں کھینچ

دیتے ہیں - وہ خود ان کے تجربے اور مشاہدے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ کہیں سے ایک چیز لیتے ہیں اور کہیں سے دوسری چیز۔ مگر جب انہیں جوڑتے ہیں تو ایسی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ جس پر اصل کا شبہ ہوتا ہے۔ لیکن انسان کے تجربے کے خزانے میں جو کچھ ہے اس سے صحیح کام لینا بھی بڑا ٹیڑھا کام ہے۔ ذرا چوک گئے اور تصویر بے جوڑ نظر آنے لگی۔ مثلاً فسانہ آزاد میں بہت سی تصویریں نظر آتی ہیں - جن میں بعض بالکل بے ڈھنگی ہیں - دور کیوں جائیں - آزاد ہی کو لیجیے - جس کے نام پر اس کتاب کا نام رکھا گیا ہے - آزاد ایسا انسان ہے جس میں دنیا بھر کی خوبیاں موجود ہیں - جو جو فن اسے آتے ہیں انہیں سو برس میں بھی کوئی نہیں سیکھ سکتا۔ پھر بھی وہ ابھی نوجوان ہے - دوسری طرف خوجی ہے جس میں خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی اور دراصل اپنی خامیوں کے باعث ہی وہ سچ مچ کا انسان معلوم ہوتا ہے - تصویر میں آزاد اور خوجی دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہیں - خوجی کے خط و خال ابھرے ابھرے نظر آتے ہیں - آزاد کے چہرے کے نقش مدھم اور پھیکے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خوجی کے مقابلے میں ایک پرچھائیں سی بن کر رہ گیا ہے۔

آزاد قریب قریب مر چکا ہے اور اس میں تھوڑا بہت سانس باقی ہے تو صرف خوجی کی وجہ سے لیکن خوجی زندہ ہے چنانچہ جن لوگوں نے فسانہ آزاد پڑھا ہے وہ لوگوں کی شکل و صورت میں خوجی کے خط و خال ڈھونڈتے ہیں - اور کسی شخص کی شکل ، وضع ، چال ، ڈھال یا خیالات میں خوجی کی سی کوئی بات نظر آتی ہے تو وہ فوراً اسے خوجی کہہ دیتے ہیں

خوجی کے زندہ ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور رہ رہ کے خیال آ رہا ہے کہ کہیں میاں خوجی کی نظر سے یہ مضمون گزرا تو "لانا میری قرولی" کہتے ہوئے دفتر میں نہ گھس پڑیں -

سوالات اور مشقیں

۱ - مضمون نگار نے یہ بات کیوں کہی کہ آزاد قریب قریب مر چکا ہے - اس میں تھوڑا بہت سانس باقی ہے تو صرف خوجی کی وجہ سے ؟

۲ - خوجی کے زندہ ہونے کے مضمون نگار نے کیا ثبوت دیے ہیں -

۳ - خامیاں ، خط و خال ، جیتا جاگتا ، پٹخنیاں کھانا ، ڈیڑھ پسلی کے آدمی سے جملے بنائیے

سر عبدالقادر

عبدالقادر (۱۸۷۴-۱۹۵۰ء) نے ایف - سی -کالج لاہور سے بی - اے کیا اور لاہور کے انگریزی اخبار ''آبزرور'' کے ایڈیٹر ہو گئے - کچھ عرصہ تک اردو کے معروف رسالے ''مخزن'' کے ایڈیٹر بھی رہے- ۱۹۰۴ء میں انگلستان گئے اور ۱۹۰۷ء میں وہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا - عرصے تک بیرسٹری کرتے رہے اور اس میں نمایاں مقام حاصل کیا - ۱۹۲۱ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے - ۱۹۲۳ء میں پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے - ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیم ہوئے - ۱۹۲۶ء میں مجلس اقوام کے اجلاس میں شرکت کی اور واپسی پر پھر لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے - اس کے علاوہ مختلف اعلیٰ سرکاری منصبوں پر فائز رہے اور اپنی خدمات کے صلے میں '' سر '' کا خطاب پایا - ۱۹۵۰ء میں لاہور میں انتقال کیا -

''دربار خلافت'' اور ''سفر یورپ '' کے نام سے ان کے دو سفرنامے چھپ چکے ہیں - مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھے ہیں جن میں سے کچھ ''انتخاب مخزن'' میں شامل ہیں - انگریزی میں اردو کے مشہور ادیبوں پر ایک بہت اچھی کتاب لکھی ہے -

سر عبدالقادر کی تحریروں میں زندگی کے مشاہدات اور تجربات کے متعلق بڑی معلومات افزا باتیں ملتی ہیں - ان کا طرز بیان سادہ ، شگفتہ اور سنجیدہ ہے - الفاظ کو بڑے سلیقے اور احتیاط سے استعمال کرتے ہیں -

استنبول اور اس کے دلچسپ مناظر

مدت سے آرزو تھی کہ استنبول دیکھوں ۔ آخر پوری ہوئی ۔ اب تین ہفتے سے میں ہوں اور استنبول کی گلیاں ۔ نہ وہ ختم ہوتی ہیں نہ میرا شوق ۔ یورپ کے اکثر سیاحوں نے لکھا ہے کہ یہ شہر تو لاجواب ہے ۔ مگر اس کی گلیاں خراب ہیں ۔ گلیوں میں صفائی کا انتظام ٹھیک نہیں ۔ ان سے بدبو آتی ہے ۔ ان میں قدم قدم پر کتے لیٹے رہتے ہیں ۔ یہ سب کچھ سہی لیکن اگر انھیں اس شہر کی بے انتہا دلچسپیوں کی شناخت کے لیے آنکھ دی گئی ہوتی تو وہ ان عیوب سے قطع نظر کرکے اس کے محاسن کو دیکھتے ۔ اور اب بھی کئی قدرشناس سیاحوں نے بے حد داد دی ہے ۔ یہ عیوب عارضی ہیں ۔ بہ نسبت سابق بہت کم ہو گئے ہیں ۔ اور امید ہے کہ دن بدن صفائی میں ترقی اور سڑکوں اور راستوں کی درستی پر زیادہ توجہ ہوتی جائے گی ۔ دیکھنے کی جو چیز اس شہر میں ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بانیوں نے اس کے لیے ایسا موقع ڈھونڈا ہے جس نے اسے سارے جہاں کا انتخاب بنا دیا ہے ۔ ایک طرف ایشیا اپنی قدامت کو سنبھالے کھڑا ہے اور دوسری طرف یورپ اپنی جدت طرازی پر اترا رہا ہے ۔ اور درمیان میں استنبول ہے ۔ گویا ایشیا کا یورپ سے ڈانڈا ملا ہوا ہے ۔ ایک طرف استنبول یورپ کی اقوام مختلفہ کا مرجع ہے اور دوسری طرف ایشیا کی قومیں اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں ۔ خصوصاً ایشیا کی مسلمان اقوام کو اس مقام کی قدرتی خوبیوں اور اس کے تجارتی فوائد کے سوا یہاں مذہبی کشش بھی ہے ۔ مزید برآں خود ملک

کے اندر بھی مختلف مذاہب اور اقوام کی کمی نہیں - نتیجہ یہ ہے کہ

جمگھٹا ہے اس میں ترک و فرس و روم وزنگ کا
یعنی گلدستہ ہے اک گلہائے رنگا رنگ کا

آؤ ، تھوڑی دیر کے لیے اس پل پر کھڑے ہو جائیں ، جو اس خلیج پر بنا ہوا ہے جسے اہل یورپ " شاخ زریں " کے نام سے موسوم کرتے ہیں - دیکھنے کو تو یہ پل پرانا اور خستہ سا ہے اور سنتے ہیں کہ کسی جرمنی کمپنی کو ایک نیا اور شاندار پل بنانے کا ٹھیکہ دیا گیا ہے - مگر اس کی دقیانوسی ساخت سے درگزر کر کے اس انبوہ پر تو نظر ڈالیے جو پل پر سے گزر رہا ہے - بوڑھے ، جوان ، پرانے ، نئے ، عورت ، مرد ، کالے ، گورے ، فرنگستانی اور ایشیائی کس طرح ملے جلے گزر رہے ہیں - کوئی اکڑ کر نہیں چلتا کہ اس مقبول گزرگاہ سے ہو کر نکلنا صرف اسی کے لیے روا ہے - مساوات کے اصول کا حق یہاں ادا کر دیا گیا ہے - اور تصویر کی بوقلمونی درجۂ کمال کو پہنچا دی گئی ہے - اس سے دلآویز تر تصویر چشم تصور نے بھی نہ دیکھی ہو گی - سرخ ترکی ٹوپیاں اور ان کے کالے پھندنے سب سے پہلے اپنی کثرت کی وجہ سے نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں - مگر کسی پرانی وضع کے بزرگ کی خوشنما قبا اور ٹوپی کے گرد سفید عمامے کے پیچ دامن دل کو کھینچتے ہیں - اور آنکھ کو کہتے ہیں کہ دیکھ باوفا اس طرح نباہ کرتے ہیں - زمانہ بدل جائے تو بدل جائے مگر یہ اپنے اصول پر ثابت قدم ہیں - انھیں کے ساتھ وہ سبز عمامے والے حضرت کون گزر رہے ہیں - سبز عمامہ یہاں نشان سیادت ہے - سید سب سبز عمامے پہنتے ہیں اور یہ

امتیاز ان کے لیے مخصوص ہے اور کوئی سبز عمامہ نہیں پہن سکتا۔ اچھا تو یہ حضرت خاندان نبوی کی یادگار ہیں۔ ان کے برابر ایک ٹوپی پوش فرنگی گزر رہا ہے، لیکن کس سادگی سے۔ نہ وہ سمجھتا ہے کہ "ہمچوما دیگرے نیست" نہ ہمارے ان حضرت کو یہ خیال ہے کہ اس سے چھوگئے تو دامن عبا پلید ہو جائے گا۔ سامنے سے ایک ارمنی پادری آ رہا ہے۔ سیاہ چوغہ، کھلی آستین، سیاہ اونچی ٹوپی، بہت بڑی ڈاڑھی اور بال لمبے، جنھیں وہ چوٹی کی طرح لپیٹ کر پیچھے لٹکائے ہوئے ہے۔ یہ نئی چیز دیکھنے میں آئی۔ یہی وہ عالی جناب ہیں جو اکثر چپکے چپکے بکھیڑے کر دیا کرتے ہیں۔ اس وقت تو بہت بھولے بھالے غریب نظر آتے ہیں۔ اور نہایت امن پسندی سے جا رہے ہیں مگر ہیں طرفہ معجون مرکب۔عادات میں مشرقی۔ تعصب میں مغربی، آزادی کی اہلیت کم، مگر شوق زیادہ۔ لیکن ان کے دیکھنے میں کون زیادہ وقت صرف کرے۔ ان سے بڑھ کر ایک قابل توجہ نظارہ موجود ہے۔ وہ سیاہ ریشمی برقعے سے کیا چلے آ رہے ہیں۔ آہا یہ ترک مستورات ہیں۔ ترکوں کی اکثر رسمیں مغربی اور مشرقی تمدن کی ترکیب سے پیدا ہوئی ہیں۔ انھیں میں ان کا پردہ ہے جو نہ ہندوستان کے مسلمان شرفا کے ہاں کے پردے کی طرح حد سے بڑھا ہوا ہے اور نہ یورپ کی بے پردہ قوموں کی عورتوں اور مردوں کے بے باکانہ خلا ملا کی اجازت دیتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ ترکی عورتیں اپنے خاص برقعے پہن کر گھر سے نکلتی ہیں۔ بازار میں سودے خریدتی ہیں۔ ریل پر سوار ہوتی ہیں۔ جہاز پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہیں۔ مگر کیا ریل پر کیا جہاز میں ان کے لیے مردوں سے علیحدہ جگہ بنی

ہوئی ہے۔ برقعہ عموماً ریشمی ہوتا ہے اور وہ کام دیتا ہے جو ایک نہایت کھلی ساڑھی (جو انگریزی لباس کے اوپر اس لباس کو ڈھانپنے کے لیے باندھ لی جاتی ہے) دے سکے۔ ایک سیاہ ریشم کا نقاب منہ پر پڑا رہتا ہے۔ گو بعض سن رسیدہ عورات یا بعض منچلی نوجوان عورتیں اسے اٹھا کر بھی چلتی ہیں۔ مستورات کے اس جھنڈ میں جو نظر آ رہا تھا۔ ایک حبشی عورت بھی ہے جو منہ سے نقاب الٹے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ یہ کوئی خادمہ ہے جسے انھوں نے ساتھ لے لیا ہے۔ لیکن حبشی عورت اپنے ملک کی اکیلی قائم مقام نہیں۔ جو اس پل پر اس وقت چل رہی ہے۔ دو تین حبشی مرد بھی چلے جا رہے ہیں۔ وہی چپٹی ناک وہی، سفید، نہایت سفید دانت، وہی موٹے موٹے ہونٹ، لباس پورا ترکی، یعنی عمدہ یورپین فیشن کا کوٹ پتلون اور اس پر ترکی ٹوپی۔ صورت سے خوشحال معلوم ہوتے ہیں۔ ایک کی جیب سے سونے کی زنجیر بھی آویزاں ہے یہ کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں؟ کسی سے پوچھو تو سہی۔ جواب ملتا ہے کام یہ کیا کریں گے۔ یہ کسی بڑے حرم کے خواجہ سرا ہیں۔ چونکہ یہ قدیم رسم بڑے بڑے گھروں میں اب تک باقی ہے۔ یہ چند نمونے رہگزاروں کے جو ہم نے انتخاب کیے۔ ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سب سفید پوش اور خوشحال ہی پل پر سے گزرتے ہیں۔ پھٹے پرانے کپڑوں والا غریب سائل بھی وہیں ہے۔ ایک طرف ایک نابینا حافظ قرآن، آیات قرآنی باآواز بلند پڑھ رہا ہے کہ کوئی اس کی حالت پر رحم کھائے اور اسے کچھ دے جائے۔ کہیں مٹھائی والا مٹھائی بیچ رہا ہے، کہیں شربت والا شربت پینے کے لیے ہر ایک کو بلاتا ہے۔ ایک

سقہ بھی ہے جو محض ٹھنڈا پانی پلا کر دھیلا پیسا لے لیتا ہے۔ مگر یہ سقہ ہمارے ہاں کے سقے کی طرح ایک بھاری چمڑے کی کھال کندھوں پر لادے ہوئے نہیں ہے بلکہ ایک شیشہ پانی کا ہاتھ میں لیے ہے جو ہمارے ہاں کے گلاب یا بید مشک کے شیشے کی طرح ٹوکرے میں رکھا ہوا ہے اور اس سے پانی نکال نکال کر گلاسوں میں لوگوں کو پلاتا ہے۔ غرض استنبول کے اس ایک مقام کی رنگا رنگی کے بیان سے قلم عاجز ہے۔ بہتر ہے کہ اب اس منظر کو چھوڑ کر کسی اور منظر کو لیں۔

پل کے وسط کے قریب جہاں ہم کھڑے ہیں، دیکھ رہے ہیں، ایک کھڑکی کے گرد ہجوم ہے۔ لوگ کہیں جانے کے لیے ٹکٹ لے رہے ہیں۔ آئیے ہم بھی ٹکٹ لے لیں۔ ٹکٹ گھر کے پاس چند زینے نیچے اتر کر ایک سیڑھی لگی ہے اس سے تختہ جہاز پر چڑھ جائیے۔ جہاز دخانی ہے۔ اسے عربی اور ترکی میں "وابور" کہتے ہیں (یہ لفظ اصل میں فرانسیسی سے لیا گیا ہے) یہ جہاز مخصوصہ کمپنی کا ہے جس کے جہاز استنبول کے قرب و جوار میں دن میں کئی دفعہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کا انتظام خاصہ ہے۔ اسی قسم کے جہازوں سے جو ہم نے اور جگہ دیکھے ہیں، کسی طرح برے نہیں۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں بجائے ایک خاص حصہ جہاز میں گراں قیمت پر ملنے کے تختہ جہاز پر ارزاں بکتی ہیں۔ مسافروں کی آسائش کے لیے متفرق چیزیں بیچنے والی کمپنی کی اجازت سے جہاز پر آ جاتے ہیں۔ اور لوگ بیٹھے کھاتے پیتے چلے جاتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ جہاز سقوطری کی طرف سے جسے اسکودار بھی کہتے ہیں اور جو قسطنطنیہ کا ایشیائی حصہ ہے، جا رہا

ہے - چلے کو بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ ہم ساحل ایشیا پر آ پہنچے - کیا کہوں - کن خیالات کا ہجوم اس وقت دل پر ہوا - جس دن سے خاک پاک ایشیا کو چھوڑ کو یورپ آیا ہوں اس دن سے اس مبارک سرزمین کے ساتھ محبت اور بڑھ گئی ہے - خیال آیا کہ گو وطن سے ایشیا کا یہ گوشہ نہایت دور ہے پھر بھی ایشیا ہے جسے دو سال بعد دیکھنا نصیب ہوا ہے - اس سے مسرت ہوئی - ساتھ ہی خیال آیا کہ ابھی پھر یورپ واپس جانا ہے اور وطن پہنچنے میں ابھی عرصہ باقی ہے ، اس سے قلق ہوا - اتنے میں عقل نے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ لندن بیٹھے وطن سے جتنی دور تھے ، دونوں کے حساب سے دیکھو تو ایشیا کے اس کنارے پر اس سے زیادہ دور ہو - اگر بغداد کی ریل بن چکی ہوتی - جب کسی قدر قریب ہوتے - آخر سب خیالات اور دلائل پر یہ خیال غالب آیا کہ یہ ایشیا ہے - اگر اس میں کچھ شک بھی ہوتا تو چند قدم چلنے میں شک رفع ہو جاتا - گاڑیاں ایشیائی وضع کی مسافروں کو لینے کے لیے کھڑی ہیں - گاڑیوں والے مسافروں کو بلانے میں اسی طرح ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے - گاڑیوں کے اڈے سے آگے چلیں تو کئی دکانیں میوہ اور سبزی بیچنے والوں کی ہیں - کہیں خربوزوں کے ڈھیر زمین پر لگے ہوئے ہیں - کہیں تربوزوں کے - غریب لوگ وہیں خرید کر پاس بیٹھے کھا رہے ہیں - نانبائی کی دکان پر نان کباب گرما گرم کی دعوت ہو رہی ہے سگ و درویش شہر کے یورپی حصے میں بھی موجود تھے - مگر معلوم ہوتا تھا کہ پہچانتے ہیں کہ یورپ میں ہیں - یہاں وہ آگاہ معلوم ہوتے ہیں کہ ایشیا ہے اور وہ آزاد ہیں - اور کوئی آزاد ہو نہ ہو -

شہر کا چکر ختم کر کے بیرون شہر نکل جائیں تو عجیب و عبرت خیز نظارہ پیش نظر ہوتا ہے۔ اسکودار کا قبرستان میلوں میں ہے اور سرو جو یہاں خفتگان خاک کی پاسبانی کرتے ہیں سمندر ہی سے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس قبرستان کی تاریخ تو خدا ہی جانے۔ صدیوں سے آباد ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے جیسے شہر میں زندہ کوئی نہیں ہو گا اور شہر کی آبادی دیکھ کر (خدا اسے زخم چشم عالم سے بچائے) یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی مرتا نہیں۔ ان قبروں کو ذرا غور سے دیکھنے سے پہلے ایک فاتحہ پڑھ کر ان دلیروں کے حق میں دعائے مغفرت کر لیں جنھوں نے زمانہ گزشتہ میں اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر ایشیا کا سکہ یورپ کے دل پر بٹھانے کی خاطر سرحد یورپ کو اپنا مدفن بنایا۔ فاتحہ پڑھتے وقت حضور قلب حاصل کرنے کے لیے آنکھ خرد بخود بند ہو گئی۔ بعد فاتحہ جو آنکھ کھلی تو یہاں کے قبرستان کا ایک نیا دستور نظر آیا۔ ہر قبر پر ایک بڑا سا پتھر کا کتبہ استادہ ہے جس پر عربی یا ترکی میں مرحوم کے اوصاف لکھے ہیں۔ اور اسکے لیے دعائے خیر لکھی ہے۔ اور اس پتھر کے سر پر یا عمامے کی صورت ہے یا ترکی ٹوپی کی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تربت میں مرد مدفون ہے۔ عورتوں کی تربت کے لیے نشان جدا ہے جو عموماً سنہری سا پھول ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی عورت بیاہ کے بغیر مر گئی ہو تو اس کے کتبے کی زینت خاص کوشش سے کی جاتی ہے۔ گویا جس زینت سے وہ محروم ہو گئی۔ اس کا کچھ حصہ اس کے مدفن کو دیا جاتا ہے۔ مجھے یہ رسم نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ گو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے جائز یا ناجائز، مناسب یا

نامناسب ہونے کے متعلق بزرگان دین کی کیا رائے ہے؟ -

یاد رفتگان گو ہمارا ایک فرض ہے اور اسی لیے اس کو ادا کرنا لازم سمجھا - لیکن زندوں کو زندوں سے زیادہ کام ہے اور میں جانتا ہوں کہ اکثر احباب کہیں گے کہ مناظر کے ذکر میں پہلے ہی اسے قبرستان کہاں سے یاد آ گیا - اچھا تو آئیے اپنی کوفت رفع کر لیجیے - جہاز کا وقت آ گیا - اس میں سوار ہو لیجیے - سستا لیجیے - کچھ برف وغیرہ کا شوق ہو تو کھا لیجیے - ایک یا دو گھنٹے میں آپ کو پھر پل پر لے چلتا ہوں اور اس پر سے استنبول کی طرف جاتے ہوئے جو پہلا قہوہ خانہ آئے گا وہاں آپ کو بٹھا دوں گا - بیٹھے بیٹھے جہاز کی سیر کرتے رہیے گا - استنبول میں یوں تو سینکڑوں رستوران یورپی نمونے کے ہیں مگر ان کی کیفیت عام طور پر معلوم ہے - کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے اور نہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں - ہاں ترکی قہوہ خانہ یہاں کا اعجوبہ ہے - فرانس اور انگلستان وغیرہ میں جو رونق شراب خانوں کو ہے - وہ یہاں قہوہ خانوں کو ہے - جس طرح وہاں غریب سے غریب مزدور بھی تھوڑی سی شراب پینے شراب خانے میں ضرور جاتا ہے - اسی طرح یہاں کے مزدوری پیشہ اور کام کاج والے لوگ اور بہت سے بیکار لوگ بھی قہوہ خانے کو رونق دیتے ہیں -

تیسرے پہر قہوہ چی یعنی قہوہ بیچنے والا چھوٹے چھوٹے رسیوں سے بنے ہوئے مونڈھے دکان کے باہر فرش پر قطار در قطار رکھ دیتا ہے - یہاں تک کہ راستہ قریب قریب رک جاتا ہے - اور لوگ آ کر ان پر بیٹھنے شروع ہوتے ہیں - کوئی تو دن بھر کی محنت سے تھک کر آتے ہیں اور آرام کے مستحق ہوتے ہیں -

کوئی گھر کے آرام سے اکتا کر نکل آتے ہیں کہ رہگزر کے تماشے میں دل بہلائیں گے - وہیں حقہ پیتے ہیں، وہیں قہوے کی کئی کئی پیالیاں پی جاتے ہیں اور اکثر ہاتھ میں تسبیح لیے آتے ہیں - اسے بھی ہلاتے رہتے ہیں - یہاں عجیب عجیب فیشن نظر آتے ہیں - ایک کا انداز دوسرے سے جدا ہوتا ہے - مگر عادات میں اتحاد ہے - شطرنج کا شوق بہت عام ہے - اور ہر قہوہ خانے میں کئی کئی شطرنج بچھے رہتے ہیں اور ہر وقت لوگ کھیلتے رہتے ہیں - آپ کو اگر قہوے کا شوق نہیں تو شربت یا کوئی اور چیز مانگ لیجیے اور اس گروہ کا جو یہاں جمع ہو رہا ہے - جزو بن جائیے - پھر دیکھیے اگر گھنٹوں بیٹھنے کے بعد بھی آپ کا جی اکتا جائے - تو کہیے - طرح طرح کے لوگ سامنے سے گزر رہے ہیں - وہ آپ کو تماشا سمجھتے ہیں اور گھورتے ہیں آپ انھیں تماشا سمجھیے - عوض معاوضہ گلہ ندارد -

سوالات اور مشقیں

۱ - استنبول کو مضمون نگار نے گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ کیوں کہا ہے ؟

۲ - اسکودار کا قبرستان دیکھ کر مضمون نگار کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ شہر میں کوئی زندہ نہیں ہوگا ؟

۳ - قبرستان میں پہنچ کر مضمون نگار کے دل میں فاتحہ پڑھنے کا خیال کیوں پیدا ہوا ؟

۴ - قدرشناس ، مرجع ، دقیانوسی ، خلاملا ، سفید پوش اور قرب و جوار کو جملوں میں استعمال کیجیے -

۵ - مندرجہ ذیل لفظوں میں سے جو جمع ہیں اُن کے واحد اور جو واحد ہیں اُن کی جمع بتائیے -

محاسن - عیوب - موقع - اقوام - فائدہ - مذاہب ، حضرت - وقت ، شرفا اور دلائل -

پطرس بخاری

یہ پطرس بخاری کا ایک خط ہے ۔ ان کے حالات اور ان کا ایک مضمون " بچے" آپ اس کتاب کے آئندہ صفحوں میں پڑھیں گے ۔

سفر انگلستان

۱۰ ستمبر ۱۹۳۶ء دو بجے دوپہر

امتیاز بھائی[۱] ! یہ خط بحیرہ احمر میں ایک ایسے مقام سے لکھ رہا ہوں جو عدن سے ۹۰۰ میل کے فاصلے پر ہے ۔ ذرا اندازہ لگاؤ ۔ میں اس وقت بمبئی سے ڈھائی ہزار میل کے فاصلے پر ہوں ۔ جو پشاور سے ڈیڑھ ہزار میل دور ہے اور ابھی منزل مقصود کا پتہ ہی نہیں ۔ اسے کہتے ہیں سفر ۔ لاہور سے امرتسر کا سفر اس کے مقابلے میں چہل قدمی سا معلوم ہوتا ہے ۔

خیر اپنی داستان کو ابتدا سے شروع کروں ۔ بمبئی پہنچے تو کمپنی والوں کی طرف سے نوٹس ملا کہ یکم ستمبر کو جہاز پر پہنچ جائیں ۔ ڈاکٹری معائنہ ہوگا ۔ ہمارا ٹمپریچر آگے ہی ڈانواں ڈول ہو رہا تھا ۔ دعائیں مانگتا گیا ۔ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ معائنہ ہے جو جہازوں کے قوانین کے مطابق ہر جہاز کی روانگی سے پیشتر ہونا ضروری ہے ۔ اس معائنے کی کیفیت میں یونہی بیان کر سکتا ہوں کہ جس کی نبض چلتی ہے اسے تو جانے دیتے ہیں جس کی نبض بند ہو اسے کمپنی ہی میں روک لیتے ہیں ۔

جہاز پر سوار ہوئے تو بھانت بھانت کے جانور دکھائی دیے ۔ ہندوستانیوں کی تعداد میری توقعات سے بہت زیادہ تھی ۔

---

۱ ۔ یہ خط سید امتیاز علی تاج کو لکھا گیا تھا ۔

بنگال ، مدراس ، پنجاب ، یوپی ، بمبئی سبھی صوبوں کے لوگ تھے - لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر ایک صوبے کی گورنمنٹ نے اپنے ہاں کے سب سے بڑے چغدوں کو چن کر بھیجا ہے - ایک سے ایک نرالی صورت کا آدمی اور ان میں سے ہر ایک اپنی وضع کی انگریزی بولتا ہے - بعض انسان نما حیوان ہیں کہ پھولوں سے لدے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور رومال سے آنسو پونچھ رہے ہیں - بعض ایسے ہیں جو اپنے آپ کو بہت "ایٹ ہوم" ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اس اظہار کے لیے بھی کبھی ادھر سے آدھر اور کبھی آدھر سے ادھر تیز تیز قدم اٹھائے نکل جاتے ہیں - جیسے جہاز کے انتظام و انصرام میں مصروف ہوں -

آخر جہاز روانہ ہوا - اور جہاز پر سے بھی ساحل پر سے بھی رومال ہلنے شروع ہوئے - کئی دیسی شرفا معلوم ہوتے ہیں ، برسوں سے رومال ہلانے کے انتظار میں تھے - دل کھول کر "رومال لائے" ان میں سے ان کا اضطراب دیکھنے کے قابل تھا ، جو اپنی سب جیبوں کو ٹٹول رہے ہیں اور رومال نہیں ملتا - اور جب کسی حضرت کا رومال ہاتھ سے چھوٹ کر سمندر میں گر جاتا تو ان کی خفت قابل دید ہوتی - جب ساحل آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو یہ طوفان بد تمیزی تھما - اب جہاز کی کیفیت یہ ہے کہ ہر فرد بشر کرسی بچھائے جہاز پر بیٹھا ہے - اور سمندر کو دیکھ رہا ہے - چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل میں کہہ رہے ہیں اچھا تو گویا سمندر یہ ہے - تو گویا اب ہم سمندر میں ہیں - بھئی ! بہت اچھے ! جو دوست ہیں وہ ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں اور ابھی سے وینس ، لندن اور ایڈنبرا کے متعلق نہایت واقف کارانہ انداز میں اور بے پروائی کے لہجے میں

گفتگو کر رہے ہیں - ایک کونے میں ، میں بھی بیٹھا سمندر کو دیکھ رہا تھا -

تھوڑی دیر میں ہم ساحل سے بہت دور نکل گئے - ہوا تیز ہونے لگی اور سمندر یوں معلوم ہونے لگا جیسے کسی گھٹیا سے مصور نے کوئی تصویر کھینچی ہے - بھوک کے مارے آنتیں قل ھواللہ پڑھنے لگیں - اور میں بے صبری سے کھانے کا انتظار کرنے لگا - میں دور افق کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ یک لخت معلوم ہوا جیسے افق کچھ ٹیڑھا سا ہو گیا ہے - جیسے ترازو کی ڈنڈی ایک طرف کو جھکی ہوئی نظر آتی ہو - لمحے بھر کے بعد آپ دوسری طرف کو جھک گئے - ایک دو منٹ نہ گزرے تھے کہ ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے دفعتاً ٹخنوں اور گھٹنوں کے پیچ ڈھیلے کر دیے ہوں - معدے میں ایک برف کا گولہ بہت زور سے نیچے کو گرا - انتڑیوں نے اچھل کر پھیپھڑوں کے ایک گھونسا مارا اور کھوپڑی کے اندر بھیجے نے آہستہ آہستہ پنڈولم کی طرح جھولنا شروع کر دیا اور پھر قے -

یہ ابتدائے عشق تھی - ہم بھاگے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے - اور بستر پر چت لیٹ کر اس شخص کے خاندان بھر کو کوسنے لگے - جس نے ہمیں ولایت آنے کا مشورہ دیا تھا - بس امتیاز ! کچھ مت پوچھ - دنیا میں ایسی تکلیف دہ بیماری کوئی نہ ہو گی - موت بھی خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہے - مجھے کمرے میں پہنچے ہوئے چار پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ نزدیک و دور سے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں - اور تھوڑی دیر میں ہر طرف سے قے کی صدائیں بلند ہوئیں - معلوم ہوتا تھا جیسے توپ خانہ داغا جا رہا ہے -

جب کھانے کی گھنٹی بجی تو تمام جہاز چت پڑا تھا ۔
"کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی"

پانچ دن رات میں بستر میں پڑا رہا ۔ دوسرے دن شام کو ڈاکٹر کو بلایا ۔ ایک فرانسیسی لونڈا سا ہے ۔ شکل ہیرلڈ لائڈ سے بہت ملتی ہے ۔ انھوں نے آتے ہی بے تحاشا فرنچ [1] شروع کردی ۔ اور بیس منٹ تک برابر بکتا رہا ۔ اتنا سمجھ میں آیا کہ انجکشن کریں گے ۔ چنانچہ کیا ۔ اس سے قے تو بند ہو گئی ۔ لیکن دماغ برابر جھولا جھول رہا تھا ۔ سمندر میں بہت بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں اور جہاز پر جیسے وجد کی کیفیت طاری ہو ۔ ہر لمحہ طوفان بڑھتا ہی چلا جاتا تھا ۔ چھٹے دن کچھ افاقہ ہوا ۔ تو ہم ہمت کر کے تختہ جہاز پر پہنچے اور ایک کرسی پر لیٹ گئے ۔ ہماری طرح اور بھی کشتگان ناز باری باری باہر نکل رہے تھے ۔ شکلیں چوہوں کی سی بنی ہوئی تھیں ۔ چال جیسے ہوا میں تنکا اڑتا ہوا جا رہا ہو ۔ جہاں بیٹھتے تھے، بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لیتے تھے ۔ لیکن طوفان کے تھمتے ہی طبیعت فوراً ٹھیک ہو گئی ۔ اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہی اس قدر زور کی بھوک لگنے لگی کہ عمر بھر نہ لگی تھی ۔ جہاز پر دن میں پانچ دفعہ کھانے پر جمع ہوتے ہیں ۔ مجھے نہیں یاد کہ کسی وقت بھی کھانے کے کمرے میں بے تابانہ داخل نہ ہوا ہوں ۔

کھانے کے کمرے کی دنیا ہی نرالی ہے ۔ ہندوستانی بھائیوں کے لیے اس کمرے کے اندر طرح طرح کی مایوسیوں ، بے عزتیوں اور خفتوں کے سامان موجود ہیں ۔ سمجھ میں نہیں

---

۱ ۔ فرانسیسی زبان۔

آتا کہ جو لوگ اتنے عرصے سے ولایت آنے کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ چھری کانٹے کے استعمال کی مشق کیوں نہیں کرلیتے - اور انگریزی کھانے کے آداب و قواعد کیوں نہیں سیکھ لیتے ؟ ویشنو[1] حضرات کے لیے اور بھی مصیبت ہے - بار بار پوچھتے ہیں کہ اس میں گوشت کی تو کوئی آمیزش نہیں - اس میں یخنی تو نہیں ڈالتے - یہ چربی میں پکا ہے یا مکھن میں - آئس کریم میں انڈے تو نہیں پڑتے - ٹفن اور ڈنر پر دس دس بارہ بارہ قسم کے کھانے ہوتے ہیں - لیکن ان بے چاروں کے پلے ایک دو ابلی ہوئی ترکاریوں سے زیادہ نہیں پڑتا - ہونقوں کی طرح سے چھری اور کانٹے دونوں کو بائیں ہاتھ میں تھامے رہتے ہیں - اور دائیں ہاتھ کے ساتھ چمچے سے کھائے جاتے ہیں - آئس کریم کے چمچے کو نمک کاھویا میں ڈال دیتے ہیں - اور نمک کے چمچے سے آئس کریم کھانے لگ جاتے ہیں - پھر کھاتے کھاتے ہر وقت مجرم نظروں سے دائیں بائیں جھانکتے رہتے ہیں - کسی کو دائیں ہاتھ میں چھری پکڑے دیکھا تو خود بھی دائیں ہاتھ میں پکڑلی اور پھر جو کسی کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے ہے تو بائیں ہاتھ میں منتقل کرلی -

عدن پہنچے تو ساحل پر گئے - ہم چار آدمیوں نے مل کر ایک ٹیکسی کرائے پر لی - جس پر سوار ہو کر ہم عدن اور عدن کے گردو نواح ۲۵ میل گھومے - اس کا کرایہ کوئی ایک پونڈ کے قریب بنا - وہ غوطہ لگانے والے لڑکے، جتیرا تلاش کیا کہیں نظر نہ آئے - خدا جانے متقدمیں یونہی گپیں ہانکتے تھے یا اب ان کی نسل ہی ناپید ہو گئی ہے - عدن ،

۱- جو لوگ گوشت نہیں کھاتے -

ہندوستان کے عام شہروں کی نسبت بہت ستھرا شہر ہے - لیکن بہت بے رونق سا مقام ہے - پارسیوں کی دکانیں جا بجا نظر آتی ہیں - عدن میں پہنچ کر ٹکٹ وغیرہ خریدے اور خط پوسٹ کیے - تمھیں ایک پوسٹ کارڈ بھیجا تھا - جس پر میرے جہاز کی تصویر تھی - امید ہے ، ملا ہوگا -

یہاں سے ۷ ستمبر کو دن کے بارہ بجے روانہ ہوئے اور بحیرہ احمر میں داخل ہوئے - جہاں کی گرمی توقع سے بہت ہی کم ہے - البتہ رات کو کمرے کے اندر نہیں سویا جاتا - دن بھر سب سے اوپر کے تختے پر کرسی بچھائے بیٹھا رہتا ہوں اور رات بستر بچھا کر سوتا ہوں - طلوع اور غروب کے نظارے بسااوقات بہت ہی شاندار ہوتے ہیں ، وسیع سمندر ، وسیع آسمان ، اور آفتاب کا بہت بڑا آتشیں گولہ - جب صبح ہوتی ہے یا شام پڑتی ہے تو روح جیسے پھیلنے لگ جاتی ہے -

ایک دن، رات کو جزیرہ پیرم کے پاس سے گزرے - جزیرے کے ایک سرے پر لائٹ ہوس ہے ، جس کی روشنی ایک ایک منٹ کے وقفے کے بعد چمکتی ہے اور جزیرے سے لے کر جہاز تک ایک چمکتی ہوئی شاہراہ بچھا دیتی ہے - گھٹاٹوپ اندھیرے میں جزیرے کے پہلوں کی مدھم سی قطار دکھائی دیتی تھی یہ تمام نظارہ کچھ ایسا پراسرار معلوم ہوتا تھا کہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا -

جب سے سمندر کا طوفان بند ہوا ہے - ہر روز رات کو سینما کا تماشا اور ناچ ہوتا ہے - کھانے ہی پر دعوتی رقعہ مل جاتا ہے - ایک پروگرام میں تمھیں اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں - تماشا جہاز کے تختے پر ہوتا ہے نہ کہ بند کمرے

میں اور مفت ہوتا ہے۔ اچھا خاصا لطف رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ ایک بڑا گراموفون بمنزلہ بینڈ کے بجتا ہے۔ اس پروگرام کی فلم نمبر ۲ ہیرلڈلائڈ کا کامک تھا۔ دل بہلاوے کو کافی سامان ہے۔

اب ہم بحیرہ احمر میں ہیں۔ مکے اور مدینے کے عرض بلد سے اوپر گزر چکے ہیں۔ شروع شروع میں ساحل عرب کے پاس اکثر جزیرے نظر آتے رہے، اب کوئی ساحل نظر نہیں آتا۔ کل دوپہر کو سویز پہنچنے کی توقع ہے۔ پرسوں پورٹ سعید۔ جہاں یہ خط پوسٹ کروں گا۔ ہوا بہت خوشگوار اور فرحت افزا ہے۔ سمندر کا رنگ بالکل سلیٹ کا سا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی ہیں اور افق تک جا بجا سفید جھاگ کے گالے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاز تھوڑا سا ڈگمگانے لگ گیا ہے جس کی وجہ سے لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

روانہ ہونے سے پہلے تمھیں یاد ہوگا۔ میں نے اسی کمپنی کے پراسپکٹس منگائے تھے۔ ان میں لکھا تھا کہ جہاز پر انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مسافر تو انگریزی بول بھی لیتے ہیں اور سمجھ بھی لیتے ہیں ورنہ جہاز کے افسر اور ملازم بس اشارے۔

بہت سی باتیں کہنے کو ہیں۔ خطوں کے بس کا روگ نہیں۔ واپس انشاء اللہ پہنچوں گا تو سناؤں گا۔ ہزارہا لطیفے ہیں جو عمر بھر نہ بھولیں گے۔ قبلہ مولوی صاحب، حیدر علی صاحب، سالک صاحب، جگل صاحب، اختر صاحب، حفیظ صاحب سب کو میرا نیازمندانہ سلام۔ بہت یاد آتے ہیں۔ کیا کروں۔

خاکسار

بخاری

سوالات اور مشقیں

۱ - لاہور سے امرتسر تک کے سفر کو ''چہل قدمی'' کہنے کا کیا مطلب ہے ؟

۲ - خط کے تیسرے پارے میں جن لوگوں کا حال بڑے دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے ان کا حال آپ اپنے لفظوں میں لکھیے -

۳ - خط کے آخر میں یہ کیوں کہا گیا ہے کہ باتیں خطوں کے بس کا روگ نہیں -

۴ - جملوں میں استعمال کیجیے :-

بھانت، بھالت کے ، قابل دید، تکلیف دہ، وجد کی کیفیت ، پلے پڑنا اور گھٹا ٹوپ -

۵ - خط میں کئی جگہ بہت اچھی تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں ان جملوں کو اپنی کاپی میں لکھیے اور ان کا مطلب آسان لفظوں میں بیان کیجیے -

جاپانی گھر

یہ مضمون بیگم اختر ریاض الدین کے سفر نامے "سات سمندر پار" سے لیا گیا ہے - سفرنامے میں ٹوکیو ، ماسکو ، لینن گراڈ اور قاہرہ کے علاوہ "کراچی سے نیپلز" اور "لندن سے نیویارک" تک کے حالات سفر بڑے دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں -

ان کے دوسرے سفرنامے کا نام "دھنک پر قدم" ہے - جس طرح نام خوبصورت ہے اسی طرح اس کتاب میں چھپے ہوئے ہوائی ، لندن ، میکسیکو ، سان فرانسسکو ، نیو یارک اور ہانگ کانگ کے حالات بھی بے حد دلکش ہیں - اس کتاب پر مصنفہ کو ایک سال پانچ ہزار روپے کا آدم جی انعام ملا تھا -

مجھے جاپانی گھر دیکھنے کا بہت شوق تھا ، کئی لوگوں سے کہا کہ اپنے گھر دکھاؤ مگر وہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گئے - جاپانی جب باہر والوں کو بلائیں گے تو ہوٹل یا کلب میں ، کبھی گھر پر دعوت نہیں دیتے ، شاید ان کا خیال ہے کہ ہم جنگلی، ان کے نازک نازک نفیس گھروں کو تہ و بالا کر دیں گے ، جاپانی صدیوں تک باہر کی دنیا سے کنارہ کش رہے ہیں اور صرف پچھلے اسی سال سے انھوں نے اپنے معاشرے کے دروازے باہر والوں کے لیے کھولے ہیں ، لیکن ان کے گھروں کے دروازے ابھی تک بند ہیں - خیر میں نے بھی ڈھیٹ بن کر ایک گھر تو جھانک ہی لیا ، برآمدے اور باورچی خانے میں نہایت عمدہ لکڑی کا فرش، ٹائیلوں کی چھتیں ، کمروں کے بیچ میں دیواریں ندارد ، ہلکے ہلکے کاغذ کے

دروازے جو ادھر ادھر کھسک جاتے ہیں اور ہٹائے بھی جا سکتے ہیں ۔ تاکہ کمرہ جس ناپ کا بنانا ہو بنا لیا جائے ۔ کمرے میں خوبصورت چٹائیاں بچھی ہوئی ، کوئی فرنیچر فالتو نہیں ، محرابی صورت کا ایک گوشہ، عبادت کے لیے مخصوص ہے جہاں ایک نہایت حسین طغریٰ ٹنگا رہتا ہے ، خوبصورت گلدان میں پھول ، وہاں گھر والے خاموش بیٹھ کر دعائیں مانگتے ہیں ، یا دل و دماغ کو سکون دیتے ہیں ، خوشحال گھرانوں میں ایک مغربی طرز کا کمرہ ضرور ہوتا ہے جس میں میز کرسیاں اور صوفے ہوتے ہیں ۔

جاپانی کمرے کا یہ فائدہ ہے کہ اسے کئی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے، سونا ، کھانا ، بیٹھنا ، کھیلنا ، پڑھنا ، سب کچھ ایک کمرے میں ممکن ہے ۔ ہمارے ایک سویڈش[۱] دوست سے جب ایک ہوٹل والے نے پوچھا کہ آپ مغربی کمرہ لیں گے یا جاپانی ، تو وہ کچھ ترنگ اور کچھ تکلف میں بولے "جاپانی" ۔ اندر پہنچ کر انہیں محسوس ہوا کہ اگر ذرا سا سر اٹھایا تو چھت بھی ساتھ اٹھ جائے گی ، ذرا ہلے تو گھر ہل جائے گا ، بچارا گھٹنوں کے بل چلتا تھا ، گھٹنوں کے بل حجامت بناتا تھا ۔ اتنے لطیف و نازک گھر میں انسان اپنے آپ کو خواہ مخواہ ایک بے ہنگم حیوان تصور کرنے لگتا ہے ۔ اور آئینہ بھی ڈر ڈر کر دیکھتا ہے کہ کہیں سینگ نہ نکل آئے ہوں ۔

سرزمین جاپان آتش فشاں پہاڑوں پر واقع ہوئی ہے ۔ اس لیے زلزلہ کے ڈر سے عام گھر ہلکے ہلکے بنائے جاتے ہیں

۱۔ سویڈن کا باشندہ

میرے سامنے بھی زلزلہ کے دو زبردست جھٹکے لگے تھے اور ساری عمارت دو منٹ تک ایک مدہوش شرابی کی طرح جھومتی رہی تھی - میرے منہ سے تو بے ساختہ چیخ نکل گئی لیکن چاروں طرف دیکھا تو عورتیں بدستور اپنے کام کر رہی تھیں -

جب کسی عورت کو ہم بدصورت نہیں کہنا چاہتے تو یہی کہہ دیتے ہیں کہ اس کی شکل اللہ کی بنائی ہوئی ہے - ٹوکیو کی شکل بھی اللہ کی بنائی ہوتی ہے - ۱۸۸۸ء میں کیوٹو کی بجائے ٹوکیو حکومت کا مرکز قرار دیا گیا اور جب سے اس کے شہری نقشہ میں کوئی ترتیب نمودار نہیں ہوئی ، ہر طرف سے ایک ناتراشیدہ درخت کے مانند اس کی شاخیں بے تحاشا پھیلتی جا رہی ہیں - پانی کا سمندر تو دیکھا تھا مگر انسانوں کا سمندر جاپان میں دیکھا - یہ انسانی سمندر دفتر کے اوقات میں ٹیکسیوں ، کاروں ، رکشاؤں میں شور مچاتا ہوا بہتا چلا جاتا ہے - ٹیکسیاں شہر کے ہر حصے میں ہزارہا ہیں - میں نے امریکہ میں بھی ان کی اتنی افراط نہیں دیکھی - موٹروں کی کسی قطار میں عموماً پچاس ٹیکسیاں اور دس ذاتی کاریں ہوتی ہیں اور بڑی سڑکوں پر چھ چھ ایسی قطاریں - ہجوم کے وقت ہر دو منٹ کے بعد ٹریفک پانچ منٹ تک رکا رہتا ہے یعنی بہتر یہی ہوتا ہے کہ انسان پیدل چل لے - کار کی رفتار سے پانچ منٹ کا راستہ عموماً آدھے گھنٹہ میں طے ہوتا ہے - اس لیے لوگ دن کے خاص اژدحامی گھنٹوں میں نکلتے ڈرتے ہیں - یہ تکلیف صنعتی ترقی کی پہلی قیمت ہے ، ٹوکیو میں ٹیکسی شاید دنیا بھر سے ارزاں ہے - روپے سوا روپے میں آپ کو ٹیکسی والا

کہاں سے کہاں پہنچا دے گا۔ لیکن اس میں دو اور امکانات بھی ہیں ۔ اول تو غلط پتہ پر پہنچائے گا یا پھر عالم فنا میں پہنچا کے دم لے گا۔

اگر آپ اس کی تیز رفتاری کے باوجود اپنی جان صحیح سلامت واپس لے آئے تو یا آپ کا امام ضامن نہایت زبردست ہوگا یا پھر ٹیکسی کی بریکیں ۔ میں تو اپنا سانس روک کر ٹیکسی میں بیٹھتی تھی اور آیۃالکرسی کے بجائے یٰسین پڑھا کرتی تھی کہ موت سامنے منڈلاتی نظر آتی تھی ۔ ٹیکسی ڈرائیور کسی انجمن خودکشی کا رکن رکین معلوم ہوتا ہے جو اپنی جان دینے اور دوسروں کی لینے پر تلا رہتا ہے ۔ یہ طوفانی پتلا ہزارہا کاروں اور بسوں کو چیرتا ہوا یوں نکلتا ہے کہ سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ جاتا ہے اور اس صورت حال کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ آپ اس گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اپنا وصیت نامہ لکھ کر منیجر کے سپرد کر آئیں ۔

جاپان کے "مکی موٹو" موتی دنیا بھر میں مشہور ہیں ۔ میں نے ان کی دکان پر ہزارہا لڑیاں مختلف قیتموں اور قسموں کی دیکھیں ، پچاس روپیہ کی لڑی سے لے کر پانچ لاکھ تک کی لڑی بھی تھی ۔ غریب کی گردن میں پچاس ہزار کی لڑی پانچ سو ہی کی لگے اور کسی سیٹھانی کی گردن میں پانچ روپے کی دس ہزار کی لگے ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اصل نقل کا فرق صرف پہچان والے ہی بتا سکتے ہیں ۔ مجھے تو سارے موتی ایک ہی صدف سے نکلے ہوئے معلوم ہو رہے تھے ۔ چنانچہ میں نے موتی کا ایک دانہ بھی نہ لیا ۔ ویسے جاپان میں انسان اپنے آپ کو لکھ پتی محسوس کرنے لگتا ہے ۔ ایک انگریزی پونڈ جو

اندازاً سوا تیرہ روپیہ کا ہوتا ہے ، اس کے بدلے جاپانی سکے میں ایک ہزار "ین" ملتے ہیں ، اس لیے میرا بٹوا ہمیشہ پچاس ساٹھ ہزار "ین" سے بھرا رہتا تھا اور میں اپنے آپ کو رئیسہ سمجھ کر سر اونچا کر کے چلتی تھی ۔

ٹوکیو میں خرید و فروخت کا مزہ اس لیے زیادہ آتا ہے کہ اشیاء کی تعداد بہت زیادہ ہے ، دکانیں حسین ، بیچنے والیاں ، خندہ لب اور خوبرو ، اس پر طرہ یہ ہے کہ دو پیسے کی چیز کو بھی نہایت نفاست سے نہایت دل کش کاغذ میں ربن سے لپیٹ کر دیں گی ، اکثر وہ کاغذ اس قدر حسین رنگ اور نمونے کا ہوتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ کھول کر اندر نظر نہ ڈالی جائے یا کاغذ رکھ لے اور چیز پھینک دے ۔

جاپانی رسم چائے کے سمجھنے کے اور سراہنے کے لیے پہلے اپنا طریقہ چائے نوشی دیکھنا ضروری ہے ۔ انگریز ہمارے لیے دو بہترین روایتیں چھوڑ گئے ہیں ۔ ایک ڈپٹی کمشنر اور دوسرے لپٹن کی چائے ۔ پہلی کا حشر قریب ہے ، دوسری نے حشر برپا کر رکھا ہے ۔ یہ لپٹن تو قوم کو ایسی لپٹی ہے کہ دیہاتی بھی اس کے چسکے میں پڑ گئے ہیں ۔ خیر ، تو انگریز نے چائے چھوڑی ، پر چائے پینے کا کوئی ڈھنگ یا سلیقہ نہ چھوڑا ۔ چائے آب خوروں میں پی ، گلاسوں میں پی ، دودھ کے جگ میں پی ، حجامت کے ڈونگے میں پی ۔ کچھ پہلوان تو بالٹیوں سے منہ لگا کے پی جاتے ہیں ۔ بعض کفایت شعار پیالیاں خریدتے ہی نہیں ۔ سیدھا طشتریوں سے چائے سڑپ لیتے ہیں ۔ سگریٹ پان ساتھ ساتھ چل رہا ہے ۔ اور منہ کے ساتھ زبان بھی چل رہی ہے ۔ اس کے برعکس ، جاپانی رسم چائے ملاحظہ ہو ۔

اول تو چائے ایک رسم ہے، مشروبات میں تو اتفاقاً شامل ہوگئی ہے - سولھویں صدی میں اس کے بنانے، بانٹنے اور پینے کے باقاعدہ قانون اور اصول لکھے گئے تھے - اگر وہ قواعد پڑھیے تو آنکھیں گھوم کر سر پر، اور سر گھوم کر کیتلی پر - رگ ویدا کے منتردہرانے آسان ہیں، لیکن اس رسم چائے کے اصول یاد رکھنے مشکل، خیر آپ ڈریے نہیں، ہم کب یہ رسم ادا کرنے لگے ہیں؟ بہر حال ان سب حکایات کا ایک مقصد ہے اور وہ ہے جسمانی، روحانی اور ذہنی سکون اور توازن کا قیام - یعنی چائے ایک قسم کا یوگا ہے جو آسن جما کر آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ بوند بوند پورا ہوتا ہے - خیر سامعین تو بعد میں آئیں گے پہلے چائے کے لوازم ملاحظہ کیجیے -

سیاہ لوہے کی ایک بھاری انگیٹھی، ٹین کے ڈبوں میں بند پسی ہوئی چائے، سبز پاوڈر کی طرح - کئی قسم کے بانس کے چمچے - خوبصورت چینی کے کئی گول پیالے جن پر نہایت حسین منظر کھینچے ہوں پھینٹنے کے لیے بانس کی ایک مدھانی اور کچھ مٹھائی - اور ان سب لوازم کے سامنے چائے کی دیوی گڑیا کی طرح سجی ہوئی بیٹھی ہے - اسے بچپن سے چائے بنانے کا راز سربستہ بتایا گیا ہے - ہر چمچہ کس طرح اپنی جگہ سے اٹھایا جاتا ہے، کس طرح رکھا جاتا ہے؟ - پھر سبز چائے کا پوڈر کس طرح پھینٹا جاتا ہے اور کس طرح اس میں گرم پانی ڈالا جاتا ہے - پھر یہ محلول کس طرح پیالیوں میں ڈالا جاتا ہے اور کس طرح مہمانوں کو پکڑایا جاتا ہے - اور پھر کس طرح مہمان اس حسین پیالی کے رنگ اور نمونے کو سراہتا اور پیالی ہاتھ میں لے کر گھماتا ہے - ہر حرکت کے لیے الگ قانون اور

سلیقہ ہے ذرا سی بھی غلطی کی گنجائش نہیں۔ سامعین خاموش بیٹھے ہیں ۔ یہ رسم ہر نئے مہمان کے لیے ادا کی جاتی ہے۔ ہر گھر میں ہوتی ہے۔ ہر باغ میں ہوتی ہے۔ بڑی بڑی دکانوں میں ہوتی ہے۔ اس سے کہیں فرار نہیں اور اسے مذہبی وقار دیا گیا ہے اور اس کے لیے اک فضا قائم کی جاتی ہے۔ اگر چائے باغ کے پاس نہیں جا سکتی تو باغ چائے کے پاس آ جاتا ہے۔

جاپانی باغ کا چل کر آ جانا مشکل بھی نہیں۔ ایک چٹائی، مٹی کا ایک ڈلا، تھوڑا سا پانی، ننھا سا فون اور پھول اگر باغ نہ بھی ہو کم سے کم گلدان سامنے ہو اور ایک خوبصورت سا نوشتہ ہو جس کے رنگین منظر پر ٹکیاں جمی ہوں۔ سب اس سے محظوظ ہو رہے ہوں اور چائے نوش فرما رہے ہوں یہ سب تو ہوا، لیکن خود یہ چائے کس قماش کی ہے، کس مزے کی ہے؟ دیکھنے میں پسی ہوئی مہندی اور پینے میں کونین، جاپان میں جس رفتار سے یہ پی جاتی ہے ملیریا کا نام و نشان مٹ جانا چاہیے۔ کسی مچھر کی شامت ہی آئے جو جاپانی خون چوسے۔ کم بخت باری کے لرزے میں چل بسے گا۔ ویسے تو یہ چائے قہوہ کی طرح رقیق ہوتی ہے لیکن خاص مہمانوں کے لیے خوب گاڑھی بنائی جاتی ہے اور اس میں خوشبو بھی مہندی جیسی ہوتی ہے۔ جس وقت یہ گاڑھا گاڑھا گرم جوشاندہ میرے سامنے پیالی میں آیا تو میں نے سہم کر میاں کو دیکھا۔ انھوں نے گھورا کہ پی جاؤ۔ آخر سقراط نے بھی تو دل رکھنے کو زہر کا پیالہ پی ہی لیا تھا۔ میں نے منہ میں الٹایا تو نہ اگلے بنے، نہ نگلے۔ پیٹ کی انتڑیاں کھنچ

کر باہر ، اس پر تازیانہ یہ کہ فوٹو گرافر کیمرہ تانے کھڑا تھا ۔ کھگھیا کر جھوٹی ہنسی ہنس دی ۔ وہ فوٹو اس وقت بھی میرے پاس ہے ۔ آنکھوں میں حقیقت ، ہونٹوں پر فریب ، خدا دشمن کو بھی وہ کڑوی زہر گاڑھی مہندی نہ پلوائے ۔ لیکن اس سبز چائے نے میرا پیچھا نہ چھوڑا ، ہر ہوٹل میں سب سے پہلے یہ میز پر دھر دی جاتی ہے ۔ بڑے ریسٹورانوں میں ہر میز پر مفت ، جگوں اور کیتلیوں میں بھری رکھی ہوئی ہے ۔ لوگ پانی کی طرح غٹا غٹ پئے جاتے ہیں اللہ انھیں عالم غیب سے پورا پورا اجر دے ۔

سوالات اور مشقیں

(۱) ذیل کے لفظوں کو اس طرح جملوں میں استعمال کیجیے کہ ان کے معنی واضح ہو جائیں :
تہ و بالا ۔ کنارہ کش ۔ بے ساختہ ۔ عالم فنا ۔ خندہ لب ۔ خوبرو ۔ عالم غیب ۔

(۲) ''کسی مچھر کی شامت ہی آئے جو جاپانی خون چوسے، کم بخت باری کے لرزے میں چل بسے گا '' - - - ایک خاص بات اس جملے میں کتنی خوبصورتی سے کہی گئی ہے ۔ اس میں ہلکا سا مزاح بھی ہے اور طنز بھی - - ۔ مضمون میں اسی طرح کے بہت سے جملے ہیں ۔ ایسے چند جملے چھانٹ کر اپنی کاپی میں لکھیے ۔

(۳) سبق مین ایک جملہ آیا ہے ''یہ صنعتی ترقی کی پہلی قیمت ہے'' اس جملے پر غور کیجیے اور اس کی وضاحت مثالیں دے کر کیجیے ۔

(۴) ''میں تو اپنا سانس روک کر ٹیکسی میں بیٹھتی تھی اور آیتہ الکرسی کے بجائے یٰسین پڑھا کرتی تھی '' پہلے معلوم کیجیے کہ آیتہ الکرسی اور یٰسین (جو قرآن کی دو سورتوں کے نام ہیں) مسلمان کس کس وقت پڑھتے ہیں اور اس جملے کا مطلب سمجھا کر لکھیے ۔

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی ضلع جونپور کے ایک گاؤں میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے - میٹرک ہائی سکول جونپور سے کیا - ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے اور وہاں کے ہاسٹل "کچی بارک" میں جگہ ملی - اس کچی بارک پر "گل منزل" کے نام سے کئی مضامین کالج میگزین میں لکھے - انھیں مضامین کی بدولت انھیں پہلے پہل اردو کے مزاح نگاروں اور طنز نگاروں میں جگہ ملی - رفتہ رفتہ یہ رنگ اتنا نکھرا کہ رشید صاحب کو اپنے زمانے کے بہترین مزاح نگار اور طنز نگار سمجھا جانے لگا -

۱۹۲۱ء میں رشید صاحب نے فارسی میں ایم-اے کیا اور کالج میں استاد مقرر ہوگئے - استاد کی حیثیت اور مضمون نگار کی حیثیت سے رشید صاحب ہندوستان کے ہر حصے میں مشہور تھے اور لوگ بڑے اشتیاق سے ان کی تحریروں کا انتظار کرتے تھے - آج تک یہی حال ہے - ان کے لکھے ہوئے چند صفحے بھی کہیں مل جائیں تو لوگ انھیں بڑے شوق اور بڑے احترام کے ساتھ پڑھتے ہیں -

علی گڑھ کی زندگی اور علی گڑھ کی شخصیتوں کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بدولت علی گڑھ کی زندگی اور ان کی بہت سی شخصیتوں کے کارنامے ہمیشہ کے لیے ادب کا حصہ بن گئے ہیں - رشید صاحب کی تحریروں میں مزاح اور طنز کا اتنا لطیف امتزاج ہے کہ ان کے ایک ایک جملے میں پڑھنے والوں کو اچھے شعر کا لطف ملتا ہے - اعلیٰ درجے کی ادبیت اور شگفتگی ان کے مزاح اور طنز کی نمایاں

خصوصیات ہیں ۔

طنزیات و مضحکات ، گنج ہائے گرانمایہ ، مضامین رشید اور خنداں، ان کی اہم تصنیفات ہیں ۔ آخری دو کتابیں مضامین کے مجموعے ہیں ۔ مضمون ''دعوت'' ان کی کتاب ''خنداں'' سے لیا گیا ہے ۔

★

دعوت

ایک مثل مشہور ہے '' مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ مثل بھی عام ہونی چاہیے ''مجھے دعوتوں سے بچاؤ '' گو دوستوں سے بچنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ دعوتوں سے بھی نجات مل جائے گی !

بھوک کی مانند دعوتوں کا بھی یہ حال ہے کہ اس کا نہ کوئی وقت مقرر ہے اور نہ موقع ۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہوگا :

کلبۂ افلاس میں ، دولت کے کاشانے میں بھوک
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں بھوک
بھوک ہے ہنگامہ آرا ، قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے ، بھوک کی آغوش میں

تیوہار، تقریب ہو ، کوئی مہمان آیا ہو ، کوئی چل بسا ہو ، رقعہ دعوت بہر حال موجود ہے اور ایک بزرگ نے تو جوش میں آ کر اس کی فرمائش کر دی :

''براہ کرم تناول ماحضر فرمائیے''

دعوت میں نہ جائیے تو غرور یا بے توجہی کی شکایت ، جو جائیے تو معدہ اور عاقبت دونوں خراب ۔

مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے جس جس قسم کی اور جن جن مواقع پر دعوت کھائی ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی - سب سے پہلی دعوت مجھے خوب یاد ہے - گو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ میرے کسی بزرگ کی دعوت رہی ہو اور وہ مجھے اسی اصول پر بن بلائے ساتھ لے گئے ہوں جس اصول پر ریل میں کرایہ نہیں ادا کرنا پڑتا - یعنی معصوموں کے لیے نہ کرایہ ادا کرنے کی ضرورت ہے نہ رقعہ دعوت کی -

بعض ریلوے لائنوں کا تو مجھے حال معلوم ہے کہ وہاں فی گاڑی دو سادھو کے حساب سے مفت سفر کیا جا سکتا ہے - ادھر کے کوئی ٹکٹ کلکٹر اس لائن پر مامور ہوئے - انھوں نے ایک بزرگ کو بے ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑا تو انھوں نے نہایت گھور کر عارفانہ ڈانٹ کے ساتھ کہا ، ابھی سراپ دوں گا ، بھسم ہو جائے گا - جانتا نہیں "فی گاڑی دو سادھو !" بیچارے ٹکٹ کلکٹر ایسے مبہوت ہوئے کہ گاڑی کے نیچے کٹتے کٹتے بچے -

ہاں تو پہلی دعوت مجھے ایسے صاحب کے ہاں کھانی پڑی جو کپڑے بنتے تھے - غازی میاں کے معتقد تھے - راہ نجات پڑھتے تھے اور کوکین بیچنے میں سزا پا چکے تھے - ساری بستی مدعو تھی - مئی کا مہینہ تھا اور دوپہر کا وقت ، مکان و میدان کا کوئی نشیب و فراز ایسا نہ تھا جہاں کھانے والے نہ بیٹھے ہوں - فرش و دسترخوان کا کوئی دستور نہ تھا - جس کو جہاں جگہ مل گئی بیٹھ گیا - ایک نیم کی جڑ میں ، میں بھی بیٹھ رہا - ایک ہاتھ میں گرم گرم تنوری روٹی دے دی گئی ، مٹی کے

ایک برتن میں زمین پر سالن رکھ دیا گیا۔ بہشتی نے مشک سے تام چینی کے گندے شکستہ گلاس میں پانی پلانا شروع کر دیا۔

سامنے ایک نیازمند کتے صاحب موجود تھے۔ دم ٹانگوں کے درمیان، خود، دو زانو بیٹھے ہوئے نظریں نیچی، بہت کچھ بھوکی، چہرہ اور جسم پر اہنسا کے غیرفانی نقوش، جن پر مکھیاں مصروف غزلخوانی اور بحیثیت مجموعی داغ کا ایک مصرعہ۔ ع

"نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے"

پاس ہی ایک بوڑھے کھانستے جاتے تھے اور خلال کرتے جاتے تھے۔ نانی گود میں، پوتا کندھے پر، پوتے نے ایک ہڈی کتے کے سامنے پھینک دی۔ اب معلوم ہوا کہ ایک اور کتے صاحب کہیں قریب ہی مراقبہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جنھوں نے یک لخت غرا کر جست کی ہے تو میرے مقابل کے کتے پر آ گرے۔ لیکن جست کے دوران میں دادا، نانا، پوتا، نانی کے پورے شجرۂ نسب کو ڈھاتے گئے۔ خلال، دادا یا نانا کے گلے میں جا پھنسا اور پوتے نانی میرے سالن میں آ رہے۔ ایک ہلڑ مچا۔ مشہور ہوا کہ مہتو دادا پر غازی[۱] میاں آ گئے۔ سارے کھانے والے بھاگ کھڑے ہوئے۔

یہ تو میرے ایام جاہلیت کا قصہ تھا۔ ہوش سنبھالا تو ایک مشہور شہر میں ڈیپوٹیشن پر جانے کا اتفاق ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ شام کو وہاں کی مشہور مسجد کے امام صاحب کے ہاں افطار پر ہم سب مدعو تھے۔ جہاں ایک ہجوم تھا۔

۱۔ ایک مشہور بزرگ غازی مسعود سالار جن کا مزار ہندوستان کے مشہور شہر بہرائچ میں ہے۔

ہمارے سامنے بھی افطاری رکھ دی گئی ۔ ابھی ہم سب نے مشکل سے دو ایک لقمے فرو کیے ہوں گے کہ ایک حملہ ہوا ۔ چند سورما ہم پر ٹوٹ پڑے اور جو کچھ سامنے تھا اسے چٹ کر کے آگے بڑھ گئے ۔ معلوم ہوا کہ وہاں کا یہی دستور تھا کہ جو چاہے جس کے سامنے سے افطاری اُچک لے ۔ ایسا کرنے سے میزبان کو ثواب ملتا ہے ۔ ہمارے ساتھ ایک روہیل کھنڈی پٹھان طالب علم تھے ۔ وہ بڑے متحیر ہوئے ۔ ان کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس واقعہ کو نظرانداز نہ کریں گے ۔ جب نماز کے لیے لوگ کھڑے ہوئے اور ہر شخص نیت باندھ چکا تو انھوں نے اپنی ٹوپی تو جیب میں رکھی اور سامنے سے ایک نمازی کی پگڑی اچک کر اپنے سر پر رکھ لی اور سلام پھیرتے ہی اسے چھت سے نیچے پھینک دیا ۔ جہاں ہزاروں فقیر ٹوٹ پڑے اور آناً فاناً پگڑی کا تبرک تقسیم ہو گیا ۔ جھگڑا بڑھا تو انھوں نے فرمایا ۔ ہماری طرف دستور ہے کہ نماز میں جس کا عمامہ چاہے اچک لے ۔ نماز کے بعد وہی عمامہ غربا میں لٹوا دیا جاتا ہے ۔ اس عمامے کے جتنے پرزے ہوتے ہیں اتنے ہی ہزار محل اور باغات امام کو جنت میں ملتے ہیں ۔ اس کی دھجیاں بچوں کے گلے میں ڈال دی جائیں تو ام الصبیان[1] نہیں ہوتا ۔ جوان باندھ لیں تو ان پر جیل خانہ حرام ہو جاتا ہے ۔ بوڑھے استعمال کریں تو آنتیں اترنے سے محفوظ رہتی ہیں ۔ بہر حال امام صاحب کے کہنے سننے سے معاملہ رفت گزشت ہو گیا ۔

رات کو دعوت تھی ۔ سارے مہمان دو زانو بیٹھے ، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مارسڈن صاحب کی تاریخ ہند میں

۱- بچوں کی بیماری جسے سوکھا کہتے ہیں ۔

ٹھگوں کا گروپ ہے - ہم سب بھی بیٹھ گئے - ایک بڑی سینی میں اہرام مصر بنا ہوا تھا جس کے اوپر ایک دیگچی شوربے کی انڈیل دی گئی - لوگ سینی پر ٹوٹ پڑے اور براہ راست دست بدہن ہو گئے - دست بدہن کو آپ " ہینڈ ٹو ماؤتھ " کا مرادف تصور فرمائیں - ہمارے روہیل کھنڈی دوست چپ چاپ بیٹھے رہے - میزبان تو انھیں دیکھ کر خاموش رہے ، لیکن ایک بزرگ جن کی ڈاڑھی چاولوں کی مالا بن گئی تھی اور شوربا گنگا جمنی خضاب کی بہار دکھا رہا تھا، قاب سے سر اٹھائے بغیر بولے - "کھاؤ سیٹھ صاحب ، کھاؤ ، نہیں تو ایک مسلمان کا مال جائع ہو گا " - دوست بولے - " بالکل درست لیکن دوسرے مسلمان کی جان بھی تو جائع ہو گی " -

وہاں کے زمانۂ قیام ہی میں ایک اور جگہ سے دعوت نامہ آیا - ہمارے میزبان وہاں کے معزز اور دولت مند ترین لوگوں میں سے تھے - میزبانی کے فرائض خاتون خانہ ادا کر رہی تھی - ڈرائنگ روم میں پہنچے تو دن کو تارے نظر آنے لگے - ایسی خوبصورت ، قیمتی ، پرتکلف اور نایاب چیزیں ایک ساتھ کب دیکھنی نصیب ہوئی تھیں - البتہ ان کا تذکرہ میلادوں میں سنا تھا یا طلسم ہوش ربا میں پڑھا تھا - مالک مکان سے زیادہ پرشوکت اور شعرافگن نوکر ، نوکرانیاں تھیں - یہ شعرافگن نورجہاں کے پہلے شوہر نہیں بلکہ ہمارے اردو شعرا کی اولاد قسم کی چیز ہے - کس کی تعظیم کیجیے اور کس سے تعظیم لیجیے - کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ شاید دنیا کے سب سے بڑے آدمی کے سب سے بڑے شفاخانے میں آپریشن ہونے والا ہے - ہر طرف سوائے صفائی اور

سامان جراحی کے کچھ نظر نہ آتا تھا ۔ اول تو کھانے کا گونگ بجا تو ہم نے سمجھا ۔ ہماری روح قبض کرنے کا کوئی آلہ ایجاد ہوا ہے ۔ میز کے قریب آئے تو ایک مثنوی زہر عشق قسم کی صنف نازک نے ہمارے بیٹھنے کی کرسی کھینچی ۔ معاً خیال آیا کہ آگے بڑھ کر کہوں ۔ "اے قبلہ! یہ آپ کیوں کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہیں ۔ لیکن سیاست دربان سے ڈرا[1] ۔ اور خاموش رہ گیا ۔ جب ہم میز سے متصل ہوئے تو اس نے کرسی ہم سے متصل کر دی ۔ میں اس آداب سے واقف نہ تھا اور پھر کچھ سہما ہوا بھی تھا ۔ اس لیے کرسی پر پورا بوجھ دینے کی بجائے اپنے ہی پاؤں پر زور دے رکھا تھا ۔ بس یوں سمجھ لیجیے ۔ گویا کوئی نہایت سبک سوار جاکی گھوڑے پر بیٹھا ہو اور روانہ ہونے کے اشارے کا منتظر ہو ۔ آپ یقین مانیے ۔ "کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا" سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ کھانا ایسے ایسے یونیفارم یا لباس فاخرہ یا ملبوسات عروسی میں لایا جاتا تھا کہ یہ طے کرنے میں دشواری ہوتی کہ ان پر حملہ کیا جائے یا ان کی عبادت کی جائے ۔ یا پھر کھڑے ہو کر قومی ترانہ گایا جائے ۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ کس آلے سے کس چیز پر حملہ کیا جائے ۔ اس لیے کہ جان لینے کے لیے تو آپ آزاد ہیں ۔ جو آلہ چاہیے شوق سے استعمال کیجیے ۔ لیکن کھانوں کے لیے تو مخصوص آلات مقرر ہیں ۔ تیسری مصیبت یہ کہ جو کھانا پیش کیا جا رہا تھا اس کے دوسرے عزیز و اقارب نہ معلوم کون کون اور

۱۔ غالب کے مشہور مصرع کی طرف اشارہ ہے "دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا" ۔

تھے جن کی عدم موجودگی میں کھانے کو ہاتھ لگانا بڑا گنوار پن ہوتا ۔ میزبان خاتون کو مسکرانے اور خواہ مخواہ اخلاق برتنے سے فرصت کہاں ؟ کہ وہ کچھ بتائیں یا ہم پوچھ سکیں ۔ بیروں کو دیکھیے تو زرہ بکتر اور چار آئینے لگائے ہوئے اس طور پر مصروف کار تھے جیسے بعض نالائق اور بددماغ امتحان کے ہال میں امیدواروں کی نگرانی کرتے ہیں ۔ اس قسم کے بیروں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو کچھ ایسا وہم سا ہونے لگتا ہے کہ یہ کہیں نہ کہیں اپنے یونیفارم یا پیٹی ٹھپوں میں کوئی پیش قبض بھی چھپائے ہوئے ہیں ۔ کبھی کبھی کوئی خادمہ بشکل مخدومہ آ جاتی تھی ۔ اور ہم بربنائے سراسیمگی یا دوراندیشی یہ سمجھ کر کہ یہ بھی میزبان قسم کی کوئی چیز ہیں ۔ یا آج نہیں تو کل اس رتبے پر فائز ہوں گی ۔ ہمیشہً تعظیم دیتے یا بے وقوفوں کی طرح مسکرانے کے لیے تیار رہتے ۔ کھانا تھا کہ چلا ہی آتا تھا ۔ ہم نے بھی چھری اس طرح پکڑ رکھی تھی جیسے کسی قلمتراش چاقو سے گینڈے کی قربانی کرنے والے ہیں ۔ کانٹا ہمارے ہاتھ میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پلیٹ پر کوئی کیکڑا مسلط ہے ۔

خدا خدا کرکے کھانا ختم ہوا ۔ کافی آئی بغیر دودھ یا شکر کے ۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے تمباکو کا گل پیس کر گرم پانی ملا دیا گیا ہے یا نادر شاہ کے اصلاح معدہ کے لیے املتاس کا مسہل جام بلوریں میں پیش کیا گیا ہے ۔ مشکل یہ ہے کہ کافی سے انکار کیجیے تو میزبان اس طور خفا ہوتے ہیں جیسے ریڈیو والوں کو آپ کی تقریر دس دن پہلے نہ پہنچ جائے یا صاف نہ لکھی جائے تو یہ دل ہی دل میں کوستے ہوئے ،

براڈ کاسٹ کرتے ہیں[1] -

اب فرض کیجیے کسی رئیس کے ہاں دعوت ہوئی وہ کھانا اس طور پر کھلائے گا گویا مہمان کے سات پشت تک کو نواز ڈالا - قورمہ ہر دعوت میں ملتا ہے اور معمولی سے معمولی لوگ بھی اپنے گھروں پر کھاتے ہیں - لیکن رئیس کے یہاں کا قورمہ کچھ اور ہی چیز ہوتا ہے - ایک خاص انداز سے فرمائیں گے - مولانا ! کہیے قورمے سے بھی شوق فرمایا " - "جی ہاں! شکریہ ماشاء اللہ" ! فرمائیں گے - "صاحب ! ایسا حلوان[2] دہلی بھر میں نہ ملے گا - بادام پر پلا تھا ذرا بوٹی کی خستگی پر نظر رکھیے " - "سبحان اللہ ! کیوں نہیں " - ارشاد ہوتا ہے - " ہاں ہاں خوب کھائیے - بہت ہے " " جی ہاں ! خوب سیر ہو کر کھایا " " نہیں نہیں آپ تکلف کرتے ہیں - فلانے چلو ! مولانا کو قورمہ اور دو " - لیکن فلانے کو پکاریں گے اور قورمہ کا آرڈر اس طورپر دیں گے گویا مولانا کو ہوا دینے کا ارادہ ہے قورمہ پلیٹ میں ڈال دیا گیا اور مولانا کو قورمہ سے نفرت ہونے لگی - ارشاد ہو گا - مولانا یہ باورچی اب دہلی میں اکیلا رہ گیا ہے - اس کا دادا معمولی حجام تھا - میرے والد نے اس کو کھانا پکانا سکھایا - وہ خود کھانے کے بڑے شائق تھے - اب اس کا ثانی دور دور نہ ملے گا - بس مولانا ! قورمہ کھا لیجیے - یہ چیز اب معدوم ہوتی جاتی ہے - " غرض مولانا کو اس شفقت اور تپاک سے کھلائیں گے گویا اپنے والد مرحوم کی فاتحہ کا کھانا کسی نابینا حافظ کو کھلا رہے ہیں -

---

۱ - اس فقرے میں یہ لطف ہے کہ یہ مضمون اصل میں ریڈیو کے لیے لکھا گیا ہے - ۲- نرم گوشت والا بکرا -

دوسری آفت ملاحظہ ہو ۔ بعض میزبان حماقت اور محبت کے سلسلے میں اصرار کرتے کرتے کھانا آپ کی پلیٹ میں ڈال دیں گے اور فرمائش کریں گے ۔ "کھائیے ، میرے سر کی قسم کھائیے" حالانکہ اس وقت جی یہی چاہتا ہے کہ پلیٹ سر پر مار لیجیے اور گریبان پھاڑ کر بھاگ جائیے ۔ ایسی دعوت سے مجھ کو قلبی نفرت ہے " جہاں میزبان باربار کھانے کے لیے اصرار کرے اور اپنے ہاتھ سے میری پلیٹ میں کھانا رکھ دے اور صرف یہ کہتا رہے ۔ "آپ کو کھانا پسند نہیں آیا" آپ کے لیے کچھ اور انتظام نہ ہو سکا ۔ بھائی ! جلدی میں یہی دال دلیا ہو سکا ۔ آپ نے کچھ بھی تو نہیں کھایا" ۔ حالانکہ اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ میں یہ کہوں کہ " ایسا کھانا مجھے تو کیا ، میری سات پشت کو نصیب نہ ہوا اور نہ ہو گا ۔ اورآپ نے جس مروت اور ایثار کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال دینا میں نہیں مل سکتی ۔"

اس کے علاوہ بعض دعوتوں میں عجیب عجیب قسم کے بدتمیزوں سے سابقہ پڑتا ہے ۔ بعض کھانا نہیں کھاتے ۔ منہ میں جوتیاں چٹخاتے ہیں ۔ کچھ ایسے ہیں جو ساری انگلیاں سالن میں ڈبو دیں گے اور منہ میں لقمہ کی پذیرائی اس طور پر کریں گے جیسے سرکس کے گھوڑے کو چابک لگاتے ہیں ۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بدحواس ہو کر بہت زیادہ حصہ پلیٹ میں لے لیں گے ۔ تھوڑا کھائیں گے اور بقیہ کو گھونگھول کر چھوڑ دیں گے ۔ ڈونگے میں سے بوٹیاں چمچے سے نکالنے کی بجائے ان کو ٹٹول کر نکالیں گے، کبھی پلیٹ میں نکالی ہوئی بوٹیوں کو پھر ڈونگے میں ڈال دیں گے ۔ پانی پئیں گے تو معلوم ہوگا گویا بھری بوتل حلق

میں انڈیلی جا رہی ہے اور گلے سے قلقل مینا کا کام لے رہے ہیں - کچھ لوگ چپاتی کے حاشیے توڑ توڑ کر دسترخوان پر انبار لگا دیں گے - سنی ہوئی انگلیاں روٹی سے پونچھیں گے اور ڈکار اس طور پر لیں گے گویا اس خوبصورت آواز کے تمام لوگ منتظر تھے -

کچھ اس طور پر کھائیں گے گویا اپنے گھر کھانے کو نہیں ملتا - دوسروں کے دسترخوان پر نازک مزاجی یا بددماغی کا ایسا ثبوت دیں گے گویا وہ بیک وقت اردو کے کوئی حق بخشوائے ہوئے شاعر بھی ہیں اور نالائق افسر بھی !

اور خدا اس دعوت سے بھی ہر بھلے مانس کو بچائے جس میں تقریر کی جانے والی ہو - لیکن مقرروں میں بھانڈ کی محفل اور شرفا کی مجلس میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہ ہو -

سوالات اور مشقیں

(۱) اس سبق کے بالکل شروع میں مضمون نگار نے ایک مثل کا ذکر کیا ہے ”مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ“ یہ مثل نہیں بلکہ اردو کے مشہور افسانہ نگار اور انشا پرداز سجاد حیدر یلدرم کے ایک مضمون کا عنوان ہے، جس میں انھوں نے اپنے چند دوستوں کا ذکر بڑے پر لطف انداز میں کیا ہے - یہ مضمون ان کی کتاب ”خیالستان“ میں چھپا ہے - کہیں سے یہ کتاب حاصل کر کے، یہ مضمون پڑھیے - آپ کو بڑا لطف آئے گا -

(۲) مضمون کے بالکل شروع میں ”بھوک“ کے متعلق دو شعر لکھے گئے ہیں - دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ شعر بھوک کے متعلق نہیں لکھے گئے تھے - یہ اصل میں اردو کے عظیم شاعر اقبال کی ایک نظم کے شعر ہیں - نظم کا نام ہے ”والدہ مرحومہ کی یاد میں“ یہ نظم اقبال

کے کلام کے پہلے مجموعے "بانگ درا" میں موجود ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اقبال کی یہ نظم اردو کے چند بہترین مرثیوں میں سے ایک ہے۔ آپ کو موقع ملے تو کبھی یہ نظم ضرور پڑھیے۔

(۳) اقبال کی نظم کے وہ شعر جنھیں مضمون نگار نے بدلا ہے یوں ہیں:

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

آپ دیکھیے کہ مضمون نگار نے ایک لفظ بدل کر کتنی خوبصورتی سے شعروں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ شعر اسی مقصد سے کہے گئے تھے، جس کے لیے مضمون نگار نے انھیں استعمال کیا۔

پطرس بخاری

سید احمد شاہ بخاری (۱۸۹۸-۱۹۵۸ء) کے متعلق ایک صاحب رائے نے لکھا ہے کہ وہ ''پاکستان کے نہایت ذہین، نہایت روشن دماغ، بے حد ہنس مکھ، خوش پوشاک، خوش گفتار، مشہور ماہر تعلیم، انگریزی اور اردو کے صاحب طرز ادیب، منفرد مزاح نگار اور کامیاب سفیر تھے'' - وہ اکتوبر ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں اور اعلیٰ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور میں حاصل کی - محکمۂ تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے - عرصے تک ریڈیو کے محکمے کے سب سے اعلیٰ افسر رہے -

بخاری صاحب نے بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی کامیاب نمائندگی کی اور دوسرے ملکوں میں پاکستان کا وقار بلند کیا اقوام متحدہ جو دنیا میں سب سے بڑا سیاسی اور تہذیبی ادارہ ہے اس میں پہلے کئی سال تک پاکستان کے مندوب اور پھر اس کے شعبۂ اطلاعات کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے کام کیا اور بڑی ناموری حاصل کی - اسی عہدے پر فائز تھے کہ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے نیو یارک میں انتقال ہوا -

اردو دان طبقہ پطرس بخاری صاحب سے ان کے مضامین کے مجموعے 'پطرس کے مضامین' کی وجہ سے اچھی طرح واقف ہے - اس مجموعے کے مضامین ہر طبقے میں بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں - لیکن بخاری صاحب نے ان مضامین کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں لکھی ہیں - یہ سب چیزیں رسالہ ''نقوش'' لاہور کے پطرس نمبر میں شامل ہیں -

اس کتاب میں جو دو مضمون (''بچے'' اور ''سفر انگلستان'') شامل کیے گئے ہیں وہ اسی ''پطرس نمبر'' سے لیے گئے ہیں -

بچے

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں - مثلاً بلی کے بچے ، فاختہ کے بچے وغیرہ - مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے ، جن کی ظاہراً تو کئی قسمیں ہیں - کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے ، کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے - لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگھوڑے میں سویا پڑا ہو - جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے ، بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی -

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگتے ہیں ، یہ میں نے اور حکما کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے - ورنہ حاشا وکلا میں اس بات کا قایل نہیں -

کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے - لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا کہ ذرا اسے چپ کرانا - میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں ، شعر پڑھے ہیں ، ناچ ناچے ہیں ، تالیاں بجائی ہیں ، گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں ،

بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں ، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کیے ہیں ، لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو ۔ جس سر پر اس نے شروع کیا تھا، اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو ۔ اور خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت ؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہے جب اس کے لیے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو ۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں ۔ ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے ۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجیے ۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے مہمل فقرے ، بے معنی سے بے معنی، منہ بنا کر بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے ۔ اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دے دیجیے ۔ یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بیکار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں ۔ یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجیے ۔ لڑھکتا چلا جاتا ہے ۔ اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سری ، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے مامتا یا باپتا کے جوش میں آکر برخوردار کو ایک عدد ربڑ کی گڑیا منگوا دی ، جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی اور نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے ۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں ، بدقسمت ہیں تو وہ بیچارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو

دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی تجربات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ ضرور یہ کہیں کہ "کیسا پیارا بچہ ہے"۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بیچارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ روتے روتے تھک جاتا ہے تو ان کا دوسرا برخوردار شروع ہو جاتا ہے۔ وہ ہار جاتا ہے تو تیسرے کی باری آتی ہے۔ رات کی ڈیوٹی والے بچے الگ ہیں۔ ان کا سر ذرا باریک ہے۔ آپ انگلیاں چٹخا کر، سر کی کھال میں تیل جھسوا کر، کانوں میں روئی دے کر، لحاف میں سر لپیٹ کر سوئیے۔ ایک لمحے کے اندر آپ کو جگا کے، اٹھا کے بٹھا نہ دیں تو میرا ذمہ۔

انہی مرزا صاحب کے گھر پر جب میں جاتا ہوں تو ایک ایک بچے کو بلا کر پیار کرتا ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟ کئی دفعہ دل میں آیا۔ مرزا صاحب سے کہوں۔ حضرت! آپ کے ان نغمہ سراؤں نے میری زندگی حرام کر دی ہے۔ نہ دن کو کام کر سکتا ہوں نہ رات کو سو سکتا ہوں۔ لیکن یہ میں کہنے ہی کو ہوتا ہوں کہ ان کا ایک بچہ کمرے میں آجاتا ہے اور مرزا صاحب ایک والدانہ تبسم سے کہتے ہیں۔ "اختر بیٹا! ان کو سلام کرو، سلام کرو بیٹا۔ اس کا نام اختر ہے صاحب! بڑا اچھا بیٹا ہے۔ کبھی ضد نہیں کرتا، کبھی نہیں روتا، کبھی ماں کو دق نہیں کرتا"۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ وہی نالائق

ہے جو رات کے دو بجے گلا پھاڑ پھاڑ کے روتا ہے ۔ مرزا صاحب قبلہ تو شاید اپنے خراٹوں کے زور شور میں کچھ نہیں سنتے ۔ بدبختی ہماری ہوتی ہے ۔ لیکن کہتا یہی ہوں کہ "یہاں آؤ بیٹا !" گھٹنے پر بٹھا کر اس کا منہ چومتا ہوں ۔

خدا جانے آج کل کے بچے کس قسم کے بچے ہیں ۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم عید بقر عید کو تھوڑا سا رو لیا کرتے تھے ۔ اور کبھی کبھی مہمان آ نکلا تو نمونے کے طور پر تھوڑی سی ضد کر لی ۔ کیوں کہ ایسے موقعہ پر ضد کارآمد ہوا کرتی تھی ۔ لیکن یہ کہ چوبیس گھنٹے متواتر روتے رہیں ، ایسی مشق ہم نے کبھی بہم نہ پہنچائی تھی ۔

سوالات اور مشقیں

مضمون کو غور سے پڑھیے اور ذیل کے سوالوں کے جواب دیجیے :

۱ ۔ "بیدار ہونے پر جب پانچوں حواس کام کرنے لگے . . . ."
ان پانچوں حواس کے نام بتائیے ۔

۲ ۔ بچے کو الارم کلاک کیوں کہا گیا ہے ؟

۳ ۔ "جس سر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو" اس بات کو آسان لفظوں میں ادا کیجیے ۔

۴ ۔ "مامتا" کے معنی ہیں ماں کی محبت ، مضمون میں "باپتا" کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے ؟ (اپنے ماسٹر صاحب سے پوچھیے کہ یہ لفظ صحیح ہے یا غلط)

۵ ۔ ذیل کے لفظوں کے معنی بتائیے اور انھیں جملوں میں استعمال کیجیے ۔

نغمہ سرائی ۔ سامعہ نوازی ۔ لواحقین ۔ مہمل ۔ یکسوئی ۔

مشتاق احمد یوسفی

یوسفی صاحب موجودہ دور کے بہت مشہور اور ہردلعزیز مزاح نگار ہیں - سکول میں پڑھتے تھے تو حساب سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی ، اور بقول خود "وہی ذریعہ معاش ہے" ایک بنک میں بہت اونچے عہدے پر فائز ہیں - اپنے جو حالات انھوں نے اپنے مضامین کے مجموعے "چراغ تلے" کے مقدمے کے طور پر لکھے ہیں وہ ان کا بہترین تعارف ہے - کتاب تلاش کیجیے اور اس کا مقدمہ پڑھ ڈالیے - جو مضمون ابھی آپ پڑھیں گے وہ اسی کتاب سے لیا گیا ہے - اس کتاب میں اس مضمون (پڑیے گر بیمار) کے علاوہ گیارہ مضامین اور ہیں - مضامین کا دوسرا مجموعہ "خاکم بدہن" بعد میں مرتب ہوا - اسے ایک سال تخلیقی مضامین کا بہترین مجموعہ قرار دیا گیا اور اس پر دس ہزار روپے انعام ملا -

★

پڑیے گر بیمار

میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمہ علالت ہے - اسپرین کی صرف ایک خوراک یا مارفیا کا ایک انجکشن اس سے نجات دلانے کے لیے کافی ہے ، لیکن اس روحانی اذیت کا کوئی علاج نہیں جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے - ایک دائم المرض کی حیثیت سے جو اس درد لادوا کی لذت سے آشنا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مارفیا کے انجکشن مریض کی بجائے مزاج پرسی کرنے والوں کے لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آ جائے -

اردو شاعروں کے بیان کو باور کیا جائے تو پچھلے زمانے

میں علالت کی غایت ''تقریب بہر ملاقات'' کے سوا کچھ نہ تھی - محبوب عیادت کے بہانے غیر کے گھر جاتا تھا اور ہر سمجھ دار آدمی اسی امید میں بیمار پڑتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مزاج پرسی کو آ نکلے -

''علالت بے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی'' -

اس زمانے کے انداز عیادت میں کوئی دل نوازی ہو تو ہو ، میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو محض عیادت کے خوف سے تندرست رہنا چاہتے ہیں - ایک خاص دائم المرض کے لیے ''مزاج اچھا ہے ؟'' ایک رسمی یا دعائیہ جملہ نہیں بلکہ ذاتی حملہ ہے جو ہر بار اسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے - میں تو آئے دن کی پرسش حال سے اس قدر بیزار ہو چکا ہوں کہ احباب کو آگاہ کر دیا ہے کہ ''جب تک میں بقلم خود یہ اطلاع نہ دوں کہ آج اچھا ہوں مجھے حسب معمول بیمار ہی سمجھیں اور مزاج پرسی کرکے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دیں'' -

سنا ہے کہ شائستہ آدمی کی یہ پہچان ہے کہ اگر آپ اس سے کہیں کہ مجھے فلاں بیماری ہے تو وہ کوئی آزمودہ دوا نہ بتائے - شائستگی کا یہ سخت معیار صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہمارے ملک میں سوائے ڈاکٹروں کے کوئی اللہ کا بندہ شائستہ کہلانے کا مستحق نہ نکلے - یقین نہ آئے تو جھوٹ موٹ کسی سے کہہ دیجیے کہ مجھے زکام ہو گیا ہے - پھر دیکھیے - کیسے کیسے مجرب نسخے ، خاندانی چٹکلے اور فقیری ٹوٹکے آپ کو بتائے جاتے ہیں - میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ اس کی اصل وجہ طبی معلومات کی زیادتی ہے یا مذاق

سلیم کی کمی - بہرحال، بیمار کو مشورہ دینا ہر تندرست آدمی اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فی صد لوگ ایک دوسرے کو مشورے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں -

بعض اوقات احباب اس بات سے بہت آزردہ ہوتے ہیں کہ میں ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا - حالانکہ ان پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو - اس وقت میرا منشا صلاح و مشورہ کے نقصانات گنوانا نہیں (اس لیے کہ میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے اسی سے ذہنی توازن قائم رہتا ہے نہ یہاں ستم ہائے عزیزاں کا شکوہ مقصود ہے - مدعا صرف اپنے اُن بہی خواہوں کو متعارف کرانا ہے جو میرے مزمن[1] امراض کے اسباب و علل پر غور کرتے اور اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً مجھے مستفید فرماتے رہتے ہیں - اگر اس غول میں آپ کو کچھ جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں تو میری خستگی کی داد دینے کی کوشش نہ کیجیے - آپ خود لائق ہمدردی ہیں -

سر فہرست ان مزاج پرسی کرنے والوں کے نام ہیں جو مرض تشخیص کرتے ہیں نہ دوا تجویز کرتے ہیں - مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منکسر مزاج ہیں - دراصل ان کا تعلق اس مدرسہ فکر سے ہے جس کے نزدیک پرہیز علاج سے بہتر ہے - یہ اس شکم آزاد عقیدے کے مبلغ و موید ہیں کہ کھانا

۱- پرانا -

جتنا پھیکا سیٹھا ہوگا ، صحت کے لیے اتنا ہی مفید ہوگا ۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں دواؤں کے خواص دریافت کرنے کا بھی یہی معیار ہے ۔ جس طرح بعض خوش اعتقاد لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ ہر بدصورت عورت نیک چلن ہوتی ہے ، اسی طرح طب قدیم میں ہر کڑوی چیز کو مصفئی خون تصور کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ ہمارے ہاں انگریزی کھانے اور کڑوے قدحے اسی امید میں نوش جان کیے جاتے ہیں ۔

اس قبیل کے ہمدردان صحت دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں ۔ ایک وہ غذا رسیدہ بزرگ جو کھانے سے علاج کرتے ہیں ۔ دوسرے وہ جو علاج اور کھانے دونوں سے پرہیز تجویز فرماتے ہیں ۔ پچھلی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ میری بائیں آنکھ میں گوھانجنی نکلی تو ایک نیم جان جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں ، چھوٹتے ہی بولے :

"فم معدہ پر ورم معلوم ہوتا ہے ۔ دونوں وقت مونگ کی دال کھائیے ۔ دافع نفخ و محلل ورم ہے" ۔

میں نے پوچھا ۔ "آخر آپ کو میری ذات سے کونسی تکلیف پہنچی جو یہ مشورہ دے رہے ہیں ؟"

فرمایا ۔ "کیا مطلب؟"

عرض کیا ۔ "دو چار دن مونگ کی دال کھا لیتا ہوں تو اردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشا تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے ۔ اس صورت میں خدا نخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی کے کیا کروں گا؟"

بولے ۔ "آپ تجارت کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں ؟

انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ترازو تھی۔"

گزارش کی۔ "اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی!"

بات انھیں بہت بری لگی۔ اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ سچ تھی۔ اس کے بعد تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ ہم نے ایک دوسرے کے لطیفوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ استعارہ و کنایہ برطرف، میرا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جب تک آدمی کو خواص کی غذا ملتی رہے، اسے غذا کے خواص کے بکھیڑے میں پڑنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ سچ پوچھیے تو عمدہ غذا کے بعد کم از کم مجھے تو بڑا انشراح محسوس ہوتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کے ہر راہ گیر کو سینے سے لگا لوں۔

دوسرا گروہ قوت ارادی سے دوا اور غذا کا کام لینا چاہتا ہے۔ اور جسمانی عوارض کے علاج معالجہ سے پہلے دماغ کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ حضرات ابتدائے مرض ہی سے دوا کے بجائے دعا کے قائل ہیں اور ان میں بھاری اکثریت ان سترے بہترے بزرگوں کی ہے جو گھگھیا گھگھیا کر اپنی درازی عمر کی دعا مانگتے ہیں اور اسی کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس روحانی غذا کے لیے میں فی الحال اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ مجھے اس پر قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہو جاتے ہیں۔

کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے انداز پرسش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے اور وہ کسی آسمانی ہدایت کے بموجب اس کی تفتیش پر مامور کیے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور میں بھی صاحب فراش ہو گیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے، کمرہ علالت میں بہ نفس نفیس تشریف لائے اور خوب کرید کرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر رازدارانہ انداز میں کچھ ایسے نجی سوالات کیے جن کے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں بیوی اور منکر نکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔

ایک بزرگوار ہیں جن سے صرف دوران علالت میں ملاقات ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ موصوف آتے ہی برس پڑتے ہیں اور گرجتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کا ذکر ہے۔ ہلہلا کر بخار چڑھ رہا تھا کہ وہ آ دھمکے۔ کپکپا کر کہنے لگے:

"بیماری آزاری میں بھی بڑی غیریت برتتے ہو۔ برخوردار! دو گھنٹے سے ملیریا میں چپ چاپ مبتلا ہو اور مجھے خبر تک نہ کی۔"

بہتیرا جی چاہا کہ اس دفعہ ان سے پوچھ ہی لوں کہ قبلہ کونین! اگر آپ کو بروقت اطلاع کر دیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے؟

ان کی زبان اس قینچی کی طرح ہے جو چلتی زیادہ ہے اور کاٹتی کم۔ ڈانٹنے کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی کودن لڑکا زور زور سے پہاڑے یاد کر رہا ہو۔ مجھے ان کی ڈانٹ پر

ذرا غصہ نہیں آتا کیونکہ اب اس کا مضمون ازبر ہو گیا ہے۔ یوں بھی اس کینڈے کے بزرگوں کی نصیحت میں سے ڈانٹ اور ڈاڑھی کو علیحدہ کر دیا جائے یا بصورت نقص امن ڈانٹ میں سے ڈنک نکال دیا جائے تو بقیہ بات (اگر کوئی چیز باقی رہتی ہے) نہایت لغو معلوم ہوگی۔

ان کا آنا فرشتہ موت کا آنا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام روح قبض کرتے وقت اتنی ڈالٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔ زکام انھیں نمونیہ کا پیش خیمہ دکھائی دیتا ہے اور خسرہ میں موتی جھرے کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ جہاں محض سیٹی سے کام نکل سکتا ہے، وہاں بے دھڑک بگل بجا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک ہی سانس میں خدانخواستہ سے اناللہ تک کی تمام منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ ان کی منظوم ڈانٹ کی تمہید کچھ اس قسم کی ہوتی ہے:

"میاں! یہ بھی کوئی انداز ہے کہ گھر کے رئیسوں کی طرح نبض پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو۔

بیکاری بیماری کا گھر ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

"بیمار مباش کچھ کیا کر۔"

مصرع کا جواب شعر سے دیتا ہوں:

"کمزور ہے میری صحت بھی، کمزور مری بیماری بھی
اچھا جو ہوا کچھ کر نہ سکا، بیمار ہوا تو مر نہ سکا۔

یہ سن کر وہ بپھر جاتے ہیں اور اپنے سن و سال کی آڑ لے کر کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی زبان میں وہ بے نقط سناتے ہیں کہ زندہ تو درکنار، مردہ بھی ایک دفعہ کفن پھاڑ کر سوال جواب کے لیے اٹھ بیٹھے۔ تقریر کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ

راقم الحروف جان بوجھ کر اپنی تندرستی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر خود کشی میرا منشا ہوتا تو یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں جیتا، بلکہ آنکھ بند کر کے ان کی تجویز کردہ دوائیں کھا لیتا۔

آئیے، ایک اور مہربان سے آپکو ملاؤں۔ ان کی تکنیک قدرے مختلف ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی ایسے ہراساں ہوتے ہیں کہ میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کا معمول ہے کہ کمرے میں بغیر کھٹکھٹائے داخل ہوتے ہیں اور میرے سلام کا جواب دیے بغیر تیمارداروں کے پاس پنجوں کے بل جاتے ہیں۔ پھر کھسر پھسر ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی اچٹتا ہوا فقرہ مجھے بھی سنائی دے جاتا ہے۔ مثلاً:

"صدقہ دیجیے۔ جمعرات کی رات بھاری ہوتی ہے۔"

"پانی حلق سے اتر جاتا ہے؟"

"آدمی پہچان لیتے ہیں؟"

یقین جانیے۔ یہ سن کر پانی سر سے گزر جاتا ہے اور میں تو رہا ایک طرف خود تیماردار میری صورت نہیں پہچان سکتے۔

سرگوشیوں کے دوران میں ایک دو دفعہ میں نے خود دخل دے کر بقائمی ہوش و حواس عرض کرنا چاہا کہ میں بفضل تعالیٰ چاق و چوبند ہوں۔ صرف پیچیدہ دواؤں میں مبتلا ہوں۔ مگر وہ اس مسئلہ کو قابل دست اندازی مریض نہیں سمجھتے اور اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے اعلان صحت اور ان کی پر زور تردید سے تیمارداروں کو میری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یوں بھی اگر بخار سو ڈگری سے اوپر ہو جائے

تو میں ہذیاں بکنے لگتا ہوں جسے بیگم، اقبال گناہ اور رشتہ‌دار وصیت سمجھ کر ڈانٹتے ہیں اور مجھے ڈانٹ سمجھ کر سہم جاتے ہیں۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ یہ حضرت مزاج پرسی کرنے آتے ہیں یا پرسا دینے۔ ان کے جانے کے بعد میں واقعی محسوس کرتا ہوں کہ بس اب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ سانس لیتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ روایتی ہچکی نہ آ جائے ذرا گرمی لگتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ شاید آخری پسینہ ہے اور طبیعت تھوڑی بحال ہوتی ہے تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں کہ کہیں سنبھالا نہ ہو۔

لیکن مرزا عبدالودود بیگ کا انداز سب سے نرالا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انھیں میری دلجوئی مقصود ہوتی ہے یا اس میں ان کے فلسفہ حیات و ممات کا دخل ہے۔ بیماری کے فضائل ایسے دل نشین پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ صحت یاب ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ تندرستی وبال معلوم ہوتی ہے اور غسل صحت میں وہ تمام قباحتیں نظر آتی ہیں جن سے غالب کو فکر وصال میں دو چار ہونا پڑا۔

"کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو؟"

اکثر فرماتے ہیں کہ بیماری جان کا صدقہ ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ "میرے حق میں تو یہ صدقہ جاریہ ہو کر رہ گئی ہے"۔ ارشاد ہوتا ہے "خالی بیمار پڑ جانے سے کام نہیں چلتا۔ اس لیے کہ پس ماندہ ممالک میں۔

"فیضان علالت عام سہی، عرفان علالت عام نہیں"

ایک دن میں کان کے درد میں تڑپ رہا تھا کہ وہ آنکلے اس افراتفری کے زمانے میں زندہ رہنے کے شدائد اور موت کے

فیوض و برکات پر ایسی موثر تقریر کی کہ بے اختیار جی چاہا کہ انھی کے قدموں پر پھڑپھڑا کر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دوں اور انشورنس کمپنی والوں کو روتا دھوتا چھوڑ جاؤں ۔ ان کے دیکھنے سے میرے تیمارداروں کے منہ کی رہی سہی رونق جاتی رہتی ہے ۔ مگر میں سچے دل سے ان کی عزت کرتا ہوں ۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ محض جینے کے لیے کسی فلسفہ کی ضرورت نہیں ۔ لیکن اپنے فلسفہ کی خاطر دوسروں کو جان دینے پر آمادہ کرنے کے لیے سلیقہ چاہیے ۔

پچھلے جاڑوں کا ذکر ہے ۔ میں گرم پانی کی بوتل سے سینک کر رہا تھا کہ ایک بزرگ جو اسی سال کے پیٹے میں ہیں خیر و عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک قبر و عاقبت کی باتیں کرتے رہے ۔ جو میرے تیمارداروں کو ذرا قبل از وقت معلوم ہوئیں ۔ آتے ہی بہت سی دعائیں دیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ”خدا مجھے ہزاری عمر دے تاکہ میں اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لیے زندہ رہوں“ ۔ اس کے بعد جانکنی اور فشار گور کا اس قدر مفصل حال بیان کیا کہ مجھے غریب خانے پر گور غریباں کا گمان ہونے لگا ۔ عیادت میں عبادت کا ثواب لوٹ چکے تو میری جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا جس میں شفقت کم اور رعشہ زیادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی کو (جن کا انتقال تین ماہ قبل اسی مرض میں ہوا تھا جس میں، میں مبتلا تھا) یاد کر کے کچھ اس طرح آب دیدہ ہوئے کہ میری بھی ہچکی بندھ گئی ۔ میرے لیے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انھیں کچھ قرار آیا تو وہ مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں ان غنچوں پر حسرت کا اظہار کیا ہے جو

ان کھلے مرجھا گئے۔

میں فطرتاً رقیق القلب واقع ہوا ہوں اور طبیعت میں ایسی باتوں کی سہار بالکل نہیں ہے۔ ان کے جانے کے بعد "جب لاد چلے گا بنجارا" والا موڈ طاری ہو جاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر پرچھائیں بھوت اور ہر سفید چیز فرشتہ دکھائی دیتی ہے۔ ذرا آنکھ لگتی ہے تو بے ربط خواب دیکھنے لگتا ہوں۔ گویا کوئی "کومک" یا با تصویر نفسیاتی افسانہ سامنے کھلا ہوا ہے۔

لگے ہاتھوں عیادت کرنے والوں کی ایک اور قسم کا تعارف کرا دوں۔ یہ حضرات جدید طریق کار برتنے اور نفسیات کا ہر اصول داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ ہر پانچ منٹ بعد پوچھتے ہیں کہ افاقہ ہوا یا نہیں۔ گویا مریض سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ عالم نزع میں بھی ان کی معلومات عامہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے (Running Commentary) کرتا رہے گا۔ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح مریض پر ثابت کر دیں کہ وہ محض انتظاماً بیمار ہے یا وہم میں مبتلا ہے اور کسی سنگین غلط فہمی کی بنا پر اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ ان کی مثال اس روزہ خور کی سی ہے جو انتہائی نیک نیتی سے کسی روزہ دار کا روزہ لطیفوں سے بہلانا چاہتا ہو۔ مکالمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ملاقاتی: ماشاء اللہ! آج منہ پر بڑی رونق ہے۔

مریض: جی ہاں! آج شیو نہیں کیا ہے۔

ملاقاتی: آواز میں بھی کرارا پن ہے۔

مریض کی بیوی: ڈاکٹر نے صبح سے ساگودانہ بھی بند کر دیا ہے۔

ملاقاتی: (اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر) بیگم! یہ صحت یاب

ہو جائیں تو ذرا انھیں میری پتھری دکھانا جو تم نے چار سال سے اسپرٹ کی بوتل میں رکھ چھوڑی ہے (مریض سے مخاطب ہو کر) صاحب! یوں تو ہر مریض کو اپنی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر معلوم ہوتا ہے مگر یقین جانیے، آپ کا شگاف تو بس دو تین انگل لمبا ہوگا۔ میرا تو پورا ایک بالشت ہے۔ بالکل کنکھجورا معلوم ہوتا ہے۔

مریض : (کراہتے ہوئے) مگر میں ٹائفائڈ میں مبتلا ہوں!

ملاقاتی : (ایکا ایکی پینترا بدل کر) یہ سب آپ کا وہم ہے۔ آپ کو صرف ملیریا ہے۔

مریض : یہ پاس والی چارپائی جو اب خالی پڑی ہے، اس کا مریض بھی اسی وہم میں مبتلا تھا۔

ملاقاتی : ارے صاحب! مانیے تو! آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئیے۔

مریض کی بیوی : (روہانسی ہو کر) دو دفعہ دھو چکے ہیں۔ صورت ہی ایسی ہے۔

اس وقت ایک دیرینہ کرم فرما یاد آ رہے ہیں جن کا طرز عیادت ہی اور ہے۔ ایسا حلیہ بنا کر آتے ہیں کہ خود ان کی عیادت فرض ہو جاتی ہے۔ "مزاج شریف!" کو وہ رسمی فقرہ نہیں بلکہ سالانہ امتحان کا سوال سمجھتے ہیں اور سچ مچ اپنے مزاج کی جملہ تفصیلات بتانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دن منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر میں نے "مزاج شریف!" کے بجائے "سب خیریت ہے" سے پرسش احوال کی۔ پلٹ کر بولے۔ "اس جہان شریف میں خیریت کہاں؟" اس مابعد الطبعیاتی تمہید کے بعد کراچی کے موسم کی

خرابی کا ذکر آنکھوں میں آنسو بھر کر ایسے انداز سے کیا، گویا ان پر سراسر ذاتی ظلم ہو رہا ہے، اور اس کی تمام تر ذمہ داری میونسپل کارپوریشن پر عائد ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتیں شاعر کی نصیحت کے مطابق وقت کو پیمانہ امروز و فردا سے نہیں ناپتیں، بلکہ تاریخ و سنہ اور واقعات کی ترتیب کا حساب اپنی یادگار زچگیوں سے لگاتی ہیں۔ مذکورالصدر دوست بھی اپنی بیماریوں سے کیلنڈر کا کام لیتے ہیں۔ مثلاً شہزادی مارگریٹ کی عمر وہ اپنے دمے کے برابر بتاتے ہیں۔ سوئز سے انگریزوں کے نہر بدر کیے جانے کی تاریخ وہی ہے جو ان کا پتا نکالے جانے کی! میرا قاعدہ ہے کہ جب وہ اپنی اور جملہ متعلقین کی عدم خیریت کی تفصیلات بتا کر اٹھنے لگتے ہیں تو اطلاعاً اپنی خیریت سے آگاہ کر دیتا ہوں۔

بیمار پڑنے کے صدہا نقصانات ہیں مگر ایک فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس بہانے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم ہو جاتی ہے۔ بہت سی کڑوی کسیلی باتیں جو عام طور سے ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتی ہیں، بے شمار دل آزار فقرے جو "خوف فساد خلق" سے حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں، اس زمانے میں یار لوگ نصیحت کی آڑ میں "ہوالشافی" کہہ کر بڑی بے تکلفی سے داغ دیتے ہیں۔ پچھلے سینچر کی بات ہے۔ میری عقل ڈاڑھ میں شدید درد تھا کہ ایک روٹھے ہوئے عزیز جن کے مکان پر حال ہی میں قرض کے روپیہ سے چھت پڑی تھی، لقا کبوتر کی مانند سینہ تانے آئے اور فرمانے لگے:

"ہیں آپ بھی ضدی آدمی.. لاکھ سمجھایا کہ اپنا ذاتی مکان بنوا لیجیے مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔"

طعنے کی کاٹ درد کی شدت پر غالب آئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ۔ ”بھائی ! میری عقل تو اس وقت کام نہیں کرتی ۔ خدارا ! آپ ہی بتائیے ۔ کیا یہ تکلیف صرف کرایہ داروں کو ہوتی ہے؟“

ہنس کر فرمایا ۔ ”بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ۔ کرائے کے مکان میں تندرستی کیوں کر ٹھیک رہ سکتی ہے ۔ ؟“

کچھ دن بعد جب انھی حضرت نے میرے گھٹنے کے درد کو بے دودھ کی چائے پینے اور رمی کھیلنے کا شاخسانہ قرار دیا تو بے اختیار ان کا سر پیٹنے کو جی چاہا ۔

سوالات اور مشقیں

۱- مضمون شروع سے آخر تک بے حد دلچسپ ہے ۔ ایک تو واقعات دلچسپ ہیں ، دوسرے مضمون نگار نے ان دلچسپ واقعات کو ایسے انداز سے لکھا ہے کہ ہر جملہ ایک ایسا کوزہ بن گیا ہے جس میں معانی کا دریا بند ہے ۔ ایک جملہ یہ ہے :

”بات انھیں بری لگی ، اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ سچ تھی“

اس جملے کے اندر جو بات پوشیدہ ہے اور لفظوں میں ظاہر نہیں کی گئی وہ یہ ہے کہ دنیا میں عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ ہم کسی کی بری بات کی طرف اشارہ کریں تو خواہ ہمارا کہنا کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو ، سننے والے کو اچھا نہیں لگتا ۔ مضمون میں اسی طرح کے بہت سے جملے ہیں ۔ آپ ایسے چند جملے تلاش کر کے اپنی کاپی میں لکھیے ۔

۲- پڑھی ہوئی عبارت میں آپ کو چند جملے ایسے ملیں گے جن میں اردو کے کسی نہ کسی مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے ۔ ایسے جملے تلاش کیجیے ۔

۳- یہ مضمون مصنف کی کتاب ”چراغ تلے“ سے لیا گیا ہے ۔ ان کی ایک کتاب اور بھی ہے ، اس کا نام ہے ”خاکم بدہن“

کرنل محمد خاں

محمد خاں جو اب کرنل محمد خاں ہیں ، جہلم کے پہاڑی لیکن شاداب علاقے میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے ابتدائی مرحلے وطن ہی میں طے کیے - بی - اے - گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا - خاندان اور علاقے کی روایت کے مطابق دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں فوج میں افسر ہو گئے اور لیفٹیننٹ کے عہدے سے ترقی کر کے کرنل کے اعلیٰ عہدے تک پہنچے - فوجی فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں بصرہ ، بغداد ، موصل، قاہرہ اور طبروق وغیرہ کا سفر کیا انھوں نے فوجی زندگی کی ان یادوں کی ایک دستاویز "بجنگ آمد" کی صورت میں مرتب کی ہے ، نثر میں شعریت بھی ہے ، شگفتگی بھی - فکر کی گہرائی بھی - محمد خاں کو اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہنے میں ایسی مہارت حاصل ہے کہ ان کے قلم سے جو بات نکلتی ہے دل پر نقش ہو جاتی ہے - آدمی ہنستا بھی ہے ، خوش بھی ہوتا ہے اور سوچتا بھی ہے -

لفٹینی[1]

ہمیں ہٹلر سے ہمیشہ شکایت رہے گی کہ اس نے دوسری جنگ عظیم شروع کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ نہ کیا - یہ نہیں کہ ہم موصوف کو اس کار خیر سے روکنے کی کوشش کرتے - ہم فقط اعلان جنگ میں دو مہینے کا التوا چاہتے تاکہ اپنی تعلیم پوری کر لیتے - لیکن ہم بمشکل گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر کالج پہنچے ہی تھے کہ آپ نے ہم سے بالا بالا پولینڈ پر چڑھائی کر دی - جس کا بعد میں ہمارے ذاتی پروگرام پر خاصا گہرا اثر پڑا -

---

۱- کتاب میں اس باب کا عنوان ہے - "عشق لفٹینی و مشکلہا" جو حافظ شیرازی کے مصرع "کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا" کے زیر اثر قائم کیا گیا ہے -

جنوری ۱۹۴۰ء میں ہر چند کہ پولینڈ اور ہٹلر کے دوسرے ہمسائے، جرمن بمباروں اور ٹینکوں کے درمیان ایسی پرسکون زندگی بسر نہیں کر رہے تھے تاہم دنیا بفضل خدا خیریت سے تھی اور ہمارے اپنے ملک ہندوستان۱ میں تو انگریز کی برکت سے اس شدت سے امن برپا تھا کہ شیر بکری مع جملہ ہندوستانیوں کے ایک گھاٹ پانی پی رہے تھے۔ چنانچہ صلح و آشتی کے اس خوشگوار ماحول میں کسی کو گمان تک نہ تھا کہ عین اس وقت ملک کے ایک گوشے میں ایک اہم جنگی واقعہ کی ابتدا ہو رہی ہے، یعنی لاہور میں ایک نوجوان کالج چھوڑ کر جنگ میں کود پڑنے پر تل گیا ہے۔۔۔ یہ نوجوان میں ہی تھا۔

لیکن بھرتی ہونے سے نہ تو ہٹلر کی دلآزاری مقصود تھی، نہ انگریز کی دلجوئی۔ ہمارے مراسم دونوں سے دوستانہ تھے۔ ہمیں فقط لفٹین۲ بننے کا شوق تھا اور قدرت اور ہٹلر نے مل کر اس شوق کی تکمیل کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ہم نے فوج میں کمشن کے لیے درخواست دے دی۔

ان دنوں ابھی وہ مصیبت نازل نہیں ہوئی تھی جسے آجکل "سیلیکشن بورڈ" کہتے ہیں۔ انٹرویو تو خیر ان دنوں بھی ہوتے تھے، بلکہ ایک چھوڑ تین تین، لیکن نہایت شریفانہ قسم کے۔ ایک بزرگ سا جرنیل اور کچھ نیم بزرگ سے برگیڈیر اور کرنل بیٹھے ہوتے تھے۔ سامنے کرسی پر امیدوار کو بٹھا دیا جاتا تھا اور پھر اس سے نہایت بے ضرر سے سوال پوچھے جاتے تھے۔

آپ کا نام کیا ہے؟

۱۔ اس وقت پاکستان ابھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ ۲۔ لفٹینٹ۔

تعلیم کہاں تک ہے ؟

فوج میں کوئی رشتہ دار ہے ؟ وغیرہ وغیرہ

اور ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ہر چند کہ کچھ خاندانی اسرار فاش کرنے پڑتے تھے لیکن دماغ پر ایسا ناگوار بوجھ نہ پڑتا تھا کہ اٹھائے نہ اٹھے - بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہلکا پھلکا اور خاصا مفرح قلب سا انٹرویو ہوتا تھا - ان دنوں نہ تو امیدواروں کی ذہانت کی پیمائش کی جاتی تھی نہ ان کے لاشعور کی تلاشی لی جاتی تھی - یہ بدعتیں چند سال بعد کی پیداوار ہیں -

چنانچہ ہمارے دو انٹرویو جہلم اور پنڈی میں ہوئے اور ہم کامیاب رہے - آخری انٹرویو کے لیے حکم ملا کہ "فلاں تاریخ شملہ حاضر ہو جاؤ" - یہ سن کر ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی - ہمارا خیال تھا کہ اگر آخری انٹرویو میں کامیابی نصیب ہو جائے تو انسان فی‌الفور لفٹین بن جاتا ہے اور باقاعدہ لفٹینی کرنے لگتا ہے اس بات کا علم نہ تھا کہ آخری انٹرویو اور لفٹینی کے درمیان ٹریننگ کا ایک خاصا مہلک وقفہ بھی ہوتا ہے -

چنانچہ ہم ایک نیم لفٹینی کے عالم میں شملہ روانہ ہوئے اور جب انٹرویو ہو چکا تو ہمیں محسوس ہوا کہ اب کسی لمحے سالم لفٹین ہوئے - کیونکہ انٹرویو تسلی بخش قسم کا ہوا تھا - ہم میں کوئی ایسی بنیادی خامی بھی نہ تھی - تعلیم کی شرط میٹرک تھی اور ہم نے تو میٹرک کے علاوہ کافی فالتو تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی - ہمارے خاندان کی فوجی خدمات کی فہرست بے شک ایسی طویل نہ تھی - لیکن ہم نے شجرۂ نسب کو تھوڑا سا کھینچ تان کر اس قدر صوبے دار چچوں اور کپتان چچا زادوں کا احاطہ کر لیا تھا کہ جرنیل صاحب کو مطمئن کرنے کے بعد

کچھ بچ بھی گئے تھے - بہرحال یہ راز ہمارے اور خدا کے درمیان ہی تھا - پولیس کی طرف سے صفائی کی بھی شرط تھی - تو ہم یوں بھی کبھی امن عامہ میں مخل نہیں ہوئے تھے - لیکن چونکہ پولیس والے بھی آخر انسان ہوتے ہیں ، لہٰذا ہم نے احتیاطاً ان کی انسانیت کا تقاضا بھی پورا کر دیا تھا -

شملے سے گھر پہنچے تو لفٹینی کے حکم کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے - ادھر چند عجلت پسند بزرگوں نے ہماری لفٹینی کے اعزاز میں پیشگی دعوتیں دینا شروع کر دیں -جنھیں ہم واجبی برخورداری مگر افسرانہ وقار کے ساتھ قبول کرتے رہے - آخر ایک دن ڈاکیہ تار لے کر آیا اور دور سے ہی بولا !

"لفٹین صاحب لفٹینی مبارک ہو - "

لیکن تار کھول کر پڑھا تو فقط اتنا لکھا تھا کہ تم او۱ - ٹی - ایس مہو میں ٹریننگ کے لیے چنے گئے ہو - ۸ اگست ۱۹۳۰ء کو حاضر ہو جاؤ -

یہ پڑھ کر کچھ مایوسی تو ہوئی - لیکن پھر سوچا کہ آخر لفٹینی ہے - یہ تھوڑا ہی ہے کہ یوں اٹھا کر بانٹ دی جائے - اس کے کچھ ادب آداب سکھانے ہوں گے،کچھ خفیہ گر بتانے ہوں گے کہ لفٹینی چلائی کیسے جاتی ہے چنانچہ خوشی خوشی دوستوں سے رخصت ہوئے - ہر طرف سے لفٹین صاحب کہہ کر پکارا جا رہا تھا جو ہمیں بے حد گوارا محسوس ہونے لگا - بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری نشست و برخاست اور لب و لہجہ سے بھی لفٹینی ٹپکنے لگی -

---

۱ - او-ٹی-ایس سے مراد آفیسر ٹریننگ سکول ہے جو ابتدائے جنگ میں مہو (وسط ہند) میں کھولا گیا تھا -

ریل کے سفر کے لیے درجہ اول کا ٹکٹ ملا - یہ بھی ہماری عالیجاہی کی علامت تھی - ٹکٹ دیکھنے والے ڈبے میں داخل ہوتے تو سر کہہ کر خطاب کرتے - خدا جانے انھیں کیسے محسوس ہو جاتا کہ یہ عام آدمی نہیں ، لفٹین ہے - بہرحال ہم ان سے وہی سلوک کرتے جو ایک افسر کو درمیانہ درجے کے سرکاری ملازم سے کرنا چاہیے - ہم سفروں میں انگریز بھی تھے - یہ لوگ اگر ہم سے بولنا چاہتے تو پہلے کہتے - "معاف کیجیے گا - " اور پھر عرض مدعا کرتے - ہمیں نہ صرف اپنی لفٹینی کا یقین ہو گیا بلکہ اس کی بلندی کا بھی احساس ہونے لگا - چنانچہ دلی سے آگے جب گاڑی میں ہم ایسے لفٹینوں کی تعداد کافی ہو گئی تو موضوع گفتگو زیادہ تر یہی رہا کہ لفٹینی اور کپتانی میں آخر فرق کیا ہے؟ اور اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ معمولی فرق ہے - چنانچہ رتلام اور مہو کے درمیان ہمارا مزاج عرش معلّی سے کچھ ہی ادھر تھا - بلکہ کئی ایک تو دبی زبان سے یہ بھی پوچھ رہے تھے کہ آخر ان تاریخ دانوں نے نپولین کو کیوں سر پر چڑھا رکھا ہے !

آخر مہو کا سٹیشن آیا - توقع تھی کہ ہمارے استقبال کے لیے فوج کا دستہ آئے گا بینڈ ہو گا - موٹریں ہوں گی جن کے ڈرائیور ہمارے لیے دروازہ کھولیں گے اور باادب باملاحظہ ہمیں اپنے بنگلوں تک پہنچا دیں گے - لیکن دیکھا تو یہاں کا بندوبست کسی قدر مختلف نظر آیا - استقبال کے لیے آدمی تو تھے لیکن ان میں ایسی وافر آدمیت نہ تھی - گاڑی رکی تو ہمارے ڈبے میں ایک گورا داخل ہوا - جس کے بازو پر تین سفید دھجیاں لگی تھیں - آتے ہی بولا :

"اگر اس ڈبے میں کوئی کیڈٹ ہے تو ابھی مت باہر نکلے ۔"

ہم بیٹھ تو گئے ، لیکن اس گورے کی زبان بے حد کھردری لگی ۔ علاوہ ازیں کیڈٹ کا لفظ سن کر کچھ تشویش سی ہوئی کہ ہم سے کوئی دھوکہ تو نہیں ہو رہا ۔ لفٹین تو لفٹین ہوا ۔ یہ کیڈٹ کیا جنس ہے ؟ چنانچہ ہمیں ذرا پختہ سا شبہ ہونے لگا کہ ان انگریزوں نے لفٹینی سے وصل کی کچھ خفیہ شرطیں بھی ٹھہرا رکھی ہیں جن سے ہمیں پہلے آگاہ نہیں کیا گیا ۔

جب سٹیشن دوسرے مسافروں سے خالی ہو گیا تو گورا پھر آیا اور ہم سب کو گاڑی سے باہر نکلنے کا گستاخانہ سا حکم دیا ۔ باہر نکلے تو دوسرے ڈبوں سے بھی تیس چالیس ہم جنس حضرات نکلتے دکھائی دیے ۔ سٹیشن پر تین چار اور گورے بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک جو بظاہر سینئر تھا، اچانک چلایا :

"سب کیڈٹ میرے سامنے قطار میں کھڑے ہو جائیں"

ہم نے کسی قدر حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کچھ بے دلی سے قطار بھی بنا لی ۔ گورا پھر چیخا ۔

"دائیں سے ایک دو تین بولو ۔"

ہم نے حکم کی تعمیل تو کی ، لیکن محسوس ہوا کہ یہ سلوک ہماری شان کے شایاں نہیں ۔ آخر ہم رنگروٹ تو تھے نہیں جو قطاریں بناتے پھرتے یا گنتی شروع کر دیتے ۔ بہرحال ہمیں تین ٹولیوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر وہی گورا بولا :

"باہر تین ٹرک کھڑے ہیں ، ہر ٹولی ایک ایک ٹرک میں سوار ہو جائے ۔"

ہمیں یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کچھ بھی ہو ، ہمیں ٹرکوں میں لے جانا شدید غلطی بلکہ بے ادبی ہے ۔

موٹرکاریں ہونا چاہیے تھیں ۔ مگر سوچا کہ ان معمولی ٹامیوں سے الجھنا ہمیں زیب نہیں دیتا ۔ چنانچہ ہم نے قلیوں کو آواز دی کہ ہمارا سامان ٹرکوں میں ہی رکھ دیں ۔ ہمارا یہ کہنا تھا کہ گورا گرج کر بولا ۔

"کیا کہا ، قلی ؟ تم فوجی سکول میں آئے ہو ۔ ہسپتال میں نہیں ۔ اپنا سامان خود اٹھاؤ ۔ ٹرکوں میں لادو ، اور اوپر بیٹھ جاؤ یا کھڑے رہو ۔ سمجھے ؟"

سمجھ تو آگئی اور ہماری خوش فہمیوں پر کچھ اوس بھی پڑی لیکن ہم سب نے حتی المقدور جلال میں آکر اس بے ادب ٹامی کو گھورے اور متفقہ غضب سے دیکھا اور کھڑے کھڑے فوجی زندگی کا پہلا فیصلہ کر ڈالا کہ جونہی لفٹین ہو گئے اس گستاخ گورے کا کورٹ مارشل کر دیں گے ۔ اس دلیرانہ فیصلے پر ہر طرف سے مرحبا کی صدا اٹھی ۔۔ اس وقت ہم کورٹ مارشل کو ، مارشل لاء کا قریبی رشتہ‌دار سمجھتے تھے ۔ اور گورے کے مستقبل کو دل ہی دل میں تباہ کر کے ٹرکوں پر سوار ہو گئے ۔

منزل مقصود کی جھلک توقعات سے بہت غیر مشابہ تھی ۔ ہماری جائے رہائش کے خد و خال بنگلے کی نسبت جیل سے زیادہ ملتے جلتے تھے ۔ ایک سنگین بلکہ سنگدل سی بارک تھی ، تنگ و تاریک اور طویل ، جس کے اندر دیواروں کے ساتھ آہنی چارپائیاں پڑی تھیں اور چارپائیوں پر ہمارے ناموں کی تختیاں آویزاں تھیں ۔ انھیں دیکھ کر ہمیں جھٹکا سا لگا ۔ گورا جیسے ہمارے خوف کو بھانپ گیا اور کڑک کر بولا :

"یہ تختیاں گلے میں لٹکانے کے لیے نہیں ، محض تمھاری نشستوں کے تعین کے لیے ہیں ۔ اب اپنی اپنی چارپائیاں ڈھونڈ

لو اور اپنا سامان وہاں اٹھا کر لے جاؤ۔"

ساتھ ہی ارشاد ہوا "کہ سامان اٹھانے اور چلنے پھرنے میں چستی دکھاؤ اور شور مت کرو"۔

ہمیں یہ آخری حکم خاص طور پر ناگوار گزرا۔ ہم نے پرانے فوجیوں سے سن رکھا تھا کہ یہ لفٹین لوگ ہر وقت گٹ پٹ گٹ پٹ کرتے رہتے ہیں۔ انھیں زبان بندی کا حکم دینا چھوٹے منہ کی بہت بڑی بدتمیزی ہے۔ ایک حضرت بولے: "ان جاہل گوروں کو کیا معلوم کہ ایک لفٹین کرنے پر آئے تو کیا کچھ کر سکتا ہے"۔ لیکن کچھ سوچنے کے بعد ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ کورٹ مارشل تک باوقار خاموشی اختیار کرنا ہی قرین مصلحت ہے۔

شام ہوئی تو کھانے کے لیے (Mess) میں گئے۔ یہ پہلی جگہ تھی۔ جہاں سے لفٹینی کے آثار نمایاں تھے۔ ہم سب ایک افسرانہ ٹھاٹھ سے ڈرائنگ روم میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مؤدب اور باوردی بیروں نے ہماری خواہش کے مطابق مشروبات پیش کیے۔ اس خوشگوار ماحول میں ہم نے سٹیشن اور بارک کے ان ناخوشگوار واقعات کو بھلا دیا جو ان گھٹیا خاندان کے گوروں سے سرزد ہوئے تھے اور ایک سرور کے عالم میں باہم گٹ پٹ گٹ پٹ کرنے لگے۔ اتنے میں دو خوش لباس انگریز اندر داخل ہوئے۔ یہ بھی فوجی وردیاں پہنے ہوئے تھے، لیکن ان کے بازوؤں پر تین دھجیاں نہ تھیں بلکہ کندھوں پر پیتل کے تین تین چمکتے ستارے تھے۔ یہ افسر تھے اور وہ سارجنٹ۔ ان کی وضع قطع، بات چیت اور طور طریقوں میں شائستگی اور وقار تھا۔ انھیں دیکھا تو فخر سا محسوس ہوا کہ اصولاً ہم اور یہ افسر ایک ہی لڑی کے موتی تھے۔ آج نہیں تو کل ہمارے کندھوں پر بھی وہی جگ مگ کرتے ستارے ابھرنے والے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد ساتھ کے کمرے میں کھانے کے لیے گئے ۔ انگریزی کھانے اور دیسی کھانے کے انداز میں تقریباً وہی فرق ہے جو انگریزی اور اردو بولنے میں ہے ۔ جس طرح ایک نوآموز کی زبان سے انگریزی الفاظ یا محاورے پھسل پھسل جاتے ہیں ، اسی طرح ہمارا انگریزی "مٹر گوشت" بھی ہمارے اناڑی چھری کانٹوں کی زد میں نہ آتا تھا ۔ ادھر ہاتھوں سے کھانا خلاف شان تھا ۔ لیکن برضا و رغبت فاقہ کرنا بھی ممکن نہ تھا ۔ لہٰذا جس طرح بولتے بولتے انگریزی جواب دے جائے تو اردو پر ہاتھ یا زبان صاف کر لی جاتی ہے ۔ اسی طرح جہاں انگریزی چھری کانٹے سے کام نہ چلتا ۔ ہم آنکھ بچا کر انگلیوں سے ہی بوٹی اچک لیتے ۔ گویا انگریزی کھانا اردو میں کھا لیتے ۔ بعض حضرات البتہ ایسے بھی تھے جو لفٹینی کے احترام میں اوزاروں کی وساطت کے بغیر کوئی چیز حلق سے اتارتے ہی نہ تھے ۔ ان میں سے کئی ایک کو دیکھا کہ چھری کانٹا لیے پلیٹ میں مٹروں کا تعاقب کر رہے ہیں اور مٹر ہیں کہ ادھر ڈوبے اُدھر نکلے ، اُدھر ڈوبے ، ادھر نکلے ، قصہ مختصر ، پیشتر اس کے کہ ان مومن مٹروں کو کوئی گزند پہنچتا ، بیرے پلیٹیں اٹھا کر چل دیے اور لفٹین صاحبان اپنا سا منہ اور چھری کانٹا لے کر رہ گئے ---- بعض اوقات یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ بیرا جو کچھ سامنے رکھ گیا ہے ، اس کے ساتھ سلوک کیا کرنا ہے ۔ چنانچہ کانی آنکھ سے ان انگریزوں کو دیکھتے اور پیچھے ان اماموں کے چمچے اور کانٹے اٹھا کر رکوع و سجود میں جاتے ۔

کھانا ختم ہوا تو اینٹی روم میں آئے اور کافی کا دور چلا ، لیکن تھوڑی دیر بعد دونوں انگریز کپتان اٹھ کھڑے ہوئے اور

یہ خوشگوار مجلس برخاست ہو گئی - یوں محسوس ہوا جیسے "در چشم زدن صحبت یار آخر شد" - وہاں سے اٹھ کر بارک میں واپس آئے تو وہی بدزبان گورا پہلے سے موجود تھا - سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

"کل صبح سات سو بجے پی - ٹی[۱] کے میدان میں حاضر ہونا ہے - لباس: بنیان، نکر اور ربڑ کے جوتے -"

اور اتنا کہہ کر اکڑتا ہوا چل دیا - گویا یہ گورا باز نہیں آ رہا تھا - وہی حرکتیں کرتا تھا جو لفٹینی کے منافی تھیں -

کسی نے پوچھا - "ارے یار یہ سات سو بجے کس بلا کا نام ہے -"

ایک صاحب بولے - "بے معنی بات ہے - گورا انگریزی غلط بولتا ہے -"

ایک فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہہ دیا - "اس کے معنی ہیں صبح سات بجے -" دن بھر کے تھکے تھے - صبح تیار ہوتے ہوتے ہم میں سے کئی ایک پی - ٹی کے لیے سات بجے سے ایک دو منٹ بعد پہنچے - کالج میں ہم گھنٹوں دیر سے پہنچا کرتے تھے اور اگر پروفیسر صاحب کے ماتھے پر ایک آدھ ہلکی سی شکن آ جاتی تو لمحے بھر میں بغیر استری کے ہموار بھی ہو جاتی تھی - لیکن اس گورے نے تو ہمیں ذرا دیر سے آتے دیکھا تو کچھ اس انداز سے چلّایا - گویا بھونچال آ گیا - رہیں اس کی پیشانی کی شکنیں، تو ان کی اصلاح کے لیے استری کی بجائے روڈ رولر درکار تھا - معلوم ہوا کہ گورا محض پھٹ ہی نہیں گیا، کچھ بول بھی رہا ہے لیکن اس کی انگریزی اس انگریزی سے بہت مختلف تھی جو ہم نے کتابوں میں پڑھی تھی - گورے کے الفاظ تو خیر ہماری سمجھ میں نہ آئے لیکن ان کی تاثیر ہمارے دلوں میں آناً فاناً

۱- فزیکل ٹریننگ یعنی ورزش -

سرایت کر گئی - کیونکہ اس کے ہر لفظ کے ساتھ ہماری رہی سہی لفٹینی بتدریج زائل ہو رہی تھی -

ہم خاموشی سے قطاروں میں کھڑے ہو گئے اور پی-ٹی شروع ہوئی - پہلے تو ہمیں میدان کے ارد گرد دوڑایا گیا یعنی ڈبل کرایا گیا (ڈبل کے یہ معنی ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوئے) بعد ازاں چند ایسے زاویوں پر جھکنے کا حکم ملا جو فطرت کی منشاء کے سراسر خلاف تھے - کوئی آدھ پون گھنٹے کی پ - ٹی کے بعد ہم تسخیر فطرت میں تو کسی قدر کامیاب ہو گئے ، لیکن ہماری اپنی ترکیب عناصر میں خاصا خلل آ گیا -

آخر پی - ٹی ختم ہوئی اور حکم ہوا کہ ناشتہ کے بعد پھر یہیں حاضر ہونا ہے اور وقت نو سو تیس بجے کا ملا - فوجی کیڈٹ سے معنی پوچھے تو معلوم ہوا کہ صبح کے ساڑھے نو بجے مراد ہے - ساتھ ہی یہ بھی کھلا کہ یہ گورا کمپنی سارجنٹ میجر ہے جس کی نافرمانی ایک کیڈٹ کی عاقبت کے لیے سخت مضر ثابت ہوتی ہے -

ناشتہ کے بعد جب میدان میں پہنچے تو سارجنٹ میجر کو غیر حاضر پایا - گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ غیر حاضر نہیں ہم ہی وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں - گویا فوجی ضبط کی پہلی خوراک ہی اس قدر زود اثر نکلی - صحیح وقت پر سارجنٹ میجر نمودار ہوا تو اپنی فتح پر ذرا مسکرایا ، لیکن فوراً منجمد ہو گیا اور ہمیں حکم دیا کہ "کوارٹر ماسٹر سٹور میں جا کر اپنے اپنے سائز کے بوٹ لے آؤ" -

بوٹ دیکھے تو محسوس ہوا کہ ہمیں پہننے کو وہ چیز دی جا رہی ہے جو گینڈوں کے پاؤں کے لیے زیادہ موزوں ہے اور جب پہن کر دو چار قدم چلنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے نانگا پربت گھسیٹ رہے ہیں - فوجی کیڈٹ نے آہستہ سے کہا

دیا کہ ان بوٹوں کے ساتھ تو ڈبل بھی کرنا پڑے گی۔ یہ سنا تو تمام سلسلۂ قراقرم سر پر آ پڑا۔

دو تین دن خاکی کپڑوں کی تیاری میں صرف ہو گئے اور ٹریننگ کے سلسلے میں فقط پی۔ ٹی ہوئی۔ لیکن جب خاکی یونیفارم تیار ہو گئی اور ہم نے بوٹ پٹی پہننا سیکھ لیا تو باقاعدہ ڈرل شروع ہوئی۔

ڈرل کے آغاز سے پہلے کپتان صاحب نے ہماری (Turn-out) یعنی یونیفارم وغیرہ کا معائنہ کیا اور معائنہ کیا کیا، گویا ہمیں خورد بین کے نیچے رکھ دیا۔ وہ عیب بھی ڈھونڈ نکالے جو درمیانہ قابلیت کا فرشتہ بھی نہ دیکھ پاتا، یا دیکھ بھی لیتا تو نظرانداز کر دیتا۔ ہم نے ڈرل میں شرکت سے پہلے فوجی کیڈٹ کو بوٹ، پٹی، نمبر، بٹن، پیٹی، فلیش وغیرہ دکھا لی تھی۔ لیکن کمپنی کمانڈر صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی جیسے پہچان لیا اور فرمایا:

"کیڈٹ نمبر ۱۵، کالر پر ایک سفید ذرہ (Incorrectly Dressed) سزا: تین ایکسٹرا ڈرل[۱]۔"

سارجنٹ میجر نے جو کاپی پنسل لیے کمپنی کمانڈر کے ارشادات قلمبند کر رہا تھا فوراً ہمارے اعمال نامے میں ہماری سزا کا اندراج کیا۔ کم و بیش ایسا ہی حشر ہر کیڈٹ کا ہوا۔ حتیٰ کہ بیچارے فوجی کیڈٹ بھی نہ بچ سکے جو بظاہر پیدا ہی یونیفارم میں ہوئے تھے۔

اس کے بعد ڈرل شروع ہوئی اور خوب تیزی اور تندی سے

۱۔ ایکسٹرا ڈرل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، معمولی لغزشوں کی سزا کے طور پر پچھلے پہر کرائی جاتی تھی۔ یعنی جب دوسرے لوگ تفریح میں مشغول ہوتے تھے۔ خاصی عذاب ناک چیز تھی۔

حکم ملنے لگے :

"سیدھے دیکھو ، چھاتی باہر ، ٹھوڑی اوپر ، بازو ہلاؤ ، ہالٹ ۔ ہلو مت ، مکھی مت اڑاؤ ۔ ہنسو مت ۔" وغیرہ وغیرہ ۔

ان سب میں "ہلو مت" کے حکم پر عمل کرنا عذاب عظیم تھا ۔ سیدھے بت بنے کھڑے ہیں کہ کان پر کھجلی محسوس ہوتی ہے ۔ اب ہاتھ کو جنبش دینا جرم ہے کندھا کان تک نہیں پہنچ سکتا ۔ کان کا خود ہلنا منشائے فطرت نہیں اور وہاں تک ہاتھ لے جانا منشائے سارجنٹ نہیں ۔ عین اس وقت ایک مکھی ناک پر نازل ہوتی ہے ۔ مکھی کو فنا کرنے کی بے پناہ خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے ۔ لیکن سارجنٹ سے آنکھ بچانا کراماً کاتبین سے آنکھ بچانا ہے ۔ مکھی پر دست درازی کا خیال آتا ہے تو سارجنٹ گویا ہاتھ ہلانے کے خیال ہی کو دیکھ لیتا ہے اور اپنی کاکنی[1] انگریزی میں چلا اٹھتا ہے :

"DON'T KILL NO FLY"

یعنی مکھی مت مارو ۔ ہاتھ وہیں کا وہیں سوکھ جاتا ہے اور مکھی نہایت اطمینان سے ناک کے نشیب و فراز کا معائنہ کرتی ہے ایسے اشتعال انگیز حالات میں بے حرکت کھڑے رہنا صحیح معنوں میں نفس کشی تھی ۔ اس وقت زندگی کی واحد خواہش صرف اتنی ہوتی کہ کب ڈرل ختم ہو اور جی بھر کر ناک اور کان کھجائیں اور بالآخر جب ڈرل ختم ہوتی اور ہم بلا خوف تعزیر کانوں کو چھو سکتے اور مکھیوں کو اڑا سکتے تو ہمیں محسوس ہوتا کہ کان کھجانا اور مکھی اڑانا بھی کس قدر عظیم عیاشی ہے ۔ بلکہ اسی خوشی میں وہ آبلے بھی بھول جاتے جو ان آہنی بوٹوں کے اندر ہی بنتے اور پھوٹتے تھے ۔

---

۱ ۔ لندن کے غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان ۔

ڈرل کے بعد تمام پیریڈ پڑھائی یا پستول اور مشین گن وغیرہ کی سکھلائی کے تھے - اگرچہ لیکچروں کے کمروں تک جانا بھی چپ راست یا ڈبل کے تابع تھا تاہم کمروں کے اندر دست و پا کی حرکات پر پابندی نہ تھی - مثلاً مکھی یا مچھر سے تحفظ ہمارے بس کی بات تھی - ان کی ناجائز پرواز پر ہم حسب ضرورت ہاتھ پاؤں ہلا سکتے تھے اور فقط اتنی سی آزادی سے زندگی میں کیف باقی تھا -

رات کو ڈنر پر گئے تو ذکر اس موضوع پر نہ تھا کہ ہماری لفٹینی کس مرحلے پر ہے بلکہ یہ کہ ڈرل میں کبھی ناغہ بھی ہوتا ہے یا نہیں - فوجی کیڈٹ کے اس انکشاف پر کہ اتوار کو مکمل چھٹی ہوتی ہے، بے اختیار اس کا منہ چومنے کو جی چاہا - جبین نیاز میں تشکر کے سجدے تڑپنے لگے اور اللہ تعالیٰ کی بیکراں نعمتوں میں سے اتوار کی تعطیل کا خصوصیت سے احساس ہونے لگا - اتوار کا انتظار ہم سے زیادہ کسی نے نہ کیا ہوگا - اب ہماری تمام تر دعائیں چھٹیوں اور بارش کے لیے وقف ہو گئیں اور لفٹینی کی عنایت کے لیے ہم نے اللہ تعالیٰ کو کبھی مزید زحمت نہ دی -

الغرض لفٹینی کا وہ حسین و جمیل قصر جسے ہم نے تصورات کے موقلم سے بنایا اور سجایا تھا، پہلے روز ہی منہدم ہو گیا - اور یہ ابھی ابتدا تھی جو کچھ آگے ہوا، اس کی روداد طویل بھی ہے اور جانگسل بھی - مختصر یہ کہ پہلی ڈرل میں پاؤں فگار ہوئے تھے - چند روز میں رائفل ملی تو سلوپ (SLOP) کرتے کرتے ہاتھ بھی خونچکاں ہو گئے - رائفل پر سنگین کا اضافہ ہوا اور مصنوعی دشمن کو مارنے کی مشق کرائی جانے

لگی تو تقریباً خودکشی ہو کر رہ گئی۔ میلوں بے آب و دانہ مگر باپٹھوا مارچ کیا ۔ حتیٰ کہ ان کافر بوٹوں کے دل بھی موم ہو گئے ، لیکن کسی سارجنٹ کو رقت نہ ہوئی ۔ مسلسل کھدائی سے ارض مہو کا سینہ شق ہو گیا لیکن کمپنی کمانڈر کا دل نہ پگھلا ۔ کمانڈنٹ صاحب نے ہمارے کھودے ہوئے مورچوں کے ہر خط اور زاوے کا جائزہ لیا لیکن ہمارے زخم جگر کی خبر نہ لی۔ لیمچ۲ روڈ کے چپے چپے پر ہم نے رنجور قدموں کے نقوش چھوڑے ۔ ھیا۳ پہاڑی کے ہر سنگریزے پر ہم نے آبلے پھوڑے۔ ہماری ہر صبح چوبی گھوڑے پر سے کودنے اور رسے پر چڑھنے میں صرف ہوئی اور ہماری ہر شام بے مرچ اور بدذائقہ انگریزی ڈنر کی وجہ سے حرام ہوگئی ۔ ایکسٹرا ڈرل سے بچنے کے لیے ہسپتال میں داخل ہونے کی بارہا کوشش کی لیکن ناکام رہے ۔ دیسی کھانے کے لیے باورچی کی ہزار منتیں کیں ، لیکن بدبخت سارجنٹ کے ڈر سے راضی نہ ہوا، جی چاہتا کہ اگر سارجنٹ کو نہیں تو کم از کم باورچی ہی کو قتل کر ڈالیں ۔ لیکن اگر اس کی ہمت بھی ہوتی تو فرصت کہاں تھی ؟ اور آخر ایک روز فرصت ملی تو معلوم ہوا کہ لفٹین ہو گئے ہیں !

---

۱ - پٹھو سازو سامان کا وہ وزنی تھیلا ہے جو مارچ کرتے وقت پشت پر اٹھایا جاتا ہے ۔

۲ - مہو کے نواح میں ایک سڑک ہے جس پر اکثر مارچ کیا جاتا تھا ۔

۳۔ ھیا ایک مشہور پہاڑی کا نام ہے جو مہو سے چند میل دور ہے اور جہاں اکثر فوجی مشقیں کی جاتی تھیں ۔

لیکن یہ لفٹینی ہم پر دوسرے جمعے ہی نازل نہیں ہو گئی بلکہ بیچاری نرگس کی طرح پورے نو مہینے ہمیں اپنی بے نوری پر رونا پڑا ۔

سوالات اور مشقیں

۱ ۔ یقین ہے کہ مضمون پڑھ کر آپ کو بڑا لطف آیا ہوگا مضمون شروع سے آخر تک ایسا ہے کہ آدمی پڑھتا جائے اور اس کا دل خوش ہوتا رہے ۔ ذرا سوچیے کہ آپ کو مضمون کی کون کون سی باتیں پڑھ کر لطف آیا یا ہنسی آئی ۔ ایک بات ہم بتاتے ہیں ۔ مضمون کو اس نظر سے دیکھیے تو اس کی ادبی شان بڑھ جاتی ہے ۔ وہ بات کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ مضمون نگار نے کئی جملے ایسے لکھے ہیں جن میں کسی نہ کسی مشہور شعر کے بعض لفظ بڑی خوبصورتی اور بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں ۔ ذیل میں ہم چند اشارے لکھتے ہیں ۔

۱ ۔ سبق کا عنوان فارسی کے مشہور شاعر حافظ کے اس مصرعے سے لیا گیا ہے ۔ ع

"کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکلہا"

یعنی محبت شروع میں تو آسان معلوم ہوئی تھی لیکن آگے چل کر بڑی مشکلیں پیش آئیں ۔

۲ ۔ سبق کا ایک جملہ ہے " ۔ ۔ ۔ ۔ ان انگریزوں نے وصل کی کچھ خفیہ شرطیں بھی ٹھہرا رکھی ہیں" اسے پڑھ کر اکبر الہ‌آبادی کی ایک مشہور نظم یاد آتی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے ۔

یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ تو استعفاٗ مرا باحسرت و یاس

۳ ۔ "اور مٹر ہیں کہ ادھر ڈوبے ادھر نکلے" اس جگہ اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے ۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے ادھر نکلے

۴ - "جبین نیاز میں تشکر کے سجدے تڑپنے لگے" اقبال کا شعر ہے

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

۲ - ذیل کے جملوں میں کسی نہ کسی مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے کوشش کرکے معلوم کیجیے کہ اشارہ کن شعروں کی طرف ہیں -

۱- پہلی ڈرل میں پاؤں فگار ہوئے تھے -- ہاتھ بھی خونچکاں ہو گئے"
۲- تمام تر دعائیں ---- وقف ہو گئیں"
۳- "بیچاری نرگس کی طرح --- رونا پڑا"

حصهٔ نظم

میر تقی میر

محمد تقی میر (۱۷۲۴-۱۸۱۰ء)، آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر تقی تھا۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ تلاش معاش میں دہلی گئے مگر ناکام واپس لوٹے۔ کچھ عرصہ خانہ نشینی میں گزارا۔ پھر مجبور ہو کر نکلے، مختلف راجاؤں اور نوابوں کی ملازمت کی آخر عمر میں لکھنؤ پہنچے اور وہیں وفات پائی۔

میر صاحب مرحوم نے نہایت قانع اور غیور طبیعت پائی تھی۔ اپنے سامنے حکومتوں کو مٹتے اور بنتے دیکھا تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز نے طبیعت میں سوز اور درد مندی پیدا کر دی تھی۔ یہی سوز و دردمندی ان کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

میر صاحب مرحوم ایک پرگو اور قادرالکلام شاعر تھے۔ اردو کے مقبول شعرا نے انھیں استاد مانا ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

(ذوق)

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔

(غالب)

میر صاحب کے اردو میں چھ دیوان اور کئی مثنویاں ہیں۔

سادگی ، صفائی ، دردمندی اور مایوسی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں - ان کے درد بھرے اشعار پڑھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے یہ اس کے اپنے دل کی بات ہے -

(۱)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت ؟
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیداد گری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

----

(۲)

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

----

(۳)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خون تھا مژہ پر جم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ جیتا یاں بہت دن کم رہا

------

(۴)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ! جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے

دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

جبیں سجدے کرتے ہی کرتی گئی
حق بندگی ہم ادا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

- - - - - - - -

خواجه میر درد

سید خواجہ میر (۱۱۳۳-۱۱۹۹ء) نام اور درد تخلص تھا ۔ باپ کا نام خواجہ محمد ناصر تھا ۔ میر درد نے اپنے باپ کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی ۔ قرآن ، حدیث اور تفسیر و فقہ میں نام حاصل کیا ۔ تصوف میں بڑی دستگاہ پائی ۔ ۳۹ برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا ۔ اور میر درد نے ان کی جگہ لی ۔ خواجہ صاحب کی طبیعت میں توکل ، استغنا اور استقلال اس قدر تھا کہ جب آپ کے سامنے مرہٹوں نے دہلی کو لوٹ کر برباد کر دیا تو ہر شخص جان بچانے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ گیا ۔ لیکن انھوں نے دلی کو نہ چھوڑا ۔ دلی کے سب شاعر جن میں میر اور سودا بھی شامل تھے ، دلی چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے ، لیکن وہ اللہ پر بھروسا کرکے مستقل مزاجی سے دلی ہی میں رہے ۔

ان کے کلام میں درد ہے ۔ غزلوں میں معرفت الٰہی اور تصوف کے اچھوتے مضامین کی کثرت ہے ۔ ان کی غزلیں اپنی سادگی اور صفائی میں میر تقی میر کی غزلوں کا مقابلہ کرتی ہیں ۔ اردو کے دیوان کے علاوہ فارسی کا دیوان اور تصوف کی بعض کتابیں ان کی یادگار ہیں ۔

(۱)

مدرسہ یا دیر تھا ، یا کعبہ یا بتخانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں، تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی ! کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

ہو گیا مہمان سرائے کثرت موہوم آہ !
وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا ، خوش رہ ، عبث وے سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے ، آشنا تھا یا نہ تھا

------

(۲)

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسی نے کبھی وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت ، مصیبت ، ملامت ، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سرو چراغاں
کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے درد درپے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

------

(۳)

اپنی قسمت کے ہاتھوں داغ ہوں میں
نفس عیسوی چراغ ہوں میں

ہوں فتادہ برنگ نقش قدم
رفتگاں کا مگر سراغ ہوں میں

دونوں عالم سے کچھ پرے ہے نظر
آہ کس کا دل و دماغ ہوں میں

میں ہوں گلچین گلستان خلیل
آگ میں ہوں پہ باغ باغ ہوں میں

عین کثرت میں دید وحدت ہے
قید میں درد بافراغ ہوں میں

(۴)

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے ہم، کیا کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے ہے صبا
ایکدم آئے ادھر اودھر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

خواجہ آتش

حیدر علی نام (۱۷۶۴-۱۸۴۶ء) اور آتش تخلص تھا - باپ کا نام خواجہ علی بخش تھا جن کا تعلق دہلی کے ایک معزز خاندان سے تھا - نواب شجاع الدولہ کا عہد تھا کہ خواجہ علی بخش نے دلی کو چھوڑا اور فیض آباد میں سکونت اختیار کی- یہیں خواجہ حیدر علی پیدا ہوئے - عالم طفولیت تھا کہ یتیم ہو گئے - اس لیے اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے - اور نواب مرزا محمد تقی کی ملازمت کر لی - ان کے ساتھ ہی لکھنئو پہنچے - ان دنوں مصحفی اور انشا کے مقابلے زوروں پر تھے انھیں بھی شعر کا شوق ہوا - مصحفی کے شاگرد ہوئے - اور بہت جلد صاحب طرز شاعر بن گئے -

آتش کو سپاہیانہ وضع بہت پسند تھی - چنانچہ اگرچہ لباس اور وضع سادہ تھی - مگر تلوار باندھتے تھے - ان کے اشعار میں تصنع اور تکلف کو بہت کم دخل ہے - محاورات اور پیاری پیاری تراکیب سے ان کا کلام پسندیدۂ خاص و عام ہے -

ساری عمر قناعت و توکل پر گزری - اسی روپے مہینہ سرکار سے ملتا تھا - ان کے مزاج میں سادگی بہت تھی - غریبانہ زندگی سے ساری عمر محبت رہی -

(۱)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

زیر زمین سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اڑتا ہے شوق راحت منزل سے اسپ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

بے تاب ہے کمال ہمارا دل حزیں
مہماں ، سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا

یاں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے لکھی عاشقانہ کیا

----

(۲)

موت مانگوں، تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں ، تو دریا ملے پایاب مجھے

میری ایذا کے لیے مردے میں جان آتی ہے
کاٹنے دوڑتی ہے ماہئی بے آب مجھے

دہن گرگ سے جیتا جو بچوں صحرا میں
ذبح کرنے کے لیے ، مول لے قصاب مجھے

نہیں بھولا ہے جنوں میں ، وہ حواس اڑ جاتا
یاد ہے برہمئی صحبت احباب مجھے

دل غنی چاہیے ، گو ہوں میں فقیر اے آتش
شیر کی کھال ہی ہے قاقم و سنجاب مجھے

(۳)

دہن پر ہیں ، ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمین چمن ، گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ گور سکندر ، نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

-----

(۴)

ہوائے درد مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایت پروردگار راہ میں ہے

سفر ہے شرط ، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے ، دشمن ہزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل ، نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں ، خار راہ میں ہے

مرزا اسداللہ خان غالب

غالب (۱۷۹۶-۱۸۶۹ء) کے حالات آپ کتاب کے حصہ نثر میں پڑھ چکے ہیں - وہیں ان کی نثر کی خصوصیات بھی بیان کی گئیں اب ان کی شاعری کا تعارف کرایا جا رہا ہے -

غالب کو اردو شاعری میں وہ شہرت حاصل ہوئی جو اس سے پہلے سوائے میر کے اور کسی کے حصے میں نہ آئی تھی - اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کا کلام سر تا سر جدتوں اور ندرتوں کا مرقع ہے - غالب نے جذبے اور فکر کے امتزاج سے غزل میں ایک ایسے انداز کی بنیاد رکھی جس سے ہر دور کا انسان اثر قبول کرتا ہے - ان کے اشعار میں زندگی کے مشاہدات اور انسانی تجربات کا بیان اس طرح ہوا ہے کہ ہر پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ غالب نے جو کچھ کہا ہے وہ اسی کے دل کی بات ہے - غالب کا شعر ہے -

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ شعر بہ لفظ خود ان کی شاعری پر تبصرہ ہے -

غالب کے کلام میں حسن بیان کی جدت نے بڑی شگفتگی اور لذت پیدا کی ہے - اس سے دل اور دماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں -

(۱)

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

----

(۲)

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

داغ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

------

(۳)

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

----

(۴)

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء) کے حالات زندگی بھی آپ حصہ نثر میں پڑھ چکے ہیں ۔ مولانا ایک اچھے نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے ۔

بحیثیت شاعر مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو نظم میں کامیاب انقلابی تجربے کرے ۔ اسے تکلف اور مبالغے سے پاک کر کے اصلیت اور حقیقت سے روشناس کیا اور سادہ و آسان زبان میں اظہار خیال کو رواج دیا ۔ حالی کو غالب کی صحبت میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا ۔ انھوں نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بھی اثر قبول کیا ۔ انھوں نے پرانے طرز کی غزلیں بھی کہی ہیں اور جدید رنگ کی بھی ۔ ان کی قدیم رنگ کی غزلوں میں عاشقانہ جذبات ایسے مہذب و معتدل انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی پاکیزگی اور بے تکلفی سے متاثر ہوتا ہے ، پھر زبان کی گھلاوٹ ، سادگی اور لہجے کا دھیما پن ان کی غزل گوئی کو اور بھی چار چاند لگا دیتا ہے ۔ ان کی جدید غزلوں میں اخلاقی تلقین اور پند و نصیحت کی باتوں سے کہیں کہیں پھیکا پن ضرور پیدا ہو گیا ہے ۔ لیکن حالی نے یہ سب کچھ پورے خلوص سے کہا ہے اور اپنے مخصوص سادہ و نرم انداز میں کہا ہے اس لیے درد و اثر سے خالی نہیں ۔

اچھے غزل گو ہونے کے علاوہ حالی

''جدید اردو نظم'' کے بانیوں میں سے ہیں ۔ انھوں نے لاہور میں مولانا آزاد کے ساتھ مل کر اردو شاعری کی اصلاح کا کام کیا اور جدید شاعری کو فروغ دینے کے لیے نہ صرف بہت سی عمدہ و دلکش نظمیں لکھیں بلکہ اس کی ضرورت اور اصولوں کی اشاعت تحریر و تقریر ہر طرح سے مسلسل کرتے رہے ۔ ان کی طویل نظموں میں ''برکھا رت'' ''نشاط امید'' ''مناظرۂ رحم و انصاف'' ''حب وطن'' وغیرہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

تقریباً چار سال لاہور میں رہنے اور جدید شاعری کا آغاز کرنے کے بعد حالی دہلی چلے گئے جہاں ان کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہو گئی ۔ انھیں کے کہنے پر حالی نے اپنا مشہور مسدس ''مدوجزر اسلام'' لکھا اور اردو میں قومی شاعری کی ابتدا کی ۔ مسدس کے اشعار میں مولانا نے قوم سے محبت کرنے ، جدوجہد میں ثابت قدم رہنے اور علم حاصل کرنے کی تلقین کی ہے اور قوم کو بزرگوں کے شاندار کارنامے یاد دلا کر مستقبل کو سنوارنے کی دعوت دی ہے ۔

غرض حالی کا سارا کلام اصلیت ، سادگی اور جوش کا عمدہ نمونہ ہے اور وہ ہمارے ان محسنوں میں سے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو تفریح و وقت گزاری کے محدود دائرے سے نکال کر قومی اصلاح کا ذریعہ بنایا ۔

(۱)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح، رہے رات بھر کہاں

----

(۲)

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دل پر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

(۳)

واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا
منہ اسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

آؤ اس کو لیں ہمیں جا کر منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی
مرحلے اب دیکھیے پیش آئیں کیا

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا

مان لیجے شیخ جو دعوےٰ کرے
اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

----

(۴)

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی
الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

غیبت ہو یا حضوری دونوں بری ہیں تیری
جب بد گمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر، ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی تک قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آگے آنی گرانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یا خوں فشانیاں ہیں یا گلفشانیاں ہیں

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین نام، اکبر (۱۸۴۶-۱۹۲۱ء) تخلص اور ''لسان العصر'' لقب تھا۔ قصبہ بارہ ضلع الہ آباد میں پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ملازمت شروع کی اور نائب تحصیلدار ہو گئے مگر اس سے مطمئن نہ ہوئے۔ قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت کرنے لگے۔ پھر منصف ہو گئے رفتہ رفتہ ترقی کرکے جج بنے اور اسی عہدہ جلیلہ سے سبکدوش ہو کر پنشن لی۔

اکبر بڑے زندہ دل اور شوخ مزاج انسان تھے۔ طبیعت کا یہ رنگ ان کی شاعری میں ظرافت اور طنز کی صورت اختیار کر گیا۔ ان کی شاعری کا ایک خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مغربی تہذیب و معاشرت کے مضر اثرات سے محفوظ رکھا جائے اور انھیں اپنے مذہب اور مشرقی تہذیب و تمدن کا شیدائی بنایا جائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اپنی شاعری میں ظرافت سے کام لیا اور ہنس ہنس کر دلوں میں چٹکیاں لینا شروع کیں۔ انھوں نے طنز کے نشتر بھی چبھوئے ہیں مگر جوش و غضب کے ذریعے سے نہیں بلکہ ہنسی اڑا کر۔

اکبر نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے زبان بھی خود ہی ایجاد کی جس میں عام بول چال کے الفاظ علمی و شاعرانہ الفاظ نئے رواج پانے والے انگریزی کے الفاظ نئی

سیاسی اور قومی اصطلاحیں وغیرہ استعمال کرکے ایک حیرت انگیز مرکب بنایا۔ پھر اس زبان کو ایسے سلیقے اور ہوشمندی سے برتا کہ قومی زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں کی نکتہ چینی بھی ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے محظوظ بھی ہوتے ہیں۔ غرض ظریفانہ اور طنزیہ شاعری میں اکبر ایک بے مثال شاعر ہیں جن کا کلام ہر زمانے میں قدر کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ان کے کلام کا مجموعہ کلیات اکبر کے نام سے پانچ حصوں میں چھپ چکا ہے۔ ایک کتاب ''گاندھی نامہ'' بھی ہے۔

(۱)

خدا کا نام روشن ہے، خدا کا نام پیارا ہے
دلوں کو اس سے قوت ہے زبانوں کو سہارا ہے

خدا ہی ہے زمین و آسماں کا خالق و مالک
اسی کی قدرت و صنعت نے عالم کو سنوارا ہے

تماشا اسکی قدرت کا ہے بر و بحر میں ہردم
ادھر موجیں ہوا کی ہیں آدھر پانی کا دھارا ہے

اسی کے حکم سے ہے رات دن کی یہ کمی بیشی
اسی کے حکم کے تابع فلک پر ہر ستارا ہے

اسی کے حکم سے پھل اور غلے کی ہے پیدائش
زمیں پر بدلیوں سے اس نے پانی کو اتارا ہے

اسی کے انتظام و حکم سے موسم بدلتے ہیں
وہی ہے وقت پر جس نے ہواؤں کو ابھارا ہے

زمیں پر سبزہ و گل کی نمودیں کیسی پیاری ہیں
فلک پر چاند سورج کا بھی کیا دلکش نظارہ ہے

کوئی ذرہ نہیں عالم میں اس کے حکم سے باہر
جو مرضی اسکی ہے دخل اس میں دے یہ کس کو یارا ہے

وہی دنیا میں ہے اس زندگی و موت کا خالق
ہر اک کو اپنی مرضی سے جلایا اور مارا ہے

دو روزہ زندگی ہے جاہ و حشمت پر نہ ہو غافل
فریدوں ہے نہ کیخسرو، سکندر ہے نہ دارا ہے

یہ جب تک سانس چلتی ہے سمجھتے ہیں ہمیں ہم ہیں
اجل جب سر پہ آ پہنچی تو پھر کیا بس ہمارا ہے

کرو طاعت خدا کی بس وہی معبود برحق ہے
اسی کی شان یکتائی جہاں میں آشکارا ہے

اگر اعمال اچھے ہیں، تو پاؤگے بڑے درجے
سمجھ لو امتحان اس دار فانی میں تمھارا ہے

بزرگوں کا ادب، اللہ کا ڈر، شرم آنکھوں میں
انہیں اوصاف کی نسبت مذاہب میں اشارا ہے

(۲)

ہو اگر ہمت عالی دل آگاہ کے ساتھ
غیر ممکن ہے محبت نہ ہو اللہ کے ساتھ

طفل دل چھوڑے نہ داماں قناعت ہرگز
یہی بہتر ہے رہے اپنے ہی خواہ کے ساتھ

بے بصیرت پہ ہدایت نے کیا کچھ نہ اثر
ہے یہ افسوس کہ آنکھیں نہ کھلیں راہ کے ساتھ

رنگ تیرا ہمیں مطبوع نہیں اے دنیا
تجھ میں ہم جی تو رہے ہیں مگر اکراہ کے ساتھ

دیکھیے ربط نسیم سحر و غنچۂ گل
یونہی دل کھول کے ملتے ہیں ہوا خواہ کے ساتھ

-----

(۳)

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کہ کس پر کیا گزرتی ہے

نئے عنصر نہیں آتے چمن میں گل کھلانے کو
یہی ذرے ابھرتے ہیں یہی مٹی سنورتی ہے

وہ دو ذرے بلا اذن خدا ہل ہی نہیں سکتے
کہ جن کے میل سے سائنس کی قوت اُبھرتی ہے

جو ہیں اہل بصیرت اکثر آنکھیں بند رکھتے ہیں
نظر اچھے دلوں کو بھی کبھی بدنام کرتی ہے

زبانیں مختلف بھی ہوں اگر دو حق پرستوں کی
بہم نبھ جاتی ہے، نیت کی خوبی کام کرتی ہے

-----

(۴)

ہوں میں پروانہ، مگر شمع تو ہو رات تو ہو
جاں دینے کو ہوں موجود، کوئی بات تو ہو

دل بھی حاضر، سر تسلیم بھی خم کو موجود
کوئی مرکز ہو کوئی قبلۂ حاجات تو ہو

دل تو بے چین ہے اظہار ارادت کے لیے
کسی جانب سے کچھ اظہار کرامات تو ہو

دل کشا بادۂ صافی کا کسے ذوق نہیں
باطن افروز کوئی پیر خرابات تو ہو

گفتنی ہے دلِ پردرد کا قصہ لیکن
کس سے کہیے کوئی مستفسر حالات تو ہو

وعدے بھی یاد دلاتے ہیں گِلے بھی ہیں بہت
وہ دکھائی بھی تو دیں ان سے ملاقات تو ہو

کوئی واعظ نہیں فطرت سے بلاغت میں سوا
مگر انسان میں کچھ فہم اشارات تو ہو

نظر اللہ پہ رکھ ہو نہ پریشاں اکبر
لے مصلے کو، ذرا صرف مناجات تو ہو

علامہ اقبال

محمد اقبال نام، اقبال (۱۸۷۳-۱۹۳۸ء) تخلص، سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور فلسفے میں ایم۔ اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے۔ کچھ عرصہ کیمبرج اور لندن یونیورسٹی میں گزارا۔ جرمنی میں انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ وطن واپس آکر انھوں نے لاہور میں وکالت شروع کی۔ ساتھ ہی ادبی، سیاسی اور قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے اور یہ سلسلہ کم و بیش آخری دم تک جاری رہا۔

اقبال ہمارے سب سے بڑے اور مقبول ترین قومی شاعر ہیں۔ ان کی شہرت پاک و ہند کی سرحدوں سے نکل کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل چکی ہے اور ان کے کلام کے ترجمے یورپی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ اقبال نے حالی، شبلی اور اکبر کے اصلاحی کام کی تکمیل کی اور اپنی قومی شاعری کے ذریعہ مسلمانان عالم کے سامنے مستقبل کا صحیح نقشہ پیش کیا اور اپنے اہل وطن کو عمل، آزادی، جدو جہد اور عالم گیر اخوت کے پیغامات دیے ہیں۔ خودی ان کی تعلیم کا مرکز ہے۔ اس لحاظ سے آپ اردو شاعری میں ایک نئے دور کے بانی ہیں۔

اقبال کی شاعری اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک درس اور

دعوت فکر و عمل ہوتے ہوئے بھی زبان و بیان کا حسن و لطافت اور طرز ادا کی بے پناہ دلکشی و خوبصورتی موجود ہے ۔ انھوں نے نظم اور غزل دونوں کو بہت ترقی دی اور زبان میں نئے نئے الفاظ ، تراکیب ، تشبیہیں ، استعارے اور مصطلحات استعمال کر کے اس کو مالا مال کر دیا ۔ ان کا کلام فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ہے ۔ بانگ درا ، بال جبریل ، ضرب کلیم اردو کے مجموعے ہیں اور ارمغان حجاز کا بھی ایک حصہ اردو میں ہے ۔

(۱)

مجنوں نے شہر چھوڑا ، تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ ! کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
رستہ بھی ڈھونڈ ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بت‌خانہ بھی ، حرم بھی ، کلیسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں ، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

(۲)

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنون تھے، وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی ، مگر نیا خار زار ہوگا

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ میں نے قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

(۳)

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے ، نیلے نیلے ، پیلے پیلے پیرہن

برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

(۴)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

مرزا محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا (۱۷۱۳-۱۷۸۱) اقلیم سخنوری کے شہنشاہ، اردو میں قصیدہ گو کی حیثیت سے ان کا وہی مقام ہے جو فارسی میں خاقانی اور انوری کا ہے - میر تقی میر جنھیں لوگ خدائے سخن کہتے ہیں وہ بھی ان کے کمال شاعری کے قائل ہیں اور انھیں ریختہ گویوں کا انتخاب کہتے ہیں -

سودا کے بزرگ کابل کے باشندے تھے - ان کے والد مرزا محمد شفیع ایک تاجر کی حیثیت سے کابل سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا - سودا یہیں پیدا ہوئے - تعلیم سے فارغ ہوئے تو شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے اور اپنے کلام کے زور کی بدولت بہت جلد خاص و عام میں مقبولیت پائی - شہرت شاہ عالم بادشاہ تک پہنچی تو وہ ان کے شاگرد ہوئے - مرہٹوں نے جب دہلی کو لوٹا اور یہاں شریفوں کے لیے رہنا مشکل ہو گیا تو وہ بھی لکھنئو چلے گئے اور وہاں کے دربار میں ملک الشعرا کے خطاب سے سرافراز ہوئے - ہجو اور قصیدے میں ان کا مرتبہ بہت بڑا ہے - بندش کی چستی ، خیالات کی بلندی اور فصاحت و بلاغت کا امتزاج ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں - کلام میں میر کی سی سادگی کے بجائے لفظوں کی شان و شوکت ہے - میر کے کلام کو کسی نے "آہ" کہا تھا اس کے مقابلے میں ان کا کلام "واہ" ہے -

"شہر آشوب"

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعوے نہ کرے یہ کہ میرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ رے کیا نظم بیاں ہے
اتنا میں کیا عرض کہ فرمائیے حضرت
آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یاں ہے
سن کر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا
اس امر میں قاصر تو فرشتے کی زباں ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے کی کئی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے
گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سوا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے
گر ہو جیے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب
اس کی تو اذیت ہے بڑی آفت جاں ہے
وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل
ہر شام بہ دل وسوسۂ سود و زیاں ہے

لے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سنیے تو عجب طرفہ بیاں ہے

قیمت جو چکاتے ہیں تو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے

جس روز سے کاتب کا لکھا حال میں تب سے
ہر صفحۂ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے

وہ بیت نکے سینکڑے لکھنے کو ہے محتاج
خوبی میں خط اب جس کا بہ از خط بتاں ہے

یہ بھی میں تکلف ہی سے کہتا ہوں وگرنہ
آفاق میں ان چیزوں کی اب قدر کہاں ہے

دمڑی کو کتابت لکھیں، دھیلے کو قبالہ
بیٹھے ہوئے واں میر علی چوک جہاں ہے

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت
چھٹتے ہی تو شعرا کی وہ مطعون زباں ہے

دیتا ہے دم خر سے کوئی شعلے کو نسبت
گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھ کر
ہے آج کدھر عرس کی شب، روز کہاں ہے

تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی
لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد
کوئی کودے، کوئی رووے، کوئی نعرہ زناں ہے

اور ماحصل اس رنج و مصیبت کا جو پوچھو
ڈالا ہوا واں دال نخود قلیہ و ناں ہے

سب پیشے یہ تج کر جو کوئی ہو متوکل
جورو تو سمجھتی ہے نکھٹو یہ میاں ہے

آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے

دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے

سو اس پہ تیقّن کسی کے دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی گوئندہ ہی کا محض گماں ہے

یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست نہ یاں ہے نہ وہاں ہے

"آمد بہار"

اٹھ گیا بہمن و دی کا چمنستان سے عمل
تیغ آردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عز و جل

واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آبجو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھینٹ قلمکار بھر دشت و جبل

عکس گلبن یہ زمین پر ہے کہ جس کے آگے
کار نقاشئ مانی ہے دوم وہ اول

تار بارش میں پروتے ہیں گہرہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

بار ہے آب رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بیکل

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمئی نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوِ زمین کے بھی جو پھوٹے کونپل

دم عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دین میں قسم جمادات سے شاید ہو خلل

فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی
کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل

دست گل خوردہ و شاخ گل و گلزار بہم
بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل

یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا
چاہتی ہے بسماجت کرے سبزے سے بدل

چشم نرگس کی بصارت کے زبس ہے درپے
غنچۂ لالہ نے سرمے سے بھری ہے مکحل

اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشم سیار گلستاں میں جھپکتی نہیں پل ؟

آبجو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول

سایہ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
ساغر لعل میں جوں کیجے زمرد کو حل

سنگ نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا
تیغ کہسار ہوئی بسکہ ہوا سے صیقل

برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے
گل کو دیکھو تو نگہ جا رہے سنبل پہ پھسل

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

دانہ جس شور زمین سے نہ پھلا دہقاں سے
سبز واں دانہ شبنم سے ہوا ہے جنگل

جوہری کو چمنستان جہاں میں اس فصل
آ گیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل

"موسم سرما"

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

ان دنوں چرخ پر نہیں ہے مہر
گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر

کُہرہ پڑنے کو کہتے ہیں سب یار
ٹھنڈ سے ہے جہاں کے دل میں غبار

لیک دیکھا جو غور سے میں آپ
نکلے ہے منہ سے آسماں کے بھاپ

پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے
سبز وہ شال کی رضائی ہے

صرصر صبح جان کھوتی ہے
تیر سی دل کے پار ہوتی ہے

باد سے دانت کھڑکے ہیں اس بھانت
کہے تو باجتے ہیں دانت سے دانت

بے حرارت ہیں سردی کے مارے
طرح یاقوت کے اب انگارے

دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات
کالے کمبل میں رات کاٹے رات

شب جو رخشندگی پہ برق آوے
ابر میں یوں ٹھٹھر کے رہ جاوے

کیا کروں اس کی یارو میں تقریر
جوں کسوٹی پہ سونے کی ہو لکیر

فرط سرما سے دیکھیے جس کو
دست زیر بغل ہے مثل سبو

لیٹے رہتے ہیں روئی میں مجبور
جس طرح ناشپاتی و انگور

اہل حرفہ پہ کیجیے جو نگاہ
کاروبار ان کا ہو گیا ہے تباہ

پیٹ کر سر کہے ہے بھٹیارا
ہائے اب کیا کروں میں بے چارا

سقہ بولے ہے بھر کے آنکھوں میں اشک
یارو پانی نکالو چیر کے مشک

غرض ایسی ہی کچھ پڑے ہے ٹھنڈ
مٹ گیا زمہریر کا بھی گھمنڈ

سودا آخر ہے سردی کا مذکور
شعر بھی گر خنک ہوں رکھ معذور

آگے جاتا نہیں ہے اب بولا
ہو گئی ہے زباں بھی اولا

مشق

۱- پہلی نظم سودا کے قصیدہ شہر آشوب کا ایک ٹکڑا ہے اس میں شاعر نے اپنے زمانے کی معاشی بد حالی کا نقشہ کھینچا ہے - جو باتیں اُس نے شعروں میں کہی ہیں آپ اُن کی مدد سے ایک مضمون لکھیے - عنوان ہو "زمانے کی حالت"

۲- دوسری نظم ایک قصیدے کی تشبیب ہے - یہ سمجھنے کے لیے کہ تشبیب کسے کہتے ہیں ، کتاب کے آخر میں لکھی ہوئی تشریحات دیکھیے - ان میں قصیدے کے بیان میں آپ کو تشبیب کا ذکر ملے گا -

اس تشبیب میں شاعر نے اپنے مشاہدے سے جو کچھ دیکھا ہے اُس کی ایک شاعرانہ وجہ بتائی ہے (اسے حسن تعلیل کہتے ہیں) مثلاً دوسرا شعر دیکھیے اس میں ثمر دار شاخ کے جھکنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ خدا کا شکر ادا کر رہی ہے ، حالانکہ ایسا نہیں - شاخ کا جھکنا پھولوں کے بوجھ کی وجہ سے ہے ، لیکن شاعر نے اس حقیقت کو ایک شاعرانہ صورت دی - نظم میں سے "حسن تعلیل" کی ایسی ہی پانچ مثالیں تلاش کیجئے اور اُن شعروں کا مطلب سمجھا کر لکھیے -

۳۔ دوسری نظم کی طرح تیسری نظم میں بھی کئی شعروں میں حسن تعلیل ہے ۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر شعر نمبر ۱ ، ۵ ، ۹ ، اور ۱۶ کا مطلب لکھیے ۔

۴۔ اوپر کی تینوں نظموں میں جتنے مشکل لفظ آئے ہیں ، ان سب کے معنی آسانی سے لغت میں مل جائیں گے ۔ آپ خود تلاش کیجیے ۔

میر حسن

میر حسن (۱۷۴۱-۱۷۸۶ء) جن کا پورا نام غلام حسن اور حسن تخلص ہے، دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے دوسرے امیروں اور شریفوں کی طرح ان کے والد بھی گھر سے نکلے اور اودھ پہنچے۔ پھر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ میر حسن کی شاعری اسی ماحول میں پروان چڑھی۔ غزلیں بھی کہیں اور مثنویاں بھی لکھیں۔ غزلوں کے شعر زبان کی صفائی اور سادگی اور مضامین کی تاثیر میں کبھی کبھی میر کے درجے کو پہنچتے ہیں۔ لیکن ان کی شہرت غزلوں کی بنا پر نہیں، مثنویوں کی وجہ سے ہے ان مثنویوں میں بھی خاص کر مثنوی "سحرالبیان"، حسن بیان کا معجزہ ہے ۔ اس مثنوی میں کردار نگاری اور مرقع نگاری بھی اتنی اچھی ہے کہ اردو کی کوئی مثنوی اس کے مقابلے میں نہیں ٹھہرتی۔ جس چیز کا بیان کرتے ہیں ہو بہو اس کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مثنوی کے ذریعے اپنے زمانے کی معاشرت کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے۔ میر حسن کے بیان میں سادگی، روانی اور بے ساختگی اتنی ہے کہ ان کے بعض شعروں نے ضرب المثل کی صورت اختیار کر لی ہے۔

آگے چل کر آپ مثنوی میر حسن کے تین ٹکڑے پڑھیں گے۔ ایک داستان کا آغاز ہے، دوسرے میں بادشاہ وقت کی سخاوت کی تعریف ہے، تیسرے میں تھوڑے سے لفظوں میں جنگل کی منظر کشی ہے۔ ہر ٹکڑا آپ اپنا جواب ہے۔

(۱)

"آغاز داستان"

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہِ گیتی پناہ

بہت حشمت و جاہ و مال و منال
بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال

کئی بادشاہ اسکو دیتے تھے باج
خطا و ختن سے وہ لیتا خراج

کوئی دیکھتا آ کے جب اسکی فوج
تو کہتا کہ ہے بحر ہستی کی موج

طویلے کے اسکے جو ادنیٰ تھے خر
انھیں نعلبندی میں ملتا تھا زر

جہاں تک کہ سر کش تھے اطراف کے
وہ اس شہ کے رہتے تھے قدموں لگے

رعیت تھی آسودہ و بے خطر
نہ غم مفلسی کا نہ چوری کا ڈر

عجب شہر تھا اس کا مینو سواد
کہ قدرت خدائی کی آتی تھی یاد

لگے تھے ہر اک جا پہ واں سنگ و خشت
ہر اک کوچہ اس کا تھا رشک بہشت

زمیں سبز و سیراب عالم تمام
نظر کو طراوت وہاں صبح و شام

عمارت تھی گچ کی وہاں بیشتر
کہ گزرے صفائی سے جس پر نظر

کہیں چاہ مبنع کہیں حوض و نہر
ہر اک جا پہ آب لطافت کی لہر

کروں اس کی وسعت کا کیا میں بیاں
کہ جوں اصفہاں تھا وہ نصف جہاں

ہنر مند واں اہل حرفہ تمام
ہر اک نوع کی خلق کا ازدحام

یہ دلچسپ بازار تھا چوک کا
کہ ٹھہرے جہاں پر وہیں دل لگا

جہاں تک کہ رستے تھے بازار کے
کہے تو کہ تختے تھے گلزار کے

وہ پختہ مکانوں کے دیوار و در
سپیدی پہ جسکی نہ ٹھہرے نظر

صفا پر جو اسکی نظر کر گئے
اسے دیکھ کر سنگ مر مر گئے

کہوں قلعہ کی اسکی میں کیا شکوہ
گئے دب بلندی کو دیکھ اسکی کوہ

وہ دولت سرا خانۂ نور تھا
سدا عیش و عشرت سے معمور تھا

ہمیشہ خوشی ، رات دن سیرِ باغ
نہ دیکھا کسی دل پہ جز لالہ داغ

سدا عیش و عشرت ، سدا راگ رنگ
نہ تھا زیست سے اپنی کوئی بتنگ
غنی واں ہوا جو کہ آیا تباہ
عجب شہر تھا وہ عجب بادشاہ
نہ دیکھا کسی نے کوئی واں فقیر
ہوئے اسکی دولت سے گھر گھر امیر
کہاں تک کہوں اسکا جاہ و حشم
محل و مکاں اس کا رشک ارم
سدا ماہرویوں سے صحبت اسے
سدا جامہ زیبوں سے رغبت اسے
ہزاروں پری پیکر اسکے غلام
کمر بستہ خدمت میں حاضر مدام
کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم
مگر ایک اولاد کا تھا الم
اسی بات کا اسکے تھا دل پہ داغ
نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ
دنوں کا عجب اسکے یہ پھیر تھا
کہ اِس روشنی پر یہ اندھیر تھا
وزیروں کو اک روز اس نے بلا
جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا
کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال
فقیری کا ہے میرے دل کو خیال

فقیر اب نہ ہوں تو کروں کیا علاج
نہ پیدا ہوا وارث تخت و تاج
جوانی تو میری گئی اب گزر
نمودار پیری ہوئی سر بسر
بہت ملک پر جان کھویا کیا
بہت فکر دنیا میں سویا کیا

وزیروں نے کی عرض کا ے[1] آفتاب
نہ ہو ذرہ تجھ کو کبھی اضطراب
فقیری جو کیجے تو دنیا کے ساتھ
نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ
کرو سلطنت لیکن اعمال نیک
کہ تا دو جہاں میں رہے حال نیک
جو عاقل ہوں وہ سوچ میں ٹک رہیں
کہ ایسا نہ ہووے کہ پھر سب کہیں
یہ دنیا جو ہے مزرع آخرت
فقیری میں ضائع کرو اسکو مت
عبادت سے اس کشت کو آب دو
کہ واں جا کے خرمن بھی تیار لو
رکھو یاد عدل و سخاوت کی بات
کہ اس فیض سے ہے تمھاری نجات
مگر ہاں جو اولاد کا ہے یہ غم
سو اسکا تردد بھی کرتے ہیں ہم

۱- کہ اے -

عجب کیا کہ ہووے تمھارے خلف
کرو تم نہ اوقات اپنی تلف

نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو
کہ قرآں میں آیا ہے لا تقنطوا

---

(۲)

"بیان سخاوت کا"

بیان سخاوت کروں جو رقم
تو زر ریز کاغذ پہ ہووے قلم

نظر سے توجہ کی دیکھا جدھر
دیا مثل نرگس اسے سیم و زر

سخاوت یہ ادنٰی سی اک اسکی ہے
کہ اک دن دو شالے دیے سات سے

سوا اسکے ہے اور یہ داستاں
کہ ہو جس پہ قرباں حاتم کی جاں

ہوئی کم جو اک بار کچھ بر شگال
گرانی سی ہونے لگی ایک سال

غریبوں کا دم سا نکلنے لگا
توکل کا بھی پاؤں چلنے لگا

وزیر المالک نے تدبیر کر
خدا کی دیا راہ میں مال و زر

محلے محلے کیا حکم یہ
کہ ناڑے سے اس غم کی کھولیں گرہ

یہ چاہا کہ خلقت کسی ڈھب جیے
کئی لاکھ لاکھ ایک دن میں دیے

یہ لغزش پڑی ملک میں جو تمام
لیا ہاتھ نے اسکے گرتوں کو تھام

یہ بندہ نوازی ، یہ جاں پروری
یہ آئین سرداری و سروری

ہوئی ذات پر اس سخی کی تمام
تکلف ہے آگے سخاوت کا نام

فقیروں کی تو یاں تلک ہے بنی
کہ ایک ایک یاں ہو گیا ہے غنی

یہ کیا دخل آواز دے جو گدا
چٹکنے کی گل کے نہ ہووے صدا

نہ ہو اس کا شامل جو ابرِ کرم
اثر ابر نیساں سے ہووے عدم

قدح لیکے نرگس جو ہووے کھڑی
تو خجلت سے جاوے زمین میں گڑی

ہر اک کام اس کا جہاں کی مراد
فلاطوں طبیعت ارسطو نژاد

جب ایسا وہ پیدا ہوا ہے بشر
تب اسکو دیا ہے یہ کچھ مال و زر

----

(۳)

"جنگل کا سماں"

وہ سنسان جنگل وہ نور قمر
وہ براق سا ہر طرف دشت و در

وہ اجلا سا میدان چمکتی سی ریت
اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

درختوں کے پتے چمکتے ہوئے
خس و خار سارے جھکتے ہوئے

درختوں کے سایے سے مہ کا ظہور
گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

دیا یہ کہ جوگن کا منہ دیکھ کر
ہوا نور سایہ کا ٹکڑے جگر؟

گیا ہاتھ سے بین سن کر جو دل
گئے سایہ و نور آپس میں مل

ہوا بندھ گئی اس گھڑی اس اصول
بسیرا گئے جانور اپنا بھول

درختوں سے لگ لگ کے باد صبا
لگی وجد میں بولنے واہ وا

کدارے کا عالم تھا یہ اس گھڑی
کہ تھی چاندنی ہر طرف غش پڑی

مشقیں اور اشارے

۱ - (قصے کی ہیروئن بدر منیر کی سہیلی نجم النساء جوگن کا بھیس بدل کر بے نظیر کو تلاش کرنے نکلی ہے - اوپر والے اشعار میں اسی کی حالت کا تھوڑا سا نقشہ کھینچا گیا ہے -)

۲ - پہلی نظم میں ایک شعر ہے -

دنوں کا عجب اُس کے یہ پھیر تھا
کہ اس روشنی پر یہ اندھیر تھا

غور کیجیے کہ اس شعر میں شاعر نے کس روشنی کی طرف اشارہ کیا ہے اور کس اندھیر کا ذکر ہے -

۳ - تیسری نظم میں شاعر نے بعض اچھی تشبیہیں استعمال کی ہیں - جس شعر کی تشبیہ آپ کو سب سے اچھی لگی ہو اُسے اپنی کاپی میں لکھ کر اُس کا مطلب سمجھا کر لکھیے -

دیا شنکر نسیم

پنڈت دیا شنکر نسیم (۱۲۲۷-۱۲۶۰ھ) ذات کے کشمیری برہمن تھے - ان کے والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا - نسیم، شاعری میں لکھنؤ کے نامور شاعر آتش کے شاگرد ہیں - غزلیں بھی کہی ہیں ، لیکن ان کی شہرت ان کی مثنوی "گلزار نسیم" کی وجہ سے ہے ، جس میں گل بکاؤلی کا مشہور قصہ نظم کیا گیا ہے -

نسیم کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا اس لیے اردو اور فارسی کے شاعروں کے کلام کا خوب مطالعہ کیا تھا - اس کا اثر ان کی تصانیف پر ظاہر ہوتا ہے - لکھنؤ کے بادشاہ امجد علی شاہ کی فوج میں بخشی کے عہدے پر مامور تھے ، لیکن اس سے شعر و شاعری کے شغل میں کوئی کمی نہیں آئی -

کہتے ہیں کہ نسیم نے اپنی مثنوی میر حسن کی مثنوی کے جواب میں لکھی تھی - پہلے بہت طویل تھی - استاد نے کہہ کر مختصر کرائی اور یہی اختصار اس کی خوبی بن گیا - کلام کے اختصار کی اس سے بہتر مثال طویل نظموں اور خاص کر مثنوی کے قصوں میں نہیں ملتی - اختصار کے باوجود شعروں میں روانی اور برجستگی ہے - نادر تشبیہوں اور استعاروں نے کلام کے حسن میں اور بھی اضافہ کیا ہے ، لیکن میر حسن کی مثنوی سے مقابلہ کرکے دیکھیں تو نسیم کی مثنوی میں تصنع معلوم ہوتا ہے - بعض اوقات بات کے سمجھنے میں بھی دقت پیش آتی ہے -

آئندہ صفحات میں آپ اس مثنوی کے دو ٹکڑے پڑھیں گے -

(۱)

مرغ اسیر

اک مرغ ہوا اسیر صیّاد
دانا تھا وہ طائر چمن زاد

بولا جب اس نے باندھے بازو
کھلتا[۱] نہیں کس طمع پہ ہے تو

بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں
گر ذبح کیا تو مشت پر ہوں

پالا تو مفارقت ہے انجام
دانا ہو تو مجھ سے لے مرے دام

بازو میں نہ تو مرے گرہ باندھ
سمجھاؤں جو پند اسے گرہ باندھ

سن کوئی ہزار کچھ سنائے
کیجے وہی جو سمجھ میں آئے

قابو ہو تو کیجیے نہ غفلت
عاجز ہو تو ہارے نہ ہمت

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجیے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیے[۲]

طائر کے یہ سن کلام صیاد
بن داموں ہوا غلام صیاد

بازو کے جو بند کھول ڈالے
طائر نے تڑپ کے پر نکالے

۱- ظاہر نہیں ہوتا - ۲- پورا شعر معلوم ہوتا ہے کہ ضرب المثل ہے -

اک شاخ پہ جا چہک کے بولا
کیوں پر مرا کیا سمجھ کے کھولا

ہمت نے مری مجھے اڑایا
غفلت نے تری مجھے چھڑایا

دولت نہ نصیب میں تھی تیرے
تھا لعل نہاں شکم میں میرے

دے کر صیاد نے دلاسا
چاہا کہ پھر کچھ لگائے لاسا

بولا وہ دیکھ کر یہ جعل
طائر بھی کہیں نگلتے ہیں لعل

ارباب غرض کی بات سن کر
کر لیجیے یک بہ یک نہ باور

مشقیں اور اشارے

۱ ذیل کے دو شعروں کی نثر کیجیے:
۱- طائر کے یہ سن کلام صیاد + بن داموں........صیاد
۲- ارباب غرض.......... + کر لیجیے.......باور

۲ آخری سے پہلے شعر میں لفظ "جعل" آیا ہے۔ بتائیے "جعل" اور "جال" میں کیا فرق ہے؟

۳ پانچویں شعر میں "گرہ باندھ" کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے؟

....

(۲)

"پھول کی چوری"

وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاؤلی گل اندام

جاگی مرغ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرش گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں، کدھر گیا، گل
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل

ہے ہے، مرا پھول لے گیا کون ؟
ہے ہے، مجھے خار دے گیا کون؟

ہاتھ اس پر اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن تو بتا کدھر گیا گل

سنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا

تھرائیں خواصیں صورت بید
ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے ہنگامہ سازیاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں

پتا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

مشقیں اور اشارے

۱- تیسرے شعر میں ''چشم حوض'' کے پر آب ہونے سے کیا مراد ہے ؟

۲- پانچویں شعر میں '' خار دے گیا کون'' سے کیا کیا مطلب نکلتے ہیں ؟

۳- آٹھویں اور نویں شعر میں نرگس ، سوسن، سنبل، شمشاد کے ساتھ دکھانا ، بتانا ، تازیانہ اور سولی کا کیا خاص تعلق ہے وضاحت کے ساتھ بتائیے -

نظیر اکبر آبادی

ولی محمد نام (۱۷۳۵-۱۸۳۰ء) اور نظیر تخلص تھا - باپ کا نام محمد فاروق تھا - نظیر اکبر آباد میں پیدا ہوئے - یہیں تعلیم پائی اور یہیں تربیت حاصل کی - زیادہ وقت بچوں کو پڑھانے میں گزارا - اکبر آباد سے بڑی محبت تھی - جوانی اور بڑھاپا اسی شہر میں گزرا - نوے برس کی عمر میں وفات پائی -

نظیر بڑے پرگو شاعر تھے - انھوں نے نیچرل مضامین پر بہت اچھی نظمیں لکھیں ہیں - ان نظموں میں نصیحت اور شوخی کا بڑا لطف اور دلکش امتزاج ہے - دوسرے شاعروں نے جن الفاظ کو معمولی سمجھ کر ترک کر دیا تھا - نظیر نے انھیں اظہار کا ذریعہ بنا کر انھیں زندہ کیا - یہی حال مضامین کا ہے - زندگی کی جن معمولی معمولی چیزوں کو شاعر اس قابل نہیں سمجھتے کہ ان پر نظمیں لکھیں نظیر نے انھیں شاعری کا موضوع بنایا اور شاعری کو روزانہ زندگی سے قریب لائے - اس لحاظ سے نظیر شاعری میں رنگ جدید کے بانی ہیں -

(۱)

"جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے"

دنیا ہے جس کا نام میاں! یہ اور طرح کی بستی ہے
یہ مہنگوں کو تو مہنگی ہے اور سستوں کو یہ سستی ہے
یاں ہر دم جھگڑے اٹھتے ہیں، ہر آن عداوت بستی ہے
گر مست کرے تو مستی ہے اور پست کرے تو پستی ہے

کچھ دیر نہیں ، اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کا مان رکھے تو اس کو بھی ارمان ملے
جو پان کھلاوے پان ملے جو روٹی دے تو نان ملے

نقصان کرے نقصان ملے ، احسان کرے احسان ملے
جو جیسا جس کے ساتھ کرے، پھر ویسا اس کو آن ملے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں ، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے ، یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کی جان رکھے، تو اس کی بھی حق جان رکھے
جو اور کسی کی آن رکھے ، تو اس کی بھی حق آن رکھے

جو یاں کا رہنے والا ہے، یہ جی میں اپنے جان رکھے
یہ ترت پھرت کا نقشہ ہے ، اس نقشے کو پہچان رکھے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں ، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے ، یاں سودا دست بدستی ہے

جو پار اتارے اوروں کو ، اس کو بھی ناؤ اُترنی ہے
جو غرق کرے پھر اس کو بھی ڈبکو ڈبکو کرنی ہے

شمشیر و تبر ، بندوق و سنان اور نشتر تیز نہرنی ہے
یاں جیسی جیسی کرنی ہے ، پھر ویسی ویسی بھرنی ہے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں ، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے ، یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کا اونچا بول کرے تو اس کا بول بھی بالا ہے
اور دے پٹکے تو اس کو بھی کوئی اور پٹکنے والا ہے
بے جرم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے
اس ظالم کے بھی خون کا یہاں پھر بہتا ندی نالا ہے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

جو اور کسی کو ناحق میں، کوئی جھوٹی بات لگاتا ہے
اور کوئی غریب بچارہ ہے، حق ناحق میں لٹ جاتا ہے
وہ آپ بھی لوٹا جاتا ہے، اور لاٹھی پاٹھی کھاتا ہے
جو جیسا جیسا کرتا ہے، وہ ویسا ویسا پاتا ہے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

ہے کھٹکا اس کے ساتھ لگا، جو اور کسی کو دے کھٹکا
اور غیب سے جھٹکا کھاتا ہے، جو اور کسی کو دے جھٹکا
چھرے کے بیچ میں چھرہ ہے، پٹکے کے بیچ میں ہے پٹکا
کیا کہئے اور نظیر آگے، ہے روز تماشا جھٹ پٹ کا

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

(۲)

کل جگ یا کر جگ

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے ، بد کر بدی کی بات لے
آرام دے آرام لے ، دکھ درد دے آفات لے
میوہ کھلا میوہ ملے ، پھل پھول دے پھل پات لے
کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے ، اس ہات دے اس ہات لے

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصاں ہوئے گا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا ذرا کھا دیکھ کر پانی پیا کر چھان کر
یاں پاؤں رکھ تو پھونک کر اور خوف سے گزران کر
کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

کر لے جو کچھ کرنا ہے یاں ، یہ دم تو کوئی آن ہے
تہمت سے ہے تہمت لگی ، طوفان سے طوفان ہے
احسان میں احسان ہے ، نقصان میں نقصان ہے
رحمت میں ہے رحمت عیاں ، شیطان میں شیطان ہے
کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پائے گا
گیہوں سے گیہوں، جو سے جو، چاول سے چاول پائے گا
یاں آج جیسا دیوے گا ، ویسا ہی واں پھل پائے گا
کل دیوے گا کل پائے گا ، کلپائے گا کلپائے گا
کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

کانٹا کسی کے مت لگا، گو مثل گل پھولا ہے تو
وہ حق میں تیرے زہر ہے، کس زور پر بھولا ہے تو
دنیا نہ جان اس کو میاں، اک گھاس کا پولا ہے تو
سن رکھ یہ نکتہ بے خبر، کس فکر میں جھولا ہے تو

کل‌جگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

شوخی، شرارت، مکر میں کیوں آپ تو بہکے ہے یاں
جو جو دکھاوے اور کو، وہ آپ بھی دیکھے ہے یاں
کھوٹا کھرا جو کچھ کہ ہے، سب ہر کوئی پرکھے ہے یاں
جو بیخودی میں خار ہو، مانند گل مہکے ہے یاں

کل‌جگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہات دے اس ہات لے

جو اور کی بستی رکھے اس کا بھی بستا ہے پُرا
جو اور کی توڑے دھری اس کا بھی ٹوٹے ہے دھرا
جو اور کے مارے چھری، اس کے بھی لگتا ہے چھرا
جو اور کی چیتے بدی اس کا بھی ہوتا ہے برا

کل‌جگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے رات اور لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

جو چاہے لے چل اس گھڑی ، سب جنس یاں تیار ہے
احسان میں احسان ہے ، آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں ، دریا کی یہ منجدھار ہے
تو ان کا بیڑا پار کر ، تیرا بھی بیڑا پار ہے

کل‌جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

جو گل کھلاوے اور کا اس کا بھی گل کھل جائے گا
جو اور کا کیلے ہے منہ ، اس کو بھی منہ کل جائے گا
جو اور کا چھیلے ہے دل، اس کا بھی دل چھل جائے گا
جو اور کا چیتے برا ، اس کا برا مل جائے گا

کل‌جگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن‌کو دے اوررات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

یاں زہر دیوے زہر لے ، شکر میں شکر دیکھ لے
نیکوں کو نیکی کا مزہ، موذی کو ٹکر دیکھ لے
گر تجھ کو یہ باور نہیں ، تو تو بھی کر کر دیکھ لے
موتی جو دے موتی ملے ، پتھر میں پتھر دیکھ لے

کل‌جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

غفلت کی یاں جاگہ نہیں ، یاں صاحب ادراک رہ
دل شاد رکھ دل شاد رہ ، غمناک رکھ غمناک رہ
سب حال میں تو بھی نظیر ہر اک کے آگے خاک رہ
یہ وہ مکان ہے گا میاں ' یاں پاک رہ بے باک رہ

کل‌جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہات دے اس ہات لے

مشقیں اوز اشارے

۱ - کلجگ اور کر جگ کے فرق کو اچھی طرح سمجھیے - ''جگ'' کے معنی زمانہ ہیں -

۲ - اس مصرعے کو غور سے دیکھیے -

کل دیوے گا، کل پائے گا کلپائے گا ، کلپائے گا

کل پائے گا اور کلپائے گا کے معنی ہیں جو فرق ہے اُسے اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لیجیے (کلپائے گا، کلپانا سے بنا ہے)

۳- ''یاں پاک رہ بے باک رہ ،، کا مطلب سمجھا کر لکھیے -

شیخ محمد ابراہیم ذوق

محمد ابراہیم نام (۱۷۸۹-۱۸۵۴ء) اور ذوق تخلص تھا ۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا ۔ ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول سے پائی اور انھیں سے شعر کا شوق حاصل کیا ۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے اور استاد کے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر خود ہی اپنے استاد بن گئے ۔ کہتے ہیں کہ کلام اتنا مقبول ہوا کہ لوگ ان کی غزلیں دہلی کے کوچہ و بازار میں گاتے پھرتے تھے ۔ کلام نے یہاں تک شہرت پائی کہ بہادر شاہ ظفر نے اپنا استاد بنایا ۔

اکبر شاہ ثانی نے ان کے قصاید سے متاثر ہو کر "خاقانی ہند" کا خطاب عطا فرمایا ۔ مضامین کی تازگی ، روانی، سلاست ، محاورہ بندی ، بلندی پروازی آپ کے کلام کی عام خصوصیات ہیں ۔

دہلی سے اتنی محبت تھی کہ حکومت دکن کی دعوت کی پروا نہ کی اور آخر دم تک دہلی کو نہ چھوڑا ۔ آخر یہیں انتقال ہوا ۔

آیندہ صفحات میں آپ ان کے دو قصیدوں کے اقتباسات کا مطالعہ کریں گے ۔ پہلا اقتباس ایک قصیدے کی تشبیب ہے ۔ دوسرا بہادر شاہ بادشاہ کے بیٹے جواں بخت کے غسل صحت کے موقع پر لکھا گیا تھا ۔

(۱)

"قصیدہ"

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم باد بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دارالشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہو گیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو
برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگ حنا

پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

نام کو اشیاء میں تلخی رہی نے سمّیت
بن گئی تریاق افیوں، زہر میٹھا ہو گیا

کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
کیا عجب گر آب حنظل دیوے شربت کا مزا

نیش کی جانوش ہو دنبالۂ زنبور میں
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلا

آ گیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج
تا زباں خامہ بھی آتا نہیں حرف دوا

نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہوالشّافی طبیب
کہتا ہے بیمار "ہنس کر، مجھ کو ہے بالکل شفا"

لاغروں کو ہو کمال تاب و طاقت یہ شتاب
جیسے دو ہفتے، ہلال اک شب میں ہو بدرالدجیٰ،

رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
باغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بازو پر سے سارے نقش دھو
پھینک دیگی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جب کہ ہو اس کی نویدِ غسل صحت جانفزا

وہ ولی عہد زماں مرزا محمد ہو ظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنا دے اقویا

تقویت کا یوں اثر ہو عام، جو ہیں برگ زرد
ہوں مقویِ دل و جاں مثل اوراق طلا

شادی صحت سے اس کی آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سر گرم سب مدحت سرا

مشقیں

۱ - شعر نمبر ۱، ۱۳ اور ۱۴ کی نثر کیجیے -

۲ - مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے صنعت ''حسن تعلیل'' کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے - جن شعروں میں صنعت حسن تعلیل استعمال ہوئی ہے ان میں سے تین کی تشریح اچھی طرح سمجھا کر کیجیے -

۳ - آخری شعر میں ''شادی'' کے لفظ کو غور سے دیکھیے - یہاں یہ خوشی کے معنی میں استعمال ہوا ہے - اصل میں اس کے یہی معنی ہیں ، ''بیاہ کے معنی بعد میں پیدا ہوئے -

----

(۲)

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں
کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں

ہے بادۂ نشاطِ طرب سے لبالب آج
اک عمر سے پڑا تھا تہی ساغر آسماں

اِترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے
سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں

شادی کی اس کی دھوم ہے آج آسماں تلک
تابع زمانہ جس کا ہے ، فرماں بر آسماں

فرزند شاہ یعنی جواں بختِ ذی وقار
تسلیم کو ہے جس کی جھکاتا سر آسماں

پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن
مقدور کیا کہ ٹھیر سکے دم بھر آسماں

آرائش ایسی اور وہ گل ہائے رنگ رنگ
ادنیٰ سا جن میں غنچۂ نیلوفر آسمان

بنوائے اس میں پھول طلائی و نقرئی
لے لے کے ماہ و مہر سے سیم و زر آسماں

دولھا دلھن کی ہے یہ علامت سہاگ کی
آیا ہے اک سہاگ پڑا بن کر آسماں

یا رب ہمیشہ دولھا دلھن کا رہے سہاگ
جب تک کہ ہووے نیچے زمیں اوپر آسماں

کرتا رہا برات کی شب شام سے نثار
شبنم کی جائے صبح تلک گوہر آسماں

پہنچے براتیوں کے نہ ہرگز ہجوم کو
انجم سے لاکھ جمع کرے لشکر آسماں

شادی کا اس کے نور بصر کی ہے اہتمام
کرتا ہے جس کا روز طوافِ در آسماں

وہ شاہِ نامور کہ بہادر شہ اس کا نام
ہو حکم سے نہ اس کے کبھی باہر آسماں

مطلع پڑھوں حضور میں وہ میں جسے کہے
مطلع سے آفتاب کے بھی برتر آسماں

تجھ سا زمین پہ دیکھے جو فرخ فر آسماں
قرباں نہ کیوں زمیں کے ہو پھر پھر کر آسماں

طالع سدا مساعد و عالم سدا مطیع
کوکب ہمیشہ یار ترا یاور آسماں

ہے آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر
جس طرح کوہسار سے بالا تر آسماں

یہ ذوق کی دعا ہے کہ جب تک زمانے میں
منسوب ہر ستارے سے ہووے ہر آسماں

بزم نشاط و عیش رہے تیرے گھر میں روز
لائے ہمیشہ تیری مرادیں بر آسماں

مارے جگر میں حاسد بد خواہ کے ترے
تارِ خطوطِ مہر سے سو نشتر آسماں

میر انیس

میر ببر علی نام (۱۸۰۲- ۱۸۷۴ء) اور انیس تخلص تھا - ان کے والد میر خلیق اچھے مرثیہ گو شاعر تھے - انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی - جب نواب آصف الدولہ والئی اودھ نے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ آباد کیا تو انیس کا خاندان بھی لکھنئو آگیا - انیس نے یہیں وفات پائی -

انیس کا خاندان دہلی سے آیا تھا مگر لکھنوی بن گیا - ان کے گھر کی زبان سند کا درجہ رکھتی ہے - ان کے یہاں کئی پشت سے مرثیہ گوئی ہوتی آئی تھی - دربار لکھنؤ کے اثر سے عوام میں بھی اس کا چرچا تھا اس لیے انیس نے بھی مرثیہ ہی کی طرف توجہ کی اور سچ تو یہ ہے کہ انیس اور ان کے ہم عصر مرزا دبیر نے اردو مرثیہ کو اس درجہ پر پہنچا دیا کہ دنیا کی کوئی زبان اس صنف میں اس کی برابری نہیں کر سکتی - انیس نے سکیڑوں مرثیے کہے لیکن کمال یہ ہے کہ اس پرگوئی کے باوجود ان کے کلام میں ہر جگہ فصاحت اور تازگی نمایاں ہے -

انیس اردو زبان کے محسنوں میں سے ہیں - ہماری زبان کی صفائی اور وسعت میں انیس جیسے قادر الکلام شاعر کا بڑا ہاتھ ہے - انھیں کی بدولت اردو میں بے شمار نئے الفاظ ، محاورے اور کہاوتیں شامل ہو گئیں - حق یہ ہے کہ انیس نے سادہ اور ستھری زبان استعمال کرکے حقیقی اور فطری شاعری کے معیار کو بلند کر دیا ہے -

انیس کی شاعری کا جوہر سادگی و سلاست ہے۔
مناظر قدرت کا بیان بھی ایسا کرتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے پھر ایک ہی منظر کا بیان جب مختلف مرثیوں میں آئے تو ہر منظر کی کیفیت الگ اور اس کا لطف منفرد ہوتا ہے۔ اسی طرح انیس کو انسانی فطرت اور نفسیات میں گہری بصیرت حاصل تھی اور وہ جذبات انسانی کا اس خوبصورتی سے تجزیہ کرتے ہیں کہ طبیعت پھڑک اٹھتی ہے۔ انہیں خوبیوں کے پیش نظر انیس کا شمار اردو کے صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے اور بلا شبہ وہ اس کے مستحق ہیں۔

★

"مراثی انیس"

(انیس کے کلام کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے نقادوں نے لکھا ہے کہ وہ انیس کی قادرالکلامی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ سب نقادوں نے ان کی نظم کی سلاست، صفائی، پاکیزگی اور فصاحت کی تعریف کی ہے۔ انہیں واقعہ نگاری، منظر کشی اور سیرت کشی سب میں یکساں کمال حاصل ہے۔ جذبات کا بیان اور مکالمے کی ترتیب بھی جیسی انیس کے یہاں ملتی ہے اس کی مثال قدیم شاعروں میں کسی اور کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ ہم نے انیس کا ایک مشہور مرثیہ لے کر اس کے مختلف ٹکڑے اس طرح منتخب کیے ہیں کہ ان کے کلام کی اکثر خصوصیات اس میں آ جاتی ہیں۔

اس مرثیے کا پہلا مصرعہ ہے
"جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"

اس میں کل ۱۹۷ بند ہیں۔ ہم نے بیچ بیچ میں سے بند لے کر ان میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ابتدا کے دس بندوں کے بعد شاعر نے صبح کا منظر بیان کیا ہے -

(۱)

صبح کا منظر

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور

گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزہ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربانِ صنعتِ قلمِ آفرید گار
تھی ہر ورق پہ صنعت ترصیع آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار
ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار

عالم تھا محو قدرت رب عباد پر
مینا کیا تھا وادی مینو سوار پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
دراج کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوشنوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت ، وہ نسیم کے جھونکے ، وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آب دار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیبِ گلشن زہراؑ جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
کو کو کا شور نالۂ حق سرہ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم
جاری تھے وہ جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی حمد
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی حمد

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حی یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار
تسبیح تھی کہیں ، کہیں تہلیل کرد گار
طائر ہوا میں مست ، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

اس کے بعد شاعر نے لشکر حسینی علیہ السلام کے مختلف

جان نثاروں کی حالت ایک ایک کر کے بیان کی ہے اور ہر ایک کی تعریف ایسے الفاظ میں کی ہے کہ اس کی پاکیزہ شخصیت کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ۳۷ بندوں تک چلتا رہتا ہے۔ اس کے بعد ذیل کے بند آتے ہیں، جن میں حضرت زینب کے بیٹے عون اور محمد آن سے باتیں کر رہے ہیں۔

(۲)

جنگ کی تیاری

ہتھیار ادھر لگا چکے آقائے خاص و عام
تیار ادھر ہوا علم سید انامؐ
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام
روتی تھی تھامے چوب علم خواہر امامؑ
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینبؑ کے لال زیر علم آ کھڑے ہوئے

گردانے دامنوں کو قبا کے وہ گلعذار
مرفق تک آستینوں کو الٹے بصد وقار
جعفرؓ کا رعب، دبدبۂ شیر کردگارؑ
ہوتے سے ان کے قد پہ نمودار نام دار
آنکھیں ملیں علم کے پھریرے کو چوم کے
رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کے

گہ ماں کو دیکھتے تھے وہ گہ جانب علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثار شہ اُمم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھنے لگے ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علیؑ ولی کے نشان کا
اماں کسے ملے گا علم نانا جانؑ کا

کچھ مشورے کریں جو شہنشاہ خوش خصال
ہم بھی مُحق ہیں آپ کو اس کا رہے خیال
پاس ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال
اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جان نثار ہیں
عزت طلب ہیں ، نام کے امیدوار ہیں

بے مثل تھے رسولؐ کے لشکر کے سب جوان
لیکن ہمارے جد کو نبیؐ نے دیا نشان
خیبر میں دیکھتا رہا منھ لشکر گران
پایا علم علیؑ نے مگر وقت امتحان
طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انھیں کے ہم ہیں انھیں کے نواسے ہیں

زینبؑ نے تب کہا کہ تمھیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امامؑ
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں ، جو لو گے زباں سے علم کا نام
لو جاؤ ، بس کھڑے ہو ، الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علیؑ اکبر کو چھوڑ کے

سر کو، ہٹو، بڑھو، نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس
بس قابل قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگو گے تم جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمریں قلیل اور ہوس منصب جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمھارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ، کیوں بشر اس کی ہوس کرے

ان ننھے ننھے ہاتھوں سے اٹھے گا یہ علم؟
چھوٹے قدوں میں سب سے، سنوں میں سبھوں سے کم
نکلیں تنوں سے سبط نبیؐ کے قدم پہ دم
عہدہ یہی ہے بس یہی منصب یہی حشم
رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہے
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے

پھر تم کو کیا بزرگ تھے گر فخر روزگار
زیبا نہیں ہے وصف اضافی پہ افتخار
جوہر وہ ہے جو تیغ کرے آپ آشکار
دکھلا دو آج حیدرؑ و جعفرؓ کا کار زار
تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علیؑ کے ہیں

کیا کچھ علم سے جعفرؓ طیار کا تھا نام
یہ بھی تھی اک عطائے رسولؐ فلک مقام
بگڑی لڑائیوں میں بن آئے انھیں سے کام
جب کھینچتے تھے تیغ تو ہلتا تھا روم و شام
بے جاں ہوئے تو نخل وغا نے ثمر دیے
ہاتھوں کے بدلے حق نے جواہر کے پر دیے

لشکر نے تین روز ہزیمت اٹھائی جب
بخشا علم رسول خدا نے علیؑ کو تب
مرحب کو قتل کرکے بڑھا جب وہ شیرؑ رب
در بند کرکے قلعے کا بھاگی سپاہ سب
اکھڑا وہ یوں گراں تھا جو در سنگ سخت سے
جس طرح توڑلے کوئی پتا درخت سے

نرغے میں تین دن سے ہے مشکلکشا کا لال
اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
پوچھا نہ کیوں کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال
میں لٹ رہی ہوں اور تمھیں منصب کا ہے خیال
غم خوار تم مرے ہو نہ عاشق امامؑ کے
معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے

ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام
غصے کو آپ تھام لیں اے خواہر امامؑ
واللہ کیا مجال جو اب لیں علم کا نام
کھل جائے گا لڑیں گے جو یہ باوفا غلام
فوجیں بھگا کے گنج شہیداں میں سوئیں گے
تب قدر ہو گی آپ کو جب ہم نہ ہوئیں گے

بس کہہ کے یہ ہٹے جو سعادت نشاں پسر
چھاتی بھر آئی ماں نے کہا تھام کر جگر
دیتے ہو اپنے مرنے کی پیارو مجھے خبر
ٹھہرو ذرا بلائیں تو لے لے یہ نوحہ گر
کیا صدقے جاؤں ماں کی نصیحت بری لگی
بچو! یہ کیا کہا کہ جگر پر چھری لگی

زینبؑ کے پاس آکے یہ بولے شہؑ زمن
کیوں تم نے دونوں بیٹوں کی باتیں سنی بہن
شیروں کے شیر، عاقل و جرار و صف شکن
زینبؑ! وحید عصر ہیں، یہ دونوں گلبدن
یوں دیکھنے کو سب میں بزرگوں کے طور ہیں
تیور ہی ان کے اور ارادے ہی اور ہیں

نو دس برس کے سن میں یہ جرأت یہ ولولے
بچے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی من چلے
اقبال کیونکر ان کے نہ قدموں سے منہ ملے
کس گود میں بڑے ہوئے کس دودھ سے پلے؟
بے شک یہ ورثہ دار جناب امیرؑ ہیں
پر کیا کہوں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں

اس کے بعد بھی حضرت امام حسین اور ان کی ہمشیرہ حضرت زینبؑ کی گفتگو جاری رہتی ہے۔ پھر حضرت عباس علیہ السلام کو بلایا جاتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ لشکر حسینی کا علم حضرت عباسؑ کے سپرد کرتے ہیں۔ تینوں بہن بھائیوں کی گفتگو ہوتی ہے اور حضرت عباسؑ کی زوجۂ نامور بھی آ کر اس گفتگو میں شریک ہو جاتی ہیں۔ پھرحضرت امام حسینؑ کی چھوٹی صاحبزادی حضرت سکینہؑ آ جاتی ہیں اور چچا کی خدمت میں علم ملنے کی مبارکباد پیش کرتی ہیں۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے خیمہ حسینیؑ کے مختلف افراد سامنے آتے ہیں اور اپنے اپنے مراتبؑ کے مطابق باتیں کرتے ہیں۔ اس سے آگے کے بندوں میں حسینی لشکر کے مختلف جان بازوں کی تیاری اور جنگ جوئی کا بیان ہوتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس دن گرمی کا کیا حال تھا۔ ذیل کے بند گرمی کے حال کے بیان میں ہیں:

گرمی کا حال (۳)

گرمی کا روز جنگ کی کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثل شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لو کہ الحذر، وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمین تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آب خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لُو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سو کھے ہوئے تھے لب
خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھَولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جھیلوں سے چارپائے نہ اٹھتے تھے تا بہ شام
مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام
پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثل موم خام
سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اترا تھا سائے کی چاہ سے

آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھوں آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورت چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ مہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمین کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ، مگر تھی لبوں پر جاں

پانی تھا آگ، گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامن سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافور صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب

بھڑکی تھی آگ گنبد چرخ اثیر میں
بادل چھپے تھے جا کرۂ زمہریر میں

ان چند بندوں کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کی لڑائی کا حال بیان ہوا ہے اور اس میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف کی گئی ہے:

(۴)

تلوار اور گھوڑے کی تعریف

جب رن میں تیغ تول کے سلطان دیں بڑھے
گیتی کے تھام لینے کو روح الامینؑ بڑھے
مانند شیر نر کہیں ٹھہرے کہیں بڑھے
گویا علیؑ الٹتے ہوئے آستیں بڑھے
جلوہ دیا جری نے عروس مصاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنار شوق سے ہو خوبرو جدا
مہتاب سے شعاع، جدا گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا، رگ جاں سے لہو جدا
گرجا جو رعد، ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلی نکل پڑی

آئے حسینؑ یوں کہ عقاب آئے جس طرح
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح
تابندہ برق سوئے سحاب آئے جس طرح
دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح
یوں تیغ تیز کوند گئی اس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر

گرمی میں تیغ برق جو چمکی شرر اڑے
جھونکا چلا ہوا کا جو سن سے تو سر اڑے
پرکالۂ سپر جو ادھر اور ادھر اڑے
روح الامینؑ نے صاف یہ جانا کہ پر اڑے
ظاہر نشانِ اسمِ ہزیمت اثر ہوئے
جن پر علیؑ لکھا تھا وہی پر سپر ہوئے

جس پر چلی وہ تیغ دو پارا کیا اسے
کھنچتے ہی چار ٹکڑے دو بارا کیا اسے
واں تھی جدھر اجل نے اشارا کیا اسے
سختی بھی کچھ پڑی تو گوارا کیا اسے

نے زیں تھا فرس پہ نہ اسوار زین پر
کڑیاں زرہ کی بکھری ہوئی تھیں زمین پر

آئی چمک کے غول پہ جب سر گرا گئی
دم میں جمی صفوں کو برابر گرا گئی
ایک ایک قصر تن کو زمیں پر گرا گئی
سیل آئی زور شور سے جب، گھر گرا گئی

آ پہونچا اسکے گھاٹ پہ جو مر کے رہ گیا
دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہ گیا

یہ آبرو یہ شعلہ فشانی خدا کی شان
پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان
خاموش اور تیز زبانی خدا کی شان
استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان

لہرائی جب اتر گیا پانی بڑھا ہوا
نیزوں تھا ذوالفقار کا پانی چڑھا ہوا

قلب و جناح ، میمنہ و میسرہ تباہ
گردن کشانِ امت خیرالوراؐ تباہ
جنباں زمیں ، صفیں تہ وبالا ، پرا تباہ
بے جان جسم ، روح مسافر ، ہوا تباہ

بازار بند ہو گئے جھنڈے اکھڑ گئے
فوجیں ہوئیں تباہ محلے اجڑ گئے

اللہ ری تیزی و بُرش اس شعلہ رنگ کی
چمکی سوار پر تو خبر لائی تنگ کی
پیاسی فقط لہو کی طلب گار جنگ کی
حاجت نہ سان کی تھی اسے اور نہ سنگ کی

خوں سے فلک کو لاشوں سے مقتل کو بھرتی تھی
سو بار دم میں چرخ پہ چڑھتی اترتی تھی

تیغ خزاں تھی گلشن ہستی سے کیا اسے
گھر جس کا خود اجڑ گیا بستی سے کیا اسے
وہ حق نما تھی کفر پرستی سے کیا اسے
جو آپ سر بلند ہو پستی سے کیا اسے

کہتے ہیں راستی جسے وہ خم کے ساتھ ہے
تیزی زباں کے ساتھ ، برش دم کے ساتھ ہے

سینے پہ چل گئی تو کلیجہ لہو ہوا
گویا جگر میں موت کا ناخن فرو ہوا
چمکی تو الامان کا غل چار سو ہوا
جو اس کے منہ پہ آ گیا بے آبرو ہوا

رکتا تھا ایک وار نہ دس سے نہ پانچ سے
چہرے سیاہ ہو گئے تھے اس کی آنچ سے

بجھ بجھ گئیں صفوں پہ صفیں وہ جہاں چلی
چمکی تو اس طرف، ادھر آئی وہاں چلی
دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی
اس نے کہا یہاں، وہ پکارا وہاں چلی
منہ کس طرف ہے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی
سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوتے تھے جاں سے ہاتھ
گردن سے سر الگ تھا جدا تھے نشاں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ
جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہ تھے منہ چھپانے کو
ہاں پاؤں رہ گئے تھے فقط بھاگ جانے کو

اللہ رے خوف تیغِ شہِ کائنات کا
زہرہ تھا آب خوف کے مارے فرات کا
دریا میں حال تھا، یہ ہر اک بدصفات کا
چارہ فرار کا تھا، نہ یارا ثبات کا
غل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر
بھاگو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر

ہرچند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر
منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن ادھر ادھر
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر
تھے تہ‌نشیں نہنگ مگر آب تھے جگر
دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے

آیا خدا کا قہر ، جدھر سن سے آ گئی
کانوں میں الاماں کی صدا دن سے آ گئی
دو کر کے خود و زین کو جو شن سے آ گئی
کھنچتی ہوئی زمین پہ توسن سے آ گئی
بجلی گری جو خاک پہ تیغ جناب کی
آئی صدا زمین سے یا بوتراب[ؑ] کی

حضرت امام حسین علیہ السلام کی لڑائی کی تفصیلات اس کے بعد بھی جاری رہتی ہیں اور ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود میدان جنگ میں کھڑے رسول اللہ[ؐ] کے نواسے کو داد شجاعت دیتے دیکھ رہے ہیں :

(۵)

میدان جنگ کا ایک اور منظر

لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے
وہ بدنظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑائے
ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑگڑائے
غصے میں آ کے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے
ماری جو ٹاپ ڈر کے، ہٹے ہر لعیں کے پاؤں
ماہی پہ ڈگمگا گئے گاوِ زمیں کے پاؤں

نیزہ ہلا کے شاہ[ؑ] پہ آیا وہ خود[۱] پسند
مشکل کشا[ؑ] کے لال نے کھولے تمام بند
تیر و کماں سے بھی نہ ہوا جب وہ بہرہ مند
چلّا ادھر کھنچا کہ چلی تیغ سر بلند
وہ تیر کٹ گئے جو در آئے تھے سنگ میں
گوشے نہ تھے کماں میں نہ پیکاں خدنگ میں

۱- یزیدی فوج کا سپہ سالار ابن سعد۔

ظالم اٹھا کے گرز کو آیا جناب پر
طاری ہوا غضب ، خلفِ بوترابؑ پر
مارا جو ہاتھ پاؤں جما کر رکاب پر
بجلی گری شقی کے سر پر عتاب پر

بدہاتھ میں شکست ، ظفر نیک ہاتھ میں
ہاتھ اڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں

کچھ دست پاچہ ہو کے چلا تھا وہ نا بکار
پنجے سے پر اجل کے کہاں جا سکے شکار
واں اس نے بائیں ہاتھ میں لی تیغ آب دار
یاں سر سے آئی پشت کے مہروں پہ ذوالفقار

قربان تیغ تیز شہ نام دار کے
دو ٹکڑے تھے سوار کے ، دو راہوار کے

پھر دوسرے پر گرز اٹھا کر پکارے شاہؑ
کیوں ضرب ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ
سرشار تھا شراب تکبر سے رو سیاہ
جاتا کہاں کہ موت تو روکے ہوئے تھی راہ

غل تھا اسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے
لو دوسرا شکار چلا منہ میں شیر کے

آتا تھا وہ کہ اسپ شہ دیں پلٹ پڑا
ثابت ہوا کہ شیر گرسنہ جھپٹ پڑا
تیغہ شقی نے ڈھال پہ مارا تو پٹ پڑا
ضربت پڑی ، کہ گنبد دوار پھٹ پڑا

پیوند صدر زیں ، جسد و فرق ہو گیا
گھوڑا زمیں میں سینے تلک غرق ہو گیا

پریوں سے قاف چھوٹ گیا اور جنوں سے گھر
شیروں سے دشت، گرگ سے بن، اژدروں سے در
شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر
اڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور

سمٹے پہاڑ منہ کو جو دامن سے ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرا دیے پر کانپ کانپ کے

آئی ندائے غیب، کہ شبیرؑ مرحبا!
اس ہاتھ کے لیے تھی یہ شمشیر مرحبا!
یہ آبرو، یہ جنگ، یہ توقیر مرحبا!
دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر مرحبا!

غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

رباعیات

(۱)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

(۲)

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

(۳)

آدمؑ کو عجب خدا نے رتبہ بخشا
ادنیٰ کے لیے مقام اعلیٰ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایمان
اس ایک کف خاک کو کیا کیا بخشا

(۴)

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

(۵)

عاجز نہ کسی بشر کو اصلا سمجھے
نادان ہے جو آپ کو دانا سمجھے
ہے اوج کمال نیک نفسی کی دلیل
ادنیٰ بھی ہو گر تو اس کو اعلیٰ سمجھے

الطاف حسین حالی

حصہ غزلیات میں آپ حالی کی غزلیں پڑھ چکے ہیں ۔ انھیں غزلوں کے ساتھ حالی کی شاعری کی خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں ۔ اب آپ اُن کے کلام کے جو منتخب حصے پڑھیں گے اُن میں اُن کی شاعری کی وہ سب خصوصیات آپ کے سامنے آئیں گی جن کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے ۔

۱

نشاط امید

اے مری امید ، میری جاں نواز
اے مری دلسوز میری کار ساز
میری سپر اور مرے دل کی پناہ
درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ
عیش میں اور رنج میں میری شفیق
کوہ میں اور دشت میں میری رفیق
کاٹنے والی غم ایام کی
تھامنے والی دل ناکام کی
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ
تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ
تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ
تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ
جی کو ہوا جب کبھی حسرت کا رنج
کھول دیے تو نے قناعت کے گنج
تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس
تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس
خاطر رنجور کا درماں ہے تو
عاشق مہجور کا ایماں ہے تو

نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو
چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو

رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تو
پانڈوؤں کے ساتھ پھری بن میں تو

تو نے سدا قیس کا بہلایا دل
تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل

ہو گیا فرہاد کا قصہ تمام
پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام

تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس
ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب
مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

ہاتھ میں جب آکے لیا تو نے ہات
سات سمندر سے گزرنا ہے بات

ساتھ ملا جس کو ترا دو قدم
کہتا ہے وہ یہ ہے عرب وہ عجم

گھوڑے کی لی اپنے جہاں تو نے باگ
سامنے تیرے گیا اور پراگ

عزم کو جب دیتی ہے تو میل جست
گنبد گردوں نظر آتا ہے پست

تو نے دیا آکے ابھارا جہاں
سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں

ذرے کو خورشید میں دے تو کھپا
بندے کو اللہ سے دے تو ملا

- - - - - - - -

(۲)

حب وطن

اے سپہر بریں کے سیارو !
اے فضائے زمیں کے گلزارو

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

اے عنادل کے نغمۂ سحری
اے شب ماہ تاب تاروں بھری

اے نسیم بہار کے جھوکو
دہر ناپائیدار کے دھوکو

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رہنا
تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم مری دل لگی کے ساماں تھے
تم مرے درد دل کے درماں تھے

تم سے کٹتا تھا رنج تنہائی
تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

آن اک اک تمھاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی

کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری
دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری

جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے
ہو کے خوشحال گھر میں آتے تھے

بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لب آب
دھو کے اٹھتے تھے دل کے داغ شتاب

کوہ و صحرا و آسمان و زمیں
سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں

پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار
جی ہوا تم سے خود بخود بیزار

نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے
نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے

سیر گلشن ہے جی کا اک جنجال
شب مہتاب جان کو ہے وبال

کوہ و صحرا سے تا لب دریا
جس طرف جائیں جی نہیں لگتا

کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں
تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں

ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور
یا تمہارے ہی کچھ بدل گئے طور

گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا
پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمین اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے مورد آلام
تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا
تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا
ان کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال
تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے
یا کہ مجھ ہی سے تیرا ناتا ہے

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار
یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں
اے وطن! تو تو ایسی چیز نہیں

جن و انسان کی حیات ہے تو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

ہے نباتات کو نمو تجھ سے
روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما
سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

(۳)

ننگ خدمت[۱]

نوکری ٹھیری ہے لے دے کے اب اوقات اپنی
پیشہ سمجھے تھے جسے ہو گئی وہ ذات اپنی
اب نہ دن اپنا رہا اور نہ رہی رات اپنی
جا پڑی غیر کے ہاتھوں میں ہر اک بات اپنی

ہاتھ اپنے دل آزاد سے ہم دھو بیٹھے
ایک دولت تھی ہماری، لو اسے کھو بیٹھے

کرتے ہیں قصد تجارت تو گرہ میں نہیں دام
دستکاری کو سمجھتے ہیں کہ ہے کار عوام
نہیں ہل جوتنے میں راحت و آرام کا نام
بنتے پھرتے ہیں اسی واسطے اک اک کے غلام

نظر آتی نہیں مطلب کی کوئی گھات ہمیں
وہ پڑا نقشہ کہ ہر چال میں ہے مات ہمیں

۱- انتخاب مسدس حالی -

ایک آقا ہو تو خدمت کا ہو حق اس کی ادا
ایک افسر ہو تو حکم اس کا کوئی لائے بجا
زید کی رائے جدا، عمرو کی تجویز جدا
ایک بندے کو بھگتنے کئی پڑتے ہیں خدا

بھاگو خدمت سے کہ اچھا نہیں انجام اس کا
جس کا پتھر کا کلیجہ ہو وہ لے نام اس کا

کہیں بہتان کا اندیشہ، کہیں بیم گناہ
کہیں غماز کا دھڑکا، کہیں خوف بد خواہ
جھیلنے روز وہ افسر کہ نہ ہو جن سے نباہ
خدمت اک بار گراں ہے کہ عیاذاً باللہ

پڑے پتھر پہ تو پتھر میں گرانی نہ رہے
گزرے دریا سے تو دریا میں روانی نہ رہے

آتی ہیں نوکروں کے سر پہ بلائیں اکثر
بے سبب ان پہ گزرتی ہیں جفائیں اکثر
ماننی پڑتی ہیں ناکردہ خطائیں اکثر
سامنے جاتے ہیں پڑھ پڑھ کے دعائیں اکثر

غیرت آتی جنھیں وہ ٹھیرنے پاتے نہیں یاں
جو کہ عاقل ہیں کبھی کان ہلاتے نہیں یاں

جن کو منظور ہے مشکل کو نہ دشوار کریں
چاہیے سعی و مشقت سے نہ وہ عار کریں
ہو میسر جنھیں وہ خدمت سرکار کریں
ورنہ مزدوری و محنت سر بازار کریں

آبرو اس میں ہے، شان اس میں ہے، عزت اس میں
فخر اس میں ہے، شرف اس میں، شرافت اس میں

پیشہ سیکھیں، کوئی فن سیکھیں، صناعت سیکھیں
کشتکاری کریں ، آئین فلاحت سیکھیں
گھر سے نکلیں کہیں آداب سیاست سیکھیں
الغرض مرد بنیں ، جرأت و ہمت سیکھیں

کہیں تسلیم کریں جا کے نہ آداب کریں
خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں

(۴) راہ ترقی

بشر کو ہے لازم کہ ہمت نہ ہارے
جہاں تک بنے کام اپنے سنوارے
خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے
کہ ہیں عارضی زور ، کمزور سارے

اڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو
سدا اپنی گاڑی کو خود آپ ہانکو

تمھی اپنی مشکل کو آساں کرو گے
تمھی درد کا اپنے درماں کرو گے
تمھیں اپنی منزل کا ساماں کرو گے
کرو گے تمھیں کچھ اگر یاں کرو گے

چھپا دست ہمت میں زور قضا ہے
مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے
کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے
یہی آج کل اصل فرمان دہی ہے
اسی میں چھپا سر شاہنشہی ہے

ملی ہے یہ طاقت اسی کیمیا کو
کہ کرتی ہے یہ ایک شاہ و گدا کو

بس اب علم و فن کے وہ پھیلا و سامان
کہ نسلیں تمھاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہ ترقی ہو آساں
امیروں میں ہو نور تعلیم تاباں

کوئی ان میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتئی دین و ملت کو تھامے

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت
جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت
رہی ہے نہ ہرگز رہے گی سلامت
نہ شخصی بزرگی نہ شخصی حکومت

وہی شاخ پھولے گی یاں اور پھلے گی
ہری ہو گی جڑ اس گلستاں میں جس کی

الٰہی بحق رسولؐ تہامی
ہر اک فرد انسان کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی
برابر تھے مکی و زنگی و شامی

شریروں کو ساتھ اپنے جس نے نباہا
بروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا

طفیل اس کا اور اسکی عزت کا یا رب
پکڑ جلد ہاتھ اس کی امت کا یا رب
اک ابر اس پہ بھیج اپنی رحمت کا یا رب
غبار اس سے جو دھوئے ذلت کا یا رب

کہ ملت کو ہے ننگِ ہستی سے اسکی
ہوا پست اسلام پستی سے جس کی

رباعیات حالی

(۱)

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی بھی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

(۲)

دنیا کو ہمیشہ نقش فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

(۳)

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

(۴)

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بار خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

(۵)

تیمور نے اک موراچہ زیر دیوار
دیکھا کہ چڑھا دانے کو لے کر سو بار
آخر سربام لے کے پہنچا تو کہا
مشکل نہیں کوئی پیش ہمت دشوار

محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۰-۱۹۱۰ء) کے حالات زندگی آپ حصہ نثر میں پڑھ چکے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کے لازوال کارنامے نثر ہی میں ہیں لیکن اردو شاعری پر بھی ان کا ناقابل فراموش احسان ہے ۔ ہم یہاں ان کی شاعرانہ حیثیت کا تذکرہ کریں گے ۔

آزاد فطری شاعر تھے اور شعریت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس پر استاد ذوق کی تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ۔ انھوں نے غزل گوئی بھی کی لیکن ان کی غزلوں کا سرمایہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہوگیا ۔ دہلی سے ہجرت کر کے آزاد لاہور پہنچے اور محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہوگئے ۔ یہاں انھوں نے محکمہ تعلیم کے ناظم اعلیٰ کے مشورہ سے ''انجمن پنجاب'' نامی ایک ادبی سوسائٹی قائم کی ۔ اس انجمن کے ۱۵ اگست ۱۸٦۷ء کے ایک جلسے میں آزاد نے اپنا جدید نظریہ شعر پیش کیا ۔ اسی انجمن میں بعد میں مشاعرے بھی ہونے لگے جن میں مصرع طرح پر غزلیں کہلوانے کے بجائے کسی موضوع کا اعلان کر دیا جاتا تھا اور شعرا اس پر نظم لکھ کر لاتے تھے ۔ آزاد نے اسی پہلے مشاعرے میں اپنی مثنوی ''شب قدر'' پڑھی تھی ۔ یہی وہ مشاعرہ تھا جس میں مولانا آزاد کے ہاتھوں جدید اردو شاعری کا سنگ بنیاد رکھا گیا ۔ رفتہ رفتہ آزاد کی ''نئی شاعری

کی یہ تحریک حالی اور دوسرے ساتھیوں کی مدد سے ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ اس نے ہماری شاعری کا رخ ہی بدل دیا۔

آزاد چونکہ جدید شاعری کے بانیوں میں سے تھے اس لیے ان کی نظموں میں شاعری کی تمام خوبیاں پیدا نہ ہوسکیں۔ اس کے باوجود ان کی نظموں میں منظر نگاری اور زور کلام قابل تعریف ہے۔ ان کے کلام میں شگفتگی، لطافت، ترنم اور نفیس تشبیہوں کا استعمال خوب ہے ان کی نظموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان سے وعظ و نصیحت کا کام کہیں نہیں لیتے بلکہ اصل موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فطری انداز میں کرتے چلے جاتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک باقی رہتی ہے۔ آزاد کی ایسی نظموں میں صبح امید، گنج قناعت، داد انصاف، وداع انصاف اور خواب امن، خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ایک "مجموعے نظم آزاد" کی شکل میں چھپ چکی ہیں۔

★

شرافت حقیقی

میں پوچھتا نہیں ہر گز تمھارا نام ہے کیا
نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا

نہ خانوادے سے مطلب نہ خانماں سے غرض
یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ کچھ نشاں سے غرض

تمھارے کام گر اچھے تو نام اچھے ہیں
گھرانے اچھے، گھر اچھے، تمام اچھے ہیں

جہاں کی دولت و حشمت کا یاں خیال نہیں
امیر ہو کہ فقیر اس سے کچھ سوال نہیں

کوئی امیر اگر ہے تو اپنے گھر بیٹھے
بزرگ صاحب زر ہے تو لے کے زر بیٹھے

یہاں تو مایہ ہمت میں جو زیادہ ہے
بزرگ امیر ہیں اور خود امیرزادہ ہے

مجھے نہیں ہے یہ پروا کہیں سے آئے کوئی
کہیں سے بار توطن اٹھا کے لائے کوئی

جو پاک نہر ہے اور آب صاف چلتا ہے
تو کیوں یہ پوچھیں کہ چشمہ کہاں نکلتا ہے

درخت سے نہیں ہے کام جس کے پھول ہو تم
کمال اصل تو جب ہے کہ بااصول ہو تم

عدم سے آن کے کس خاک پر گرے پہلے
وہ کیا زمین تھی جس پر قدم پھرے پہلے

گزارا تم نے لڑکپن ہے قصر شاہی میں
کہ جھونپڑوں میں پلے خواری و تباہی میں

مجھے نہ فخر ہے اس کا نہ عار ہے اس کی
مگر تلاش ہے تو بار بار ہے اس کی

کہ رکھتے ملک مروت میں رسم و راہ ہو کیا
دکھاتے ہمت عالی میں دستگاہ ہو کیا

میں پوچھتا نہیں تاجر کہاں سے ہے آیا
گماشتہ ہے کہ رکھتا ہے گھر کا سرمایا

نہیں تلاش کہ لایا ہے ساتھ کیا چیزیں
سبک سبک ہیں و یا ہیں گراں بہا چیزیں

میں چاہتا نہیں ارزاں یہ شے دلا دو مجھے
خدا کے واسطے اتنا کوئی بتا دو مجھے

متاعِ حسنِ دیانت دکاں میں ہے کہ نہیں
وفا کی جنس بھی اس کارواں میں ہے کہ نہیں

یہ مانا میں نے کہ باعقل و ذی شعور ہو تم
مقام تجربہ کاری میں پہنچے دور ہو تم

نہ کچھ مقدمہ فہمی سے رکھتا کام ہوں میں
نہ کرتا ضابطہ دانی میں کچھ کلام ہوں میں

پر اس کو خود غرضی میں نہ خرچ کرنا تم
کسی کے خون میں ناحق نہ ہاتھ بھرنا تم

زیادہ عقل زیادہ خراب کرتی ہے
ثواب ہائے خدا کو عذاب کرتی ہے

مجھے غرض نہیں کالج میں تم پڑھے کہ نہیں
جماعتوں کے مدارج پہ تم چڑھے کہ نہیں

کتابیں پڑھ کے جو کیں حفظ بر زبان تو کیا
اور ان میں پاس ہوئے دے کے امتحان تو کیا

تمہارے خُلق پہ بھی کچھ اثر ہوا کہ نہیں
زباں سے کہنے کی دل تک گئی صدا کہ نہیں

فقط جو عالم ذی شان ہو گئے تو کیا
مرے حسابوں وہ شیطان ہو گئے تو کیا

جو کچھ کہ منہ سے کہو اس کا لو اثر دل میں
کہ ہے کتابوں میں جو کچھ کرے وہ گھر دل میں

زبان و دل ہیں بہم جبکہ ایک ہو جائے
تو آدمی بھی ہیں بالطبع نیک ہو جائے

وگر نہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں
ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

جو پوچھو مجھ سے تو پھر بھی ہے نا تمام وہ علم
تمام جب ہو کہ پہنچائے فیض عام وہ علم

وہ علم جس سے کہ اوروں کو فائدہ نہ ہوا
ہمارے آگے برابر ہے وہ ہوا نہ ہوا

مجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم کہ کچھ بھی نہ ہو
مگر یہی ہے تمنا کہ ایسے ہو کے رہو

میاں جاسہ جو آزاد پوچھے آ کے کبھی
کہو کسی میں لیاقت ہو گر یہ کہنے کی

کہ باصفا و سبک روح و پاک جاں ہم ہیں
تو تم جواب میں جھٹ بول اٹھو کہ ہاں ہم ہیں

اُمید

اک مسافر کہ ہے سرگشتہ و حیراں جاتا
دشتِ پُرخار میں ہے بے سرو ساماں جاتا

نہ کوئی بدرقہ ہے راہ بتانے کے لیے
اور نہ ہے ساتھ کوئی بوجھ بٹانے کے لیے؟

اس مصیبت میں ستاتی ہے اگر پیاس اسے
رہتی پھر جان کے بچنے کی نہیں آس اسے

طپش راہ سے جلتا ہے جگر سینے میں
بجھ کے وہ جاتا ہے دل مثل شرر سینے میں

دفعتاً آب رواں دور نظر آتا ہے
اور وہ اس لطف سے لہراتا ہوا جاتا ہے

کہ دل سوختہ ہے دیکھ کے لہرا جاتا
اور خوشی سے تن بے دم میں ہے دم آ جاتا

دل جو تھا لوٹ رہا سینے میں بے آبی سے
جاتا ہے بے سروپا دوڑتا بے تابی سے

جام ہمت جو اسے تونے ہیں پلوائے ہوئے
کوسوں اک دم میں لیے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے

زور ہمت ہے مگر جتنا بڑھاتی جاتی
اتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتی جاتی

یاس اس وقت کی لیکن نہ خدا دکھلائے
دل مایوس کو جب اس کے یقین آ جائے

کہ جسے آب سمجھتا تھا نہیں آب ہے یہ
سر دریائے فنا موت کا گرداب ہے یہ

یہ سمجھتے ہی ہو اندھیر جہاں آنکھوں میں
ہوں وہیں موت کے آثار عیاں آنکھوں میں

دل میں ہمت نہ رہے جسم میں حالت نہ رہے
صورت نقش قدم ہلنے کی طاقت نہ رہے

جان پانی میں ہو اٹکی ہوئی ، دم سینے میں
وہ بھی پر ضعف سے آ کر رہے تھم سینے میں

اس گھڑی اپنی کرامات دکھاتی ہے تو
سربالیں وہ مسافر کوئی لاتی ہے تو

حضرت خضر کی ہے شان دکھاتا آتا
ہاتھ میں پانی کی چھاگل ہے ہلاتا آتا

اس کے آ جانے سے ہوتی ہے نجات اس کے لیے
ہوتا ہے قطرہ آب ، آب حیات اس کے لیے

سردی

یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا
اور بغل سے دل وحشت زدہ نکلا جاتا

یا ہیں اب ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے لیتے
آگ ہاتھ آئے تو دل میں ہیں چھپائے لیتے

مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں
بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں

ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا
پر پھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا

اوڑھ بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے
کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے

کچھ لحافوں سے ابھی منہ کو نکالے ہیں پڑے
لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے

کئی سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کئی کانپتے ہیں
ہیں کئی کانپتے سردی سے کئی ہانپتے ہیں

کہیں سو سو کہیں سی سی کہیں سیٹی ہے
گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے

حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بد حالی کے
رونگٹے ہو گئے سردی سے کھڑے قالی کے

اس کی ہر بیل میں چھپ چھپ کے ہیں سنبل بیٹھے
پردۂ رنگ میں ہیں دبکے ہوئے گل بیٹھے

خلق سے گرمی و سردی کی ہے جو لاگ لگی
تن تو ٹھنڈے ہیں پڑے سینوں میں ہے آگ لگی

ہر نفس بھاپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں
دل میں ہے آگ لگی منہ سے اگلتے ہیں دھوئیں

اشارے

(۱) اس نظم میں بھی شاعر نے کئی جگہ صنعت حسن تعلیل استعمال کی ہے۔ شعر نمبر ۹ ، ۱۰ اور ۱۲ میں یہ صنعت موجود ہے۔ تینوں شعروں کا مطلب اس طرح سمجھا کر لکھیے کہ یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ شاعر نے یہاں حسن تعلیل سے کیا کام لیا ہے۔

(۲) نظم پڑھ کر جاڑے کے موسم کی بڑی واضح تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ آپ نے بھی اس موسم میں لوگوں کی حالت دیکھی ہو گی۔ اپنے مشاہدے اور تجربے کی مدد سے ''موسم سرما کی ایک صبح''، کے عنوان سے مضمون لکھیے۔ مضمون لکھنے سے پہلے سردی، پر سودا کی وہ نظم بھی ایک بار پھر پڑھ لیجیے جو آپ سودا کے کلام میں پڑھ چکے ہیں۔

اسماعیل میرٹھی

محمد اسماعیل نام (۱۸۴۴-۱۹۱۷ء) ، اسماعیل تخلص، میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ روش زمانہ کے مطابق عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی اور محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ مختلف سکولوں میں استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ ملازمت کے آخری بارہ سال نارمل اسکول آگرہ میں گزارے۔ پھر پنشن لے کر بقیہ عمر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔

مولانا آزاد اور حالی نے اردو شاعری کی اصلاح کے لیے جس نیک کوشش کا آغاز کیا تھا مولوی اسماعیل نے نہایت موثر طریقے سے اسے آگے بڑھایا۔ مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھیں۔ ان نظموں میں بچوں کی نفسیات اور مختلف عمر و درجات کے بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھتے ہوئے مولانا نے ایک نئے انداز سے نغمہ سرائی کی ہے۔ وہ سادہ و سلیس زبان میں گرد و پیش کی معمولی معمولی چیزوں کے دلکش پہلوؤں کو نظم کی صورت میں اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ وہ انوکھی اور جاذب نظر بن جاتی ہیں۔ قدرتی مناظر پر بھی ان کی ہلکی پھلکی نظمیں بڑی لطیف اور سبق آموز ہیں۔ ان کے کلام کی وقعت و مقبولیت کا اندازہ مولانا شبلی کے اس قول سے ہوتا ہے کہ ''حالی کے بعد، اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسماعیل میرٹھی ہیں''۔ ان کا کلیات چھپ چکا ہے۔

صبح کی آمد

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں
اجالا زمانے میں پھیلا رہی ہوں

بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں
پکارے گلے صاف چلا رہی ہوں

اٹھو سونے والو ! کہ میں آ رہی ہوں

میں سب کار بہوار کے ساتھ آئی
میں رفتار ، گفتار کے ساتھ آئی

میں باجوں کی جھنکار کے ساتھ آئی
میں چڑیوں کی چہکار کے ساتھ آئی

اٹھو سونے والو ! کہ میں آ رہی ہوں

اذاں پر اذاں مرغ دینے لگا ہے
خوشی سے ہر ایک جانور بولتا ہے

درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے
سہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے

اٹھو سونے والو ! کہ میں آ رہی ہوں

یہ چڑیاں جو پیڑوں پہ ہیں غل مچاتی
ادھر سے ادھر اڑ کے ہیں آتی جاتی

دموں کو ہلاتی پروں کو پھلاتی
مری آمد کے ہیں گیت گاتی

اٹھو سونے والو ! کہ میں آ رہی ہوں

جو طوطے نے باغوں میں ٹیں ٹیں مچائی
تو بلبل بھی گلشن میں ہے چہچہائی
اور اونچی منڈیروں پہ شاما بھی گائی
میں سو سو طرح دے رہی ہوں دہائی

اٹھو سونے والو! کہ میں آ رہی ہوں

ہوئی مجھ سے رونق پہاڑ اور بن میں
ہر اک ملک میں، دیس میں، ہر وطن میں
کھلاتی ہوئی پھول آئی چمن میں
بجھاتی چلی شمع کو انجمن میں

اٹھو سونے والو! کہ میں آ رہی ہوں

جو اس وقت جنگل میں بوٹی جڑی ہے
سو وہ نولکھا ہار پہنے کھڑی ہے
کہ پچھلے کی ٹھنڈک سے شبنم پڑی ہے
عجب یہ سماں ہے عجب یہ گھڑی ہے

اٹھو سونے والو! کہ میں آ رہی ہوں

ہرن چوک اٹھے چوکڑی بھر رہے ہیں
کلیلیں ہرے کھیت میں کر رہے ہیں
ندی کے کنارے کھڑے چر رہے ہیں
غرض میرے جلوے پہ سب مر رہے ہیں

اٹھو سونے والو! کہ میں آ رہی ہوں

میں تاروں کی چھاؤں میں پہنچی یہاں تک
زمیں سے ہے جلوہ مرا آسماں تک
مجھے پاؤ گے دیکھتے ہو جہاں تک
کرو گے بھلا کاہلی تم کہاں تک

اٹھو سونے والو! کہ میں آ رہی ہوں

پجاری کو مندر کے میں نے جگایا
مؤذن کو مسجد کے میں نے اٹھایا

بھٹکتے مسافر کو رستہ بتایا
اندھیرا گھٹایا ، اجالا بڑھایا

اٹھو سونے والو ! کہ میں آ رہی ہوں

لدے قافلوں کے بھی منزل سے ڈیرے
کسانوں میں ہل چل پڑی منہ اندھیرے
چلے جال کندھوں پہ لے کر مچھیرے
دلدّر ہوئے دور آنے سے میرے

اٹھو سونے والو ! کہ میں آ رہی ہوں

لو ہشیار ہو جاؤ اور آنکھ کھولو
نہ لو کروٹیں اور نہ بستر ٹٹولو
خدا کو کرو یاد اور منہ سے بولو
بس اب خیر سے اٹھ کے منہ ہاتھ دھو لو

اٹھو سونے والو ! کہ میں آ رہی ہوں

بڑی دھوم سے آئی میری سواری
جہاں میں ہوا اب مرا حکم جاری

ستارے چھپے ، رات اندھیری سدھاری
دکھائی دیے باغ اور کھیت ، کیاری

اٹھو سونے والو ! کہ میں آ رہی ہوں

میں پورب سے پچھم پہ کرتی ہوں دھاوا
زمین کے کرہ تک لگاتی ہوں کاوا
میں طے کر کے آئی ہوں چین اور جاوا
نہیں کہتی کچھ تم سے اس کے علاوہ
اٹھو سونے والو! کہ میں آ رہی ہوں

- - - - - - - - -

مشقیں

(۱) اس بات پر غور کیجیے کہ شاعر نے کتنی اچھی طرح ہمیں یہ بات سمجھائی ہے کہ صبح کا وقت سونے کے لیے نہیں، کام کرنے کے لیے ہے۔

(۲) اس نظم کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہیں اور یہ ''مخمس ہے'' ''مخمس'' عربی میں پانچ کو کہتے ہیں)۔ بتایئے جس نظم کے ہر بند میں چھ مصرعے ہوں اسے کیا کہتے ہیں۔

(۳) دوسرے بند کو غور سے دیکھیے۔ شاعر نے تھوڑے سے لفظوں میں کتنی زیادہ باتیں کہہ دیں۔ صرف اسی بند کو پڑھ کر صبح کے وقت کی ساری چہل پہل آنکھو میں پھر جاتی ہے۔

بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

ہر قطرے کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ

تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا
میں اور کی گوں نہ آپ جو گا[۱]

کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس
اپنا ہی کروں گا ستیا ناس

۱۔ نہ اپنے لائق نہ دوسروں کے لائق۔

آتی ہے برسنے سے مجھے شرم
مٹی پتھر تمام ہیں گرم

خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت
پھیکی باتوں میں کیا حلاوت

کس برتے پہ میں کروں دلیری
میں کون ہوں کیا بساط میری

ہر قطرے کے دل میں تھا یہی غم
سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم

کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی
کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور
ہمت کے محیط کا شناور

فیاض و جواد و نیک نیت
بھڑکی اس کی رگ حمیت

بولا للکار کر کہ آؤ
میرے پیچھے قدم بڑھاؤ

کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان
ڈالو مردہ زمین میں جان

یارو یہ ہچر مچر کہاں تک
اپنی سی کرو بنے جہاں تک

مل کر جو کرو گے جانفشانی
میدان پہ پھیر دو گے پانی

کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں
آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ
دشوار ہے جی پہ کھیل جانا
ہرچند کہ تھا وہ بے بضاعت
کی اس نے مگر بڑی شجاعت
دیکھی جرأت جو اس سخی کی
دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا
قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار
بارش لگی ہونے موسلادھار
پانی پانی ہوا بیابان
سیراب ہوئے چمن ، خیابان
تھی قحط سے پائمال خلقت
اس مینہ سے ہوئی نہال خلقت

مشقیں

۱ شعر نمبر ۶ میں شاعر نے دو نصیحتیں کی ہیں - اسی طرح کی نصیحتیں بعض اور شعروں میں بھی ہیں ایسے شعروں کو چھانٹ کر اپنی کاپی میں لکھیے -

۲ جس طرح بارش کے قطرے کی مثال لے کر شاعر نے ہمیں ہمت ، جرأت اور خدمت کا سبق سکھایا ہے اسی طرح علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں سورج کی کرن ، کی مثال لے کر یہی بات اور زیادہ خوبصورتی کے ساتھ بیان کی ہے - اس کتاب میں آگے چل کر کسی جگہ اقبال کی نظم ''شعاع امید'' چھپی ہے - اوپر والی نظم کے بعد اس نظم کو پڑھیے اور دیکھیے کہ دو شاعروں نے ایک ہی بات کس طرح دو مختلف طریقوں سے کہی ہے -

صفی لکھنوی

سید علی نقی نام (۱۸۶۲-۱۹۵۰ء) صفی تخلص، لسان القوم خطاب لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دس بارہ سال کی عمر میں عربی و فارسی درسیات کی تکمیل کے بعد فقہ، حدیث، منطق وغیرہ کی تحصیل کی۔ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے ۱۸۸۳ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور محکمہ دیوانی میں مختلف عہدوں پر چالیس سال کام کرنے کے بعد پنشن لی۔ بقیہ عمر علم و ادب کی خدمت میں صرف کی۔

صفی ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے لکھنؤ کی شاعری کا رخ بدلا۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی اور قومی و تاریخی نظمیں سب کچھ لکھا ہے۔ ان کی غزلوں میں فرضی محبت کے قصوں کے بجائے زندگی کے مسائل کی ترجمانی بڑے لطیف و سادہ انداز میں ہوئی ہے لیکن ان کی شاعری کا اصل میدان نظم ہے۔ قومی، تاریخی، اخلاقی اور مظاہر فطرت سے متعلق ان کی نظمیں بڑی سبق آموز اور دلکش ہیں۔ ان کی ایک طویل مثنوی ''تنظیم الحیات'' ہے جو ''اکانومی آف ہیومن لائف'' کا منظوم ترجمہ ہے آگے کے دونوں ٹکڑے محنت و کاہلی اور انصاف اسی کتاب کے دو ٹکڑے ہیں۔

محنت و کاہلی

جو وقت گزر گیا ، گیا وہ کیا پھر بھی پلٹ کے آئے گا وہ
اس کو جو کچھ ہے ہونے والا دیکھے کہ نہ دیکھے تو خبر کیا
انسان ! اے کاہلی میں بدنام موجودہ زمانے ہی سے لے کام
ماضی پہ نہ آہ سرد بھر تو تکیہ آئندہ پر نہ کر تو

موجود ہے جس قدر زمانہ ہے مال ترا ، وہی خزانہ
آئندہ کی کیا خبر کہ کیا ہو اچھا ہو حق میں یا برا ہو
جس کام کا قصد ہے وہ کر ڈال بہتر ہے یہی زمانۂ حال
کرنا ہے جو ، صبحدم وہی کر تا شام اسے نہ ملتوی کر

تکلیف ، افلاس ، بد نتیجے پیدا ہوتے ہیں کاہلی سے
محنت ، روح نشاط و اقبال رکھے گی تجھ کو فارغ البال
محنت کا ہاتھ بے محابا افلاس کو ہے شکست دیتا
گر تو ہے جفاکشی کا خوگر اقبال کا سہرا ہے ترے سر

آخر یہ مالدار ہے کون ؟ اتنا ذی اختیار ہے کون
ہے شہر میں جس کی آج شہرت کرتے ہیں تمام لوگ عزت
ہے کون جو ہے رفیق سلطان اور اس کا مشیر خاص ذی شان
وہ جس نے کاہلی کو چھوڑا منہ اس کی طرف سے اپنا موڑا
اور اس سے چھڑا کے اپنا دامن یہ کہہ دیا کہ تو ہے میری دشمن

سوتا ہے جو نصف شب کو ہشیار ہوتا ہے علے الصباح بیدار
کرتا رہتا غور و محنت تا دل کو بدن کو پہنچے راحت
مطلوب اسے دونوں کی درستی دل کو قوت بدن کو چستی

- - - - - -

کاہل کو ہے وبال زندگانی ہر وقت یہ لب پہ نوحہ خوانی
میرے اللہ کیا کروں میں بھوکوں کب تک یونہی مروں میں
ہر کام میں سستی اس کی عادت دن کاٹتا ہے ، مگر بدقت

- - - - - -

عمر گزراں ہے سایۂ ابر جاتا ہے وہ بے نشاں سوئے قبر
نیکی سے جو تھا عناد اس کو کرتے نہیں لوگ یاد اس کو

- - - - - -

مجموعۂ درد جسمِ کاہل ترک ورزش سے مضمحل دل
کرتا ہے کام کا ارادہ تابِ حرکت نہیں زیادہ
آشفتہ دماغ ، ذہن تاریک کیا سوجھے جو مسئلہ ہو باریک
رغبت تحصیل علم پر ہے محنت کے بغیر بے ثمر ہے
دل چاہتا ہے جو ہاتھ آ جائے بادام کو توڑ کر گری کھائے
سر مغز یوں کرے کون محنت کی طرف قدم دھرے کون

- - - - - -

گھر اس کا پڑا ہے ، نا مرتب ناکارہ رہی زمین بھی سب
گھر میں ہر وقت شور و شر ہے افلاس سے خود قریب تر ہے
اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اپنے کانوں سے سن رہا ہے
خود بھی خواہش یہی ہے دل میں برباد نہ ہوں اس آب و گل میں
لیکن اتنی کہاں ہے ہمت کچھ کر سکے محنت و مشقت

طوفان ، بربادیوں کا اک دن نازل نہ ہو یہ کہاں ہے ممکن
چھوڑے گی نہ شرم اس کا دامن جائیگی وہ ساتھ تا بہ مدفن

انصاف

ہر اک سوسائٹی ، جماعت اس بات کی رکھتی ہے ضرورت
فردوں میں رہے ہمدگر صلح ہے عدل پہ منحصر مگر صلح
ہے منفرداً یہ سب کی خواہش پیدا جو کریں بہ سعی و کاہش
اس سے حاصل کریں خوشی آپ بیٹا ہو اس میں چاہے یا باپ
دونوں جذبوں میں ہے تعارض پیدا ہوتا ہے اک تناقض
پس اس لیے ہے یہی مناسب وہ بات ہو جو ہے امر واجب
یعنی رہے اعتدال ملحوظ ہوگا اس طرح قلب محظوظ
انصاف کو ہم رہنما بنائیں مل جل کے بہم خوشی منائیں

ہمسائے کا جو مال و اسباب چاہے کیسا ہی وہ ہو نایاب
ہرگز نہ کبھی اسے لگا ہاتھ ہر دم ، انصاف ہی کو رکھ ساتھ
دنیا میں طمع بری بلا ہے انجام اس کا بہت برا ہے

لالچ ، غصہ نہ کر زیادہ ہمسایہ ہلاک ہو مبادا

دے اس کے خلاف کیوں گواہی لا اس کے چلن پہ کیوں تباہی
بھڑکا نہ ملازموں کو اس کے رشوت، ترغیب ترک کیوں دے
کیوں بات کر اس کے ساتھ ایسی ممکن نہ ہو جس کی پھر تلافی

ہر کام میں عدل و منصفی کر جو اوروں سے چاہے تو وہی کر

انسان ؟ اے دفتر معائب   ہے نفس کا احتساب واجب
افعال گزشتہ اپنے کر یاد   جن میں ہوئی عمر تیری برباد
توجہ کرنے کا اب ہو عازم   نادم ہو خطا پہ ، یہ ہے لازم
جو خامیاں نفس میں ہیں مستور
کر دور انھیں بہ سعی مشکور

نادر کاکوروی

نادر علی خاں نام (۱۸٦۷-۱۹۱۲ء) نادر تخلص لکھنئو کے ایک معروف قصبے کاکوری میں پیدا ہوئے۔ وہ بڑے ملنسار، باوضع اور نیک نہاد انسان تھے۔ ان کے حالات زندگی اور تعلیم کی تفصیلات معلوم نہیں لیکن ان کے کلام کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے رواج کے مطابق علوم کی تحصیل ضرور کی ہوگی۔ وہ انگریزی زبان سے بھی بخوبی واقف تھے ورنہ انگریزی کے مشہور شعرا بائرن اور سرٹامس مور کی نظموں کے ایسے قابل رشک منظوم ترجمے نہ کر پاتے۔

نادر کو زندگی میں متواتر حادثات کے صدمے اٹھانے پڑے۔ خاص کر بیوی کے انتقال کے بعد وہ بہت رنجیدہ و مغموم رہا کرتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے مرض خناق میں مبتلا ہوئے اور مختصر سی علالت کے بعد اردو کا یہ خوش فکر شاعر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

حالی و آزاد کی "جدید شاعری" کی تحریک کو آگے بڑھانے والوں میں نادر ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت کا آغاز انگریزی نظموں کے تراجم سے ہوا۔ اسکے بعد مختلف موضوعات پر ان کی شگفتہ و خوبصورت نظمیں جدید طرز کے پرستاروں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ نادر کا کلام لطیف جذبات اور اعلیٰ خیالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں مبالغہ اور تکلف کی جگہ حقیقت نگاری سے

کام لیا گیا ہے ۔ وہ سادہ اور منجھی ہوئی زبان میں اپنے خیالات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں ۔ ان کا کلام ''جذبات نادر'' کے نام سے چھپ چکا ہے ۔

نظم پروین

کتنا پیارا ہے یہ منظر ابر رواں کے پردے کے اندر
نیلی ، دھندلی ، سطح فلک پر سرخ شفق کا حاشیہ دے کر
تاروں کی فردی بوٹی کے ٹھپے
بکھرے بکھرے ، چھٹکے چھٹکے

برسیں گزریں ان کو تکتے راتیں بیتیں لیٹے ، جگتے
ہرگز جی نہیں بھرتا ان سے آج یہ کچھ ہیں ، کل یہ کچھ تھے
آتے ہیں معشوقانہ ادا پر
روز نیا اک روپ بدل کر

کوہ نور اور کان جواہر ہیرے اور پکھراج کے زیور
کتنی ہی قیمت ان کی ہو ، پر آگے ان کے سب ہیں پتھر
سب سے بات ہے ان کی بالا
سب سے اونچے ، سب سے اعلےٰ

ساحل بحر پہ گر ہم جا کر تیرائیں لاکھوں شمعیں جلا کر
سارا سمندر کر دیں منور پر جب دیکھیں آنکھ اٹھا کر
ہوں وہ ان کے مقابل ایسے
مہر کے آگے جیسے ذرے

نیند

نیند ہے اک پاک دیوی ، اک پری ہے ، ایک حور
دل کی قوت ، جسم کی ہے جان اور آنکھوں کا نور
ہے طبیعت اس کی اک لہر ، ایک جھونکا ، اک سرور
ہاں اگر کچھ عیب ہے اس میں تو اتنا ہے ضرور
یہ غریبوں سے ہے نزدیک اور امیروں سے ہے دور
چین دیتی ہے انھیں اور ان کو ترساتی ہے نیند

صاف ستھرے نرم بستر پر پڑا ہے اک امیر
باد ادب حاضر ہیں خدمت کے لیے برنا و پیر
دم بخود ، خاموش بیٹھے ہیں مہذب اور شریر
ہاں مگر اک نیند کرتی ہے اداؤں میں اسیر
دور سے دکھلا کے اڑ جاتی ہے روئے دل پذیر
شوخیاں کرتی ہے ، ترساتی ہے تپکاتی ہے نیند

بج گئے دو ، اور سر پر آ گیا ماہ مبیں
سو گئی آبادی آدم کی آدھی سر زمیں
ہلکے ہلکے جھونکے دیتی ہے ہوائے عنبریں
اونچے کوٹھے پر ہوا میں بادل اندو ہگیں
ایک پھولوں کی پلنگڑی پر پڑی ہے نازنیں
چاہتی ہے نیند آ جائے نہیں آتی ہے نیند

تھک گئے افسانہ گو، عاری ہوئے سب قصہ خواں
مل چکے تلووں میں کا ہو، سر پہ کیوڑا خادماں
باغ میں، آغوش گل میں، اک پڑا ہے نوجوان
کوئی پنکھا جھل رہا ہے، کوئی کہتا ہے کہ ہاں
نیند پیاری نیند آ جا سو رہی جا کر کہاں
ہو گئی صبح اور نہ اب آتی نہ تب آتی ہے نیند

بادشاہوں اور وزیروں کو ہے فکر صلح و جنگ
عابد و زاہد ہیں فکر پرسش عقبیٰ میں دنگ
شاعروں کا قافیہ، فکر مضامین، میں ہے تنگ
ان سبھوں کو ہے غم دنیائے دوں سینے کا سنگ
ہاں وہ بے فکرے جنھیں ہے نام سے فکروں کے ننگ
ان دلاروں، ان پیاروں کو سلا جاتی ہے نیند

آہ ان محنت زدوں کا کون تھا پرسان حال
ان تھکے ماندوں، غریبوں کا کسے تھا کچھ خیال
اغنیا کی خدمتوں میں ہو رہے ہیں پائے مال
دن کی محنت، ضعف کی شدّت سے چہرہ ہے نڈھال
نیند کر دیتی ہے لیکن قوت رفتہ بحال
کس قدر غربا نوازی آکے فرماتی ہے نیند

وہ ہوا، وہ شور طوفاں وہ تھپیڑے موج کے
گرتے ہیں پانی پہ اٹھ اٹھ کے جہاز اس طرح سے
گویا پتے تھے کہ آندھی میں اڑے اور آ گرے
اونچے مستولوں پہ ملاحوں کے لونڈے ہیں پڑے
اپنی میٹھی نیند سوتے ہیں مگر حیرت یہ ہے
تو اس آفت میں انھیں کیونکر سلا جاتی ہے نیند!

رات اور بچے ٹھنکتے ہیں ، ہمیں بسکٹ ملیں
کہہ رہی ہے ماں کہ بیٹا سو رہو تو چیز دیں
چوک سے ابا تمھارے مول لے کر آ تو لیں
اتنے میں نیند آکے کھو دیتی ہے سب ان کی ہٹیں
تھپکیاں دے دے کے بہلاتی ہے بچوں کی ضدیں
ٹھونک کر مچلے ہوئے بچے سلا جاتی ہے نیند

مچھروں کی بھنبھناہٹ اور بازاروں کا گند
اس میں حلوائی پڑے سوتے ہیں دوکانوں میں بند
ہو رہی ہیں ان کے خراٹوں کی آوازیں بلند
آہ ان لوگوں کی تو اے نیند ! اتنی درد مند
کلبۂ احزاں تجھے اے موہنی اتنا پسند
اور یہ شاہی کوچ کچھ تجھ کو نہیں بھاتی ہے نیند !

اے پیاری نیند ! سب ذی روح پالے ہیں ترے
سارے حیوانات دنیا کے حوالے ہیں ترے
بچے سے بوڑھے تلک ، گودوں کے ہیں پالے ترے
کیوں یہ اک مزدور ہی آرام والے ہیں ترے
کیوں امیروں کے گھروں میں ایسے لالے ہیں ترے
کیوں تو ان آرام گاہوں میں نہیں آتی ہے نیند

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳-۱۹۵۶ء) کرم آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے بی - اے کرنے کے بعد حیدرآباد (دکن) میں دارالترجمہ میں ملازم ہو گئے اور کئی فارسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا - والد کے انتقال کے بعد وطن واپس آ گئے اور روزنامہ ''زمیندار'' کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے - مولانا نے اس اخبار کے ذریعہ ایک عرصے تک مسلمانان ہند و پاکستان کےخیالات کی ترجمانی بڑی بے باکی سے کی -

مولانا ایک قادرالکلام شاعر اور بلند پایہ نثر نگار تھے - انھیں ملکی اور اسلامی سیاست سے گھری دلچسپی تھی اور ان کی نظم و نثر کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری و اتحاد تھا - وہ شیدائی رسول اور اسلام کے سچے خادم تھے - ان کی نعتیں عشق رسول سے معمور اور نظمیں ایمان افروز ہیں - مولانا کی طبیعت میں بے پناہ روانی تھی وہ مشکل سے مشکل زمین میں بڑی بے تکلفی سے لمبی لمبی نظمیں لکھ جاتے اور ایسے ایسے قافیے استعمال کرتے کہ حیرت ہوتی - زبان پر انھیں بلاشبہ بڑی قدرت حاصل تھی - مولانا کے تین مجموعے بہارستان ، نگارستان اور چمنستان چھپ چکے ہیں -

- - - - - - - - -

بشارت

کوئی دن جاتا ہے پیدا ہو گی اک دنیا نئی
خون مسلم ، صرف تعمیر جہاں ہو جائے گا

بجلیاں غیرت کی تڑپیں گی فضائے قدس میں
حق عیاں ہو جائے گا باطل نہاں ہو جائے گا

ان کواکب کے عوض ہوں گے نئے انجم طلوع
ان دنوں رخشندہ تر یہ آسماں ہو جائے گا

پھر نئے محمود ہوں گے ، حامی دین متیں
بچہ بچہ غیرت الپ ارسلاں ہو جائے گا

میرے جیسے ہوں گے پیدا سینکڑوں اہل سخن
نکتہ نکتہ جن کا آزادی کی جاں ہو جائے گا

شان مزدوری کی دنیا میں بڑھا دی جائے گی
بے نشاں سرمایہ داری کا نشاں ہو جائے گا

ڈھائی جائے گی بنا یورپ کے استعمار کی
ایشیا آپ ، اپنے حق کا پاسباں ہو جائے گا

نغمہ آزادی کا گونجے گا حرم اور دیر میں
وہ جو دارالحرب ہے دارالاماں ہو جائے گا

ہم کو سودا ہے غلامی کا کہ آزادی کی دھن
چند ہی دن میں ہمارا امتحاں ہو جائے گا

اس بشارت کو نہ سمجھو ایک دل خوش کن قیاس
جس کو سن کر ہر مسلماں شادماں ہو جائے گا

سچ ہے میرا حرف حرف، اور جس کو اس میں شک ہے آج
دیکھ لینا کل مرا ہم داستاں ہو جائے گا

اشارے

(۱) اقبال کی بانگ درا میں ایک نظم ہے "شمع اور شاعر"۔ اس نظم کے ایک بند میں اقبال نے بھی اسی طرح کی "بشارت یا خوشخبری" دی ہے جیسی اوپر والی نظم میں مولانا ظفر علی خان نے ۔ آپ "شمع اور شاعر" کا یہ بند ضرور پڑھیے ۔ آپ کو بے حد لطف آئے گا ۔ بند اس شعر سے شروع ہوتا ہے ۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

(۲) آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ مسلمانوں نے اپنی آزادی کی جد و جہد غدر ۱۸۵۷ء کے بعد شروع کر دی تھی ۔ اس جد و جہد میں مسلمانوں کو آزمائشوں کی بہت سی منزلوں سے گزرنا پڑا اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں اللہ نے انھیں کامیاب کیا اور انھوں نے "پاکستان" کے نام سے ایک علیحدہ مملکت قائم کی ۔ مولانا ظفر علی خاں بھی ہماری جد و جہد آزادی کے بڑے نامور سپاہی ہیں ، انھوں نے طرح طرح سے اس جہاد میں حصہ لیا ہے ۔ ان کے جہاد کا ایک حصہ "قلم کا جہاد" ہے ۔ اوپر والی نظم کو غور سے پڑھیے ۔ اس میں جن جن باتوں کی بشارت دی گئی ہے، اللہ نے سب پوری کیں ۔ اس اعتبار سے شعر نمبر ۶ سے ۱۰ تک کو غور سے پڑھیے ۔ ان میں سے ہر بات پوری ہو گئی ہے ۔

وادیٔ جہلم

گاتے ہوئے یہ نغمے دومیلی سے چلے ہم
اسلام سے ہے گرمیٔ ہنگامۂ عالم

ہرگز نہ جھکے گا کبھی توحید کا پرچم
گا تو بھی یہی زمزمہ اور یہی سرگم

اے وادیٔ جہلم !

میدان ترے شاداب، سمن بر ترے ٹیلے
چشمے ترے شفاف ، چمن تیرے رنگیلے
کھیتی تری سرسبز ، ثمر تیرے رسیلے
رونق ترے باغوں کی خزاں کر نہ سکی کم

اے وادیٔ جہلم !

انساں ہیں تہمتن تو سرشت ان کی وفا خیز
توسن ہیں اگر تیز تو برق ان کی ہے مہمیز
قابض تری اس صولت و سطوت پہ ہیں انگریز
یہ صولت و سطوت ہے تو انگریز کو کیا غم

اے وادیٔ جہلم !

یونان کے ہنگامے کو غزنی کے شغب کو
محمود کے غصے کو سکندر کے غضب کو
موجیں تری ندی کی بہا لے گئیں سب کو
اب کس کی تباہی کے ارادے ہیں مصمم

اے وادیٔ جہلم !

- - - - - - - -

سلطان ٹیپو کے مزار پر دو آنسو

اے سرنگاپٹم ! اے گنج شہیدان کرام
آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود
تیری آنکھوں میں ہے اپنوں کا عروج اور زوال
تو نے دیکھا ہے پرایوں کا ہبوط اور صعود
کام میں لا نہ سکی تھی جسے خاک دہلی
ترے ذروں نے بچھا دی وہ حجازی بارود
کشور ہند کا رنگ اور ہی ہوتا کچھ آج
مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخ کبود

سو رہا ہے ترے پہلو میں وہ میسور کا شیر
مایۂ ناز تھا ملت کے لیے جس کا وجود
قوت بازوئے اسلام تھی اس کی صولت
اس کی دولت کے دعاگوؤں میں شامل تھے ہنود
کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے
اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود
اس کے اٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود
آخری قول نہ اس کا یہ ہمیں بھولے گا
جس سے قائم ہوئیں آئینِ حمیت کی حدود
شیر اچھا ہے جسے مہلت یک روزہ ملی
یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود

مشقیں اور اشارے

(۱) انگریزوں نے غلامی کی جو زنجیریں ہندوستان کے پیروں میں ڈالی تھیں ، انھیں توڑنے کی کوشش کرنے والوں میں ٹیپو سلطان کا نام بہت اہم ہے ۔ سلطان ٹیپو ہماری جنگ آزادی کے بہت بڑے ہیرو ہیں ۔ آزادی کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا اور ہم ہمیشہ ان کی روح کو خراج عقیدت پیش کرتے رہیں گے ۔ وہ آزادی کے لیے لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک سبق سکھا گئے ، وہی سبق ہے جسے شاعر نے نظم کے آخری شعر میں نظم کیا ہے ۔

(۲) اقبال نے بھی اپنے کلام میں سلطان ٹیپو کا ذکر بڑی عقیدت و احترام سے کیا ہے ۔ آیندہ صفحات میں آپ کو اقبال کے چار شعر ملیں گے جن کا عنوان ہے ،،سلطان ٹیپو کی وصیت،، انھیں غور سے پڑھیے

برسات

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی

آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادر ابر سیاہ
برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ

بادل اتنے میں درناسفتہ برسانے لگا
داستان قلزم و عمان دہرانے لگا

جھوم کر اٹھی گھٹا ، برسی ، برس کو چھٹ گئی
گرد کی چادر زمیں کے منہ سے فوراً ہٹ گئی

بادلوں سے نور خورشید اس طرف چھننے لگا
سائباں قوس قزح کا اس طرف بننے لگا

جنگلوں میں مست ہو کر ناچتے پھرتے تھے مور
کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور

ڈھل کے پہنچا تھا افق کے آستان تک آفتاب
تھی شفق کی اس کے منہ پر ایک نارنجی نقاب

یہ نظر آرا مناظر تھے کچھ ایسے دل فریب
ہاتھ سے جاتا رہا دل میرے اور دل سے شکیب

عالم از خود رفتگی کا مجھ پر طاری ہوگیا
جوش مستی کا مری رگ رگ میں طاری ہوگیا

علامہ اقبال

(۱)

دعا

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے ، جو روح کو تڑپا دے

پھر وادی فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوق تماشا دے ، پھر ذوق تقاضا دے

محروم تماشا کو پھر دیدہ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

پیدا دل ویراں میں پھر شورش محشر کر
اس محفل خالی کو پھر شاہد لیلیٰ دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشان کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر
خود داریٔ ساحل دے ، آزادیٔ دریا دے

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر ، دل صورت مینا دے

احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں ، محتاج کو داتا دے

(۲)

سلطان ٹیپو کی وصیت

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلٰے بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب، بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز، گرمیٔ محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل[۴] نے
جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

------

(۳) شعاعِ امید

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح، کبھی شام

مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایام

نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثل صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام

پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپالے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(۳)

اک شوخ کرن ، شوخ مثال نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند[۱] کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب !
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

۱- یہ نظم جس وقت لکھی گئی تھی اُس وقت پاکستان نہیں بنا تھا -

(یہ بند مشہور نظم "شمع اور شاعر" سے لیے گئے ہیں)

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا، اندیشۂ طوفاں سے کیا
نا خدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

دیکھ آ کر کوچہ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

شعلہ بن کر، پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے، لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا
جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھو
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھو

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
یعنی گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

نالہ صیاد سے ہوں گے نواساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگین قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

(ذیل کے بند نظم "طلوع اسلام" سے لیے گئے ہیں)

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل ! کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کے گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی ، مکیں آنی ، ازل تیرا ، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خون جگر تیرا
تیری نسبت براہیمی ہے ، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہان آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری ، محبت کی فراوانی
بتان رنگ و بو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی اندھیری رات میں قندیل رہبانی

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زور حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدق سلمانیؓ
ہوئے احرار ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگاف در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثبات زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، بادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
تمیز بندہ و آقا، فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو، خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یقین محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلند و مشرب نابی
دل گرمی ، نگاہ پاک بینی ، جان بی تابی

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خون شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفون دریا ، زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے
غبار رہگزر ہیں ، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے
حرم رسوا ہوا ، پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانان تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریان آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر ، پایندہ تر ، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورتگرِ تقدیرِ ملت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا ، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی ، یہ افغانی ، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

تیرے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی

اکبر الہ آبادی

قطعات

(۱)

بہت ہی عمدہ ہے اے ہمنشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل بیچ میں ہے، ڈھیلی اسکی چول بھی ہے

نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمّق سے
تمھاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے

خلل نہ شغل میں بدھو کے ہے نہ حسو کے
کہ شیخ سدو بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے

جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبلی کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے

چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے

طرح طرح کے بنا لو لباس رنگا رنگ
علاوہ روئی کے ریشم بھی اور وول بھی ہے

اندھیری رات میں جنگل میں ہے رواں انجن
کہ جس کو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے

شگفتہ پارک ہیں، ہر سمت رہرووں کے لیے
نظر نواز ہے پتی، حسین پھول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اسکے ڈیم فول بھی ہے

(۲)

نہ نماز ہے نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس میں کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

جو خیال ہیں نرالے تو مذاق ہیں انوکھے
نہ وہ وضع قوم کی ہے، نہ وہ شان ہے نہ دھج ہے

جو کر آئے سیر لندن ہیں اسیر کبر و فیشن
جو یہیں گئے ہیں بن ٹھن، انھیں اینڈ ہے گرج ہے

(۳)

تم شوق سے کالج میں پلو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو

بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اشارے

(۱) پہلے قطعے میں اکبر نے انگریزوں کے عہد حکومت پر بڑی پر لطف طنز کی ہے - پہلے انگریزی عہد کی ان چند باتوں کا ذکر کیا ہے جنھیں لوگ "انگریزی راج کی برکتیں" کہتے ہیں، لیکن آخری شعر میں ان سب چیزوں پر پانی پھیر دیا - غلاموں کی ذہنیت کی بڑی صحیح تصویر کھینچی ہے -

(۲) دوسرے اور تیسرے قطعے میں زندگی کی سب چیزوں کو ایک طرف رکھ کر یہ سبق دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان اللہ کو بھی یاد رکھے -

----

رباعیات اکبر

(۱)

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

(۲)

اونچا نیت کا اپنی زینا رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینا رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر
لیکن ہے شدید عیب ، کینا رکھنا

(۳)

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعال مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

(۴)

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر
دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو
جو اہل ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر

(۵)

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش
ذلت ہے دراصل جاہ و شوکت کی تلاش

اکبر تو سرور طبع کو علم میں ڈھونڈ
محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

(۶)

خاطر مضبوط دل توانا رکھو
امید اچھی خیال اچھا رکھو

ہو جائیں گی مشکلیں تمھاری آساں
اکبر اللہ پر بھروسا رکھو

جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خاں نام اور جوش تخلص ہے۔ ادبی حلقوں میں ''شاعر انقلاب'' اور ''شاعر شباب'' مشہور ہیں۔ جوش لکھنئو کے ایک قصبے ملیح آباد میں (۱۸۹۸ء) پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ذی عزت، خوش حال اور علم دوست خاندانوں میں سے تھا۔ باپ دادا سب صاحب دیوان شاعر تھے۔ گھریلو تعلیم و تربیت نے جوش کے ادبی و شاعرانہ ذوق کو ابھارنے میں مدد دی۔

ابتدا میں ٹیگور کے اثر سے جوش نے رومانی شاعری میں فروغ پایا پھر اقبال سے متاثر ہو کر قومی شاعری کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو جوش ایک قومی اور انقلابی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ مگر اس نئی تحریک میں شامل ہو کر انھوں نے نوجوانوں کی ذہنی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ نئی نسل کے تمام شعرا اقبال کے بعد جوش ہی سے متاثر ہوئے ہیں۔

جوش کو نظم، غزل، رباعی غرض ہر صنف پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان کی غزل کا موضوع عشق و رندی ہے۔ غزل کے اشعار میں صفائی، روانی اور سلاست کے ساتھ ایک طرح کی بلند آہنگی و مردانگی پائی جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں جوش، سادگی اور صداقت بدرجہ احسن موجود ہے۔ اردو نظم میں بڑی شدت و وسعت کے ساتھ

سیاسی و انقلابی رجحانات پیدا کرنے کے ذمہ دار بڑی حد تک جوش ہی ہیں - ان کی رباعیات میں بھی بڑی رنگا رنگی اور تنوع پایا جاتا ہے - زبان پر جوش کو بے پایاں عبور حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں قابل قدر اضافہ کیا ہے -

تقسیم سے پہلے جوش دارالترجمہ حیدر آباد دکن میں تقریباً دس سال ناظر ادب رہے - پھر دہلی سے اپنا ایک رسالہ ''کلیم'' نکالا اور تقسیم کے بعد رسالہ ''آجکل'' کے مدیر اعلیٰ رہے - ۱۹۵۵ء میں کراچی آگئے اور ترقی اردو بورڈ میں ادبی مشیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے - جوش کے کلام کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں : روح ادب ، نقش و نگار ، شعلہ و شبنم ، فکر و نشاط ، سنبل و سلاسل ، عرش و فرش ، جنوں و حکمت -

------

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا ظلمت کا نشان لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں ، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں ، ظلمت کا قدم تھرّانے لگا

بادل میں چھپا تو کھول دیے ، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوش نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

البیلی صبح

نظر جھکائے عروس فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لو تھر تھرا رہی ہے

روش روش نغمۂ طرب ہے چمن چمن رنگ و بو سراسر
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا، ہوا میں پلو سکھا رہی ہے

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گردو پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

رباعیات جوش

(۱)

وہ کفر کی تکرار کیے جاتا ہے
یہ دین پہ اصرار کیے جاتا ہے
اک عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار کیے جاتا ہے

(۲)

افسوس ہے اے جی کے گنوانے والو
ہر سانس میں سو فریب کھانے والو
غم ، موج تبسم سے ترش جاتا ہے
بیدار ہو اے اشک بہانے والو

(۳)

خونی چشمے ابل رہے ہیں یا رب !
خنجر سینوں پہ چل رہے ہیں یا رب
تجھ کو بھی خبر ہے کہ تری دنیا میں
چھوٹوں کو بڑے نگل رہے ہیں یا رب

(۴)

ہر منظر زشت و خوب بھاتا ہے مجھے
ہر ذرہ نئی جھلک دکھاتا ہے مجھے
پھولوں میں بھی امتیاز کرتا تھا کبھی
کانٹوں پہ بھی اب تو پیار آتا ہے مجھے

(۵)

ہر راہ میں اک شور ہے راحت کے لیے
ہر گام پہ اک حشر ہے عشرت کے لیے

مخلوق کی جست و خیز توبہ ، توبہ
ساری یہ اچھل کود ہے دولت کے لیے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

محمد حفیظ نام ، حفیظ تخلص اور ابوالاثر کنیت - آپ ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم جالندھر میں حاصل کی - علمی و ادبی کاموں میں شروع ہی سے دلچسپی تھی - لاہور میں انھوں نے "ہونہار بکڈپو" قائم کیا اور علمی و ادبی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں مصروف رہے - دوسری جنگ عظیم کے دوران میں وہ دہلی میں سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن Song Publicity Organisation کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے اور کافی عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے - تقسیم ہند کے بعد آزاد کشمیر میں پبلسٹی کے کام کی نگرانی کی -

ان کے شعر و شاعری کے شوق کو مولانا غلام قادر گرامی کی شاگردی نے چمکایا - پہلے غزلیں کہیں پھر گیتوں میں نام پیدا کیا - اس کے بعد نظم کے میدان میں "شاہنامۂ اسلام" جیسی شاہکار نظم لکھی - ان کی نظموں کے کئی مجموعے نغمہ زار، سوز و ساز، تلخابۂ شیریں وغیرہ چھپ چکے ہیں - ہمارا قومی ترانہ بھی انھیں کا لکھا ہوا ہے -

حفیظ قادرالکلام شاعر ہیں - ان کی زبان شیریں اور بحریں بڑی مترنم ہوتی ہیں - گیتوں میں ہندی الفاظ کے استعمال سے بے حد نغمگی پیدا کر دیتے ہیں - ان کا کلام سادگی و دلکشی کا موقع ہے -

----

شام رنگین

پچھم کے در پہ سورج بستر جما رہا ہے
رنگین بادلے میں چہرہ چھپا رہا ہے

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے و کناریوں کو

عکس شفق نے کی ہے اس طرح ضو فشانی
گھل مل کے بہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی

اوڑھے سیہ دوپٹے سر سبز وادیوں نے
زیور اتار ڈالے گلزار زادیوں نے

چھایا ہے تھوڑا تھوڑا پیڑوں تلے اندھیرا
چڑیوں نے کھیت چھوڑا، لینے لگیں بسیرا

کلیوں کے قہقہوں سے معمور ہیں ہوائیں
پریوں کی لوریاں ہیں یہ رس بھری صدائیں

لپٹی ہوئی ہیں نیندیں کیف آفریں ہوا میں
خاموشیوں کی لہریں اٹھنے لگیں فضا میں

گم ہو چلی ہے دنیا بکھرے ہوئے سکوں میں
دن غرق ہو رہا ہے چپ چاپ کے فسوں میں

کھیتوں میں کام کر کے لوٹے ہیں کام والے
چادر سروں پہ ڈالے، کندھوں پہ ہل سنبھالے

اب شام آ گئی ہے جاگے ہیں بھاگ ان کے
ہر سمت گونجتے ہیں رستوں پہ راگ ان کے

لے لے کے ڈھور ڈنگر چرواہے آ رہے ہیں
سیٹی بجا رہے ہیں، اور گیت گا رہے ہیں

کم سن سہیلیوں کا پنگھٹ میں جمگھٹا ہے
جانے اکیلیوں کا دن کس طرح کٹا ہے

یہ بار بار باتیں یہ بار بار ہنسنا
یہ بے شمار باتیں، یہ بے شمار ہنسنا

اک گد گدا رہی ہے، چھینٹے اڑا رہی ہے
اک بھر چکی ہے پانی گاگر اٹھا رہی ہے

شرما کے اک نے اوڑھے منہ پر ہنسی کے مارے
رنگین اوڑھنی کے بھیگے ہوئے کنارے

شرم و حیا کی سرخی چہرے پہ چھا رہی ہے
شام اس کو دیکھتی ہے اور مسکرا رہی ہے

ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح

(یہ نظم مولانا محمد علی جوہر کا درد انگیز مرثیہ ہے۔ اس میں مولانا کی ان خدمات کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے آزادی کے حصول کے لیے انجام دیں اور بالآخر اسی کوشش میں وطن سے دور اس دنیا سے رخصت ہوئے اور شہید کا مرتبہ پایا)

غضب تھا اک شکستہ ناؤ کا منجھدار میں پھنسنا
وفا کی سسکیاں، قسمت کا رونا، موت کا ہنسنا

فقط اک سر پھرا ملاح طوفانوں سے لڑتا تھا
ہوا کے، آب کے جنوں سے، شیطانوں سے لڑتا تھا

اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انسان تھے
یہ سب ملاح کے ہم قوم تھے، پکے مسلماں تھے

یہ سب تھے عقل و جرأت میں ارسطو اور اسکندر
مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر

چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی
ابھرتی ، بیٹھتی ، دبتی دباتی اور چکراتی

کبھی گرداب کے منہ میں، کبھی پرشور دھارے پر
کبھی اس کے اشارے پر، کبھی اس کے اشارے پر

ہوا کے دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں
پہاڑ اٹھ اٹھ کے ٹکراتے تھے یا پانی کی موجیں تھیں

فلک پر بے تحاشا دوڑتے تھے ابر کے گھوڑے
کڑکتی بجلیاں برسا رہی تھیں آتشیں کوڑے

اڑا کرتے ہیں صدموں سے جگر کے جس طرح لختے
اکھڑتے جا رہے تھے رفتہ رفتہ ناؤ کے تختے

تعجب ہے کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو
کہ طوفان میں نظر آتی تھی خامی باکمالوں کو

انہیں معلوم تھا گرداب نے کشتی کو گھیرا ہے
گھڑی بھر میں یہ بیڑا اب نہ تیرا ہے نہ میرا ہے

انہیں دعوے تھے بحر زندگی میں ناخدائی کے
انہیں گر یاد تھے گرداب میں مشکل کشائی کے

یہ طوفانوں پہ کر سکتے تھے لچھے دار تقریریں
دکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفانوں کی تصویریں

ہوا کا رخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے
نہ دریا نہنگوں کی نظر پہچان جاتے تھے

یہ سب جو پاؤں پھیلائے ہوئے کشتی میں لیٹے تھے
پرانے ناخداؤں اور ملاحوں کے بیٹے تھے
مگر وہ "سر پھرا ملاح" تنہا تھا، اکیلا تھا
ادھر موجوں کی شدت تھی ادھر پانی کا ریلا تھا
وہ چلّاتا تھا، اٹھو بھائیو آؤ، ادھر آؤ
ذرا ہمت دکھاؤ، دست و بازو کام میں لاؤ
ہوا میں اڑ چکی ہے دھجی دھجی بادبانوں کی
شکستہ ہو چکی ہے ناؤ، مانگو خیر جانوں کی
اکھڑ جائیں گے تختے، آؤ ان کو تھام لو آ کر
سلامت ہیں جو کچھ اوزار، ان سے کام لو آ کر
ادھر سیلاب پھر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے
ادھر گرداب بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے
نہیں ہنگام سونے کا، کھڑے ہو جاؤ تن جاؤ
حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ
مبادا ناؤ اب کے اور بھی کمزور ہو جائے
یہ گرداب بلا شاید دہان گور ہو جائے
وہ چلایا، وہ چیخا، منتیں کیں، آہ و زاری کی
مگر بے سود تھا سب کچھ، کسی نے بھی نہ یاری کی
نہ آمادہ ہوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر
سبھی ہنستے رہے ملاح کی "ہرزہ سرائی" پر
بلاتا تھا وہ نام غیرت اسلام لے لے کر
جھڑک دیتے تھے لیکن سب اسے دشنام دے دے کر

مگر ملّاح اپنے فرض کا احساس رکھتا تھا
وہ اپنے ساتھیوں کی آبرو کا پاس رکھتا تھا

اسی نے جسم پر کھائے تھپیڑے تند موجوں کے
اسی کے ساتھ ٹکرائے ہوائے تیز کے جھونکے

وہ اپنی جان پر سہتا رہا ، سہتا رہا تنہا
"اٹھو، ہمت کرو"! کہتا رہا کہتا رہا تنہا

مگر ہنستے رہے، ہنستے رہے غفلت کے شیدائی
اسی کشتی کے ہمراہی ، اسی ملاح کے بھائی

ادھر بڑھتی رہی ، بڑھتی رہی دریا کی طغیانی
ادھر گھٹتی رہی گھٹتی رہی ، توفیق انسانی

شکستہ ناؤ کا ملاح بے دم ہو گیا آخر
بڑھا کر حوصلہ تن میں لہو کم ہو گیا آخر

گرا دریا میں چھو، ہاتھ سے پتوار بھی چھوٹی
شکستہ ہو گئے بازو ، مگر ہمت نہیں ٹوٹی

وہ کشتی کے محافظ ڈھونڈتا تھا اب بھی یاروں میں
انہیں تاکید کرتا تھا اشاروں ہی اشاروں میں

مگر اس کے اشاروں کو سمجھ سکتا نہ تھا کوئی
سمجھ سکتا بھی ہو تو اس طرف تکتا نہ تھا کوئی

تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ
لگا جھکنے وہ سرافراز سر آہستہ آہستہ

وہی سر جو ہواؤں سے نہ طوفانوں سے جھکتا تھا
نہ فرعونوں سے جھکتا تھا، نہ ہامانوں سے جھکتا تھا

نہ جھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے
وہ سر اک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے
تعجب سے ردائے ابر میں سے برق نے جھانکا
کہ یہ اک آخری سجدہ تھا اس مرد مسلماں کا
شکستہ ناؤ میں طوفان کی اس چیرہ دستی میں
وہ اپنا فرض پورا کر چکا تھا بحر ہستی میں
نہ رو،او بے حمیت قوم! اب رونے سے کیا حاصل
دکھانے کے نہیں قابل یہ منہ دھونے سے کیا حاصل
ترا رونا، تیری طرز ستم سے بھی نرالا ہے
اسے روتی ہے جس کو تو نے خود ہی مار ڈالا ہے
در توبہ ، بغیر توبہ ہرگز کھل نہیں سکتا
لہو کا داغ رسمی آنسوؤں سے دھل نہیں سکتا۔

حضرت ام عمارہؓ

(یہ نظم حفیظ جالندھری کی مشہور تصنیف "شاہ نامہ اسلام" سے لی گئی ہے)

اُحد میں خدمتیں جن کی بہت ہی آشکارا تھیں
انھیں میں ایک بی بی حضرت ام عمارہؓ تھیں
پئے اسلام دے کر اپنے فرزندوں کی قربانی
پلاتی تھی یہ بی بی زخمیان جنگ کو پانی
نبیؐ کی ذات پر جب جھک پڑے ایمان کے دشمن
ہوئے اس زندگی بخش جہاں کی جان کے دشمن
اسی شمع ہدیٰ پر جب پلٹ کر آ گئی آندھی
تو اس بی بی نے رکھ دی مشک، چادر سے کمر باندھی

تھے اس کے شوہر و فرزند بھی مصروف جاں بازی
رسول اللہ پر قربان تھے اللہ کے غازی

ہوئی یہ شیر زن بھی اب قتال و جنگ میں شامل
سپر بن کر لگی پھرنے بہ گرد ہادیٔ کامل

یہ اپنی جان پر ہر زخم دامن گیر لیتی تھی
کوئی حربہ وجود پاک تک آنے نہ دیتی تھی

نظر آئی نئی صورت جو حرز جان پیغمبرؐ
کیا یک لخت بڑھ کر حملہ اک بدکیش نے اس پر

نہتی تھی مگر کرنے لگی پیکار دشمن سے
مروڑا اس کا بازو ، چھین لی تلوار دشمن سے

اسی شمشیر سے اس نے سر شمشیر زن کاٹا
ہوا اس شیر زن کے خوف سے اعدا میں سناٹا

جدھر بڑھتے ہوئے پاتی تھی یہ محبوبؐ باری کو
پہنچتی تھی وہیں ام عمارہؓ جاں نثاری کو

سر و گردن پہ اس بی بی نے تیرہ زخم کھائے تھے
مگر میدان سے اس کے قدم ہٹنے نہ پائے تھے

یہ اٹھی تھی نماز صبح کو تاروں کے سائے میں
نماز ظہر تک قائم تھی تلواروں کے سائے میں

فرشتے دنگ تھے اس تیغ ایمانی کے جوہر سے
کہ حاضر تھی یہ جان و مال سے فرزند و شوہر سے

یہی مائیں تھیں جن کی گود میں اسلام پلتا ہے
اسی غیرت سے انسان نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے

- - - - - - -

ڈاکٹر تاثیر

محمد دین نام (۱۹۰۲-۱۹۵۰ء) تاثیر تخلص ، امرتسر کے قصبے اجنالہ میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی ۔ ۱۹۲۶ء میں ایف ۔ سی کالج لاہور سے انگریزی میں ایم ۔ اے کیا دو سال بعد انگلستان چلے گئے اور کیمرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ انھوں نے سرکاری ملازمت بھی کچھ عرصہ کی لیکن زیادہ وقت ایک استاد اور پرنسپل کی حیثیت سے مختلف تعلیمی اداروں میں گزارا ۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے ۔

ڈاکٹر تاثیر بیک وقت ایک سلجھے ہوئے ادیب ، خوش فکر شاعر ، اچھے نقاد اور ماہر تعلیم تھے ۔ وہ بڑے خوش اخلاق ، ملنسار اور باغ و بہار قسم کے انسان تھے ۔ ان میں ایسی خوبیاں تھیں کہ ہر محفل پر چھا جاتے تھے ۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے ۔ علامہ اقبال کے فیض صحبت نے ان کے شاعرانہ ذوق کو جلا دی وہ شروع میں رومانی نظمیں کہتے رہے ۔ بعد کی نظموں میں انقلابی رنگ زیادہ ہے ۔ ان کی نظموں کے متعلق ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہماری شاعری میں وزن، قافیہ اور ردیف کا جیسا خیال رکھا جاتا تھا ڈاکٹر تاثیر کی بہت سی نظمیں اس قید سے آزاد ہیں یعنی وہ آزاد نظم" کہتے تھے ۔ (اگرچہ اس کتاب میں ان کی جو نظمیں شامل کی گئی ہیں انھیں "آزاد نظمیں نہیں کہا جا سکتا) مگر اس جدت یا بغاوت کے باوجود وہ اپنے خیالات بڑی روانی سے بیان کرتے اور پڑھنے والا انھیں آسانی سے سمجھ لیتا ہے ۔

حضرت قائداعظم کے حضور میں

ریاض عرش کی زینت ہے آشیاں تیرا
تیری نوا کے مناسب ہے گلستاں تیرا

فضائے عرش معلیٰ میں شاد کام ہے تو
بقدر ہمتِ عالی ، فلک مقام ہے تو

مقام اوج پہ تکمیل ذات کرتا ہے
خدائے عرش سے کسبِ صفات کرتا ہے

ترے جہاں میں زماں و مکاں کی قید نہیں
یہاں کی قید نہیں ہے وہاں کی قید نہیں

کبھی یہاں کا بھی آیا ہے پر خیال تجھے ؟
ملائکہ نے کہا ہے ہمارا حال تجھے ؟

تیرے طریق پہ چلتا ہے کارواں تیرا ؟
ہمارے ملک میں ہے کوئی رازداں تیرا ؟

- - - - - -

تارے

رات بھر جاگ کر تارے
سو گئے صبح کو تھکے ہارے

پاؤں میں آبلے ہیں منزل دور
رہ گئے راستے میں بے چارے

نیلگوں چادروں میں ہیں روپوش
آسماں پر زمیں کے مہ پارے

حسن اور عشق کی لڑائی میں
جیت جن کی ہوئی وہی ہارے

دہقان کا مستقبل

کڑکتی دھوپ میں کھیتوں میں دہقان ہل چلاتا ہے
پسینہ بن کے خوں ہر موئے تن سے بہتا آتا ہے

بدن پر برچھیاں بن بن کے کرنیں شعلہ افگن ہیں
ابھی سے درپے آسودگی یہ برقِ خرمن ہیں

خمیدہ آنکھ ، تن بے پیرہن ، تصویر مظلومی
سراپا درد و حرماں ، فکر ، کلفت ، رنج محرومی

یہ سب کچھ ہے،یہ ہے سب کچھ ہے، مگر دیکھوں انی ہل کی
زمین کے سینۂ ہموار کو ہے چیرتی جاتی

اڑے آتے ہیں انگاروں کی صورت خاک کے تودے
ابھی تھے اور نہیں ہیں ایک دم میں جھاڑیاں پودے

مگر روئے زمین سے خستہ تن ہے قلب دہقاں کا
کہ ہے آما جگہ صدیوں سے ظلم و جورِ انساں کا

یہ ایسا کھیت ہے تلوار کا ہل جس میں چلتا ہے
لہو کے مینہ میں برچھی بن کے ہر خوشہ نکلتا ہے

یہ بنجر کھیت غیرآباد ، دل خاموش دہقاں کا
طلب رکھتا ہے خوشیوں کی ، تمنائی ہے باراں کا

یہی آزاد کروائیں گے آقاؤں سے بندوں کو
یہ پاؤں روند لیں گے سرکشوں کو سربلندوں کو

یہ ہل ہموار کر دیں گے بلندی اور پستی کو
یہ مستعمر بدل ڈالیں گے ویرانی میں بستی کو

نظر آتے ہیں تو دوں کی طرح شاہی محل مجھ کو
دکھائی دیتے ہیں ارض و سما میں ہل ہی ہل مجھ کو

••••••

اختر شیرانی

محمد داؤد خاں نام (۱۹۰۵-۱۹۴۸ء) اختر تخلص، ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے - ان کے والد پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی علمی و ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں - اختر کی ابتدائی تعلیم ٹونک میں ہوئی - ۱۹۲۱ء میں انھوں نے منشی فاضل اورینٹل کالج لاہور سے کیا - میٹرک کے امتحان سے چند ماہ قبل والد کی خواہش کے خلاف پڑھنا چھوڑ دیا اور شعر و شاعری ان کا مستقل مشغلہ بن گئی -

اختر نے اپنے زمانے کے کئی مشہور رسائل کی ادارت کی اور خود بھی "خیالستان" اور "رومان" پرچے نکالے - اس طرح ادبی حلقوں میں وہ متعارف و مقبول ہو گئے - اختر ایک رومانی شاعر تھے - ان کی غزلوں ، نظموں اور گیتوں میں رنگینی ، ترنم اور موسیقیت کی فراوانی ہے - نظموں کے موضوعات اور ان کی بحروں کے انتخاب میں اختر نے بڑی جدت سے کام لیا ہے - اسی طرح الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کے استعمال میں بھی ایک انوکھا پن ہے - صبح بہار ، اخترستان ، لالہ طور ، طیورآوارہ، شہناز اور شہرود وغیرہ ان کے کلام کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں -

----

جھونپڑی کا دیا

اک دیا دور سے ہنستا سا نظر آتا ہے
ننھے تارے کی طرح کرنیں سی برساتا ہے

گرچہ بجلی نہیں ، شعلہ نہیں ، مہتاب نہیں
پھر بھی رہ گیر کو یہ راستہ بتلاتا ہے

ٹوٹ کر رہ گئی اک شاخ پہ تارے کی کرن
یا کوئی جگنو ، چمک دور سے دکھلاتا ہے

دامن یاس میں ہو جیسے شعاع امید
یوں ہواؤں کے تھپیڑوں سے یہ تھراتا ہے

جیسے ارمان کی ننھی سی کرن ہو دل میں
یوں کسی جھونپڑی میں رنگ یہ دکھلاتا ہے

اختر صبح کی رقصندہ ضیا کی صورت
پہلوئے شب میں مچلتا سا نظر آتا ہے

کسی بڑھیا کے سیہ خانے کی رونق بن کر
اثر تیرگئی بخت کو بہلاتا ہے

رات کی تیرہ فضاؤں کی نظر بن بن کر
اک پراسرار جھلک دشت کو دکھلاتا ہے

بہاریہ

دھوم ہے گلزار ہستی میں پھر آتی ہے بہار
رنگ و بو کے خلد کا پیغام لاتی ہے بہار

ابر گونجا باغ میں ، دھومیں مچاتی ہے بہار
رس بھرے نغموں کا طوفاں بن کے آتی ہے بہار

غنچہ و گل کا حسیں ملبوس ہے زیب بدن
سر پہ رکھے چاندنی کا تاج آتی ہے بہار

چشم بد بیں کی نظر لگنے نہ پائے اس لیے
پردہ ہائے گل میں چھپ کے مسکراتی ہے بہار

ہے خس و خار و خزاں کا خوف دل کو اس لیے
ہر کلی میں رنگ بن کر لہلہاتی ہے بہار

زہرہ و ماہ و ثریا جھومتے ہیں ناز سے
چاندنی راتوں میں جب نغمے سناتی ہے بہار

آہ یہ برکھا کی راتیں ، ہائے یہ ساون کے دن
کیا سہانے سپنے آنکھوں کو دکھاتی ہے بہار

جنبش باد سحر سے شاخ و گل ہیں وجد میں
آبشار نغمہ و نکہت بہاتی ہے بہار

مور گونجے ، کوئلیں کوکیں ، پپیہے بول اٹھے
کتنے کم سن مطرب اپنے ساتھ لاتی ہے بہار

شاخسار لالہ و گل کو ہلاتی ہے نسیم
نوجواں کلیوں کو یا جھولا جھلاتی ہے بہار

دختراں غنچہ تھیں زیر نقاب نامیہ
چہرہ ہائے ناز سے پردہ اٹھاتی ہے بہار

چاندنی پھیلی ہوئی ہے وادیٔ گلزار پر
یا محیط نور و نکہت میں نہاتی ہے بہار

احسان دانش

احسان الحق نام (۱۹۱۴ء) احسان تخلص، دنیائے شاعری میں "احسان دانش" مشہور ہیں۔ پیدائش کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔ معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ حالات کی ناسازگاری اور معاشی پریشانیوں کے باوجود انھوں نے مطالعہ جاری رکھا۔ لاہور میں انھوں نے "مکتبہ دانش" قائم کیا اور اپنے کلام کے کئی مجموعے خود چھاپے۔ انھیں کتابوں سے عشق ہے۔ پرانی نایاب کتابوں اور قلمی نسخوں کا ان کے پاس اچھا ذخیرہ ہے۔ تصنیف و تالیف کے کام کے علاوہ وہ کتابوں کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے احسان کی شہرت "شاعر مزدور" کے نام سے ہوئی ان کی اکثر انقلابی نظموں میں مزدور طبقہ کی زندگی کی ترجمانی ملتی ہے۔ واقعات و مناظر کی تصویرکشی بھی وہ بڑے مؤثر انداز میں کرتے ہیں۔ ترنم ان کے کلام کی جان ہے۔ زبان بڑی شگفتہ و پاکیزہ ہے فارسی ترکیبوں کا استعمال معتدل انداز میں کرتے ہیں۔

تقسیم کے بعد انھوں نے غزل کی طرف زیادہ توجہ دی اب ان کا شمار پاکستان کے چوٹی کے غزل گویوں میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے مثلاً درد زندگی نفیر فطرت، چراغاں، نوائے کارگر، آتش خاموش، جادہ نو، زخم سرہم، شیرازہ، مقامات، گورستان وغیرہ چھپ چکے ہیں۔

گرمی کی دوپہر

یہ دوپہر کا منظر یہ گرمیاں بلا کی
یہ آتشیں ہوائیں ، یہ دھوپ انتہا کی

بادل کی شکل کو بھی عالم ترس رہا ہے
خورشید آگ بن کر سب پر برس رہا ہے

اللہ ! کیا بلا ہے یہ جون کا مہینہ
بہتا ہے عارضوں پر کھولا ہوا پسینہ

دوزخ کا اک نمونہ سورج دکھا رہا ہے
ہر رونگٹا بدن کا آنسو بہا رہا ہے

سوئے ہوئے درندے گھبرا کے اٹھ رہے ہیں
میدان سے بگولے چکرا کے اٹھ رہے ہیں

صحرا کا ذرہ ذرہ بے چین ہو رہا ہے
برگد کی چھاؤں پا کر چرواہا سو رہا ہے

میلی سی ایک چادر تانے پڑا ہوا ہے
بازو کا سر کے نیچے تکیہ لگا ہوا ہے

طائر پھڑک رہے ہیں تپتے نشیمنوں میں
ویرانیوں کا عالم چھایا ہے گلشنوں میں

پھولوں سے آنچ بن کر آہیں نکل رہی ہیں
پتے سلگ رہے ہیں ، کلیاں پگھل رہی ہیں

لو سر سرا رہی ہے سرسبز وادیوں میں
ماتم ہے نکہتوں کا گلزار زادیوں میں

صحرا کے زرد پودے تونسے ہوئے کھڑے ہیں
کانٹوں سے تتلیوں کے بازو چھدے پڑے ہیں

شعلے برس رہے ہیں ہر سمت بستیوں میں
گویا اتر رہا ہے خورشید پستیوں میں

ہے رنگ بدحواسی ہر چہرۂ حسیں پر
ذرے تڑپ رہے ہیں تپتی ہوئی زمین پر

سنسان سی پڑی ہیں جنگل کی شاہراہیں
بھپکی ہوئی فضا میں بیتاب ہیں نگاہیں

گنجان جھاڑیوں میں لپٹیں رکی ہوئی ہیں
سمٹے ہوئے ہیں پتے شاخیں جھکی ہوئی ہیں

ہر موج میں ہے تیور بجلی کی ہمسری کا
گرداب پر گماں ہے خورشیدِ خاوری کا

سورج کی ہر کرن میں خنجر لچک رہے ہیں
ذروں کی انکھڑیوں میں شعلے دہک رہے ہیں

پگڈنڈیوں کے پودے لو نے جلا دیے ہیں
سورج کی تیزیوں نے چشمے سکھا دیے ہیں

جام جہاں میں موسم تیزاب بھر رہا ہے
اک آتشیں سمندر سر سے گزر رہا ہے

"چاہیئے"

انسان ہو تو خلق و محبت بھی چاہیے
آنکھوں میں شرم، دل میں شرافت بھی چاہیے

لازم ہے وقت دیکھ کے اندازِ گفتگو
اپنوں سے یہ بجا کہ شکایت بھی چاہیے

مانا کہ کار ساز خدا ہے خودی نہیں
کچھ عرض مدعا میں عقیدت بھی چاہیے

اس انجمن کی شرط نہیں صرف آرزو
اس کے لیے تو جرات و ہمت بھی چاہیے

احکام حال پر سر تسلیم خم مگر
ماضی کے مرحلوں کی حکایت بھی چاہیے

دیوانگاں شوق بہت بے ادب سہی
ان بیکسوں پہ چشم عنایت بھی چاہیے

کب تک غلام گردش دوراں رہے کوئی
آزادی نظر کی اجازت بھی چاہیے

کرتے ہیں سب ہجوم مصائب میں بندگی
یاد خدا بغیر ضرورت بھی چاہیے

کرتے رہو

جس طرح ممکن ہو تعمیر چمن کرتے رہو
کام اپنا اے محبان وطن کرتے رہو

زندگی یکسر تحرک ہے، سکون یکسر ہے موت
کچھ نہ کچھ اے نوجوانان وطن کرتے رہو

پتی پتی پر چمن کی جان چھڑکو دوستو!
رات دن خدمات ِ ارباب چمن کرتے رہو

آندھیوں کا کیا بھروسا، کیا بگولوں کا یقیں
روز اونچی اپنی دیوار ِ چمن کرتے رہو

لطف ہی کیا ہے اگر بولے نہ ہر رخ سے جنون
ہوش سے بچتے چلو، دیوانہ پن کرتے رہو

جس نے جیتا ہے دلوں کو، اس نے جیتا ہے جہاں
عام دنیا میں محبت کا چلن کرتے رہو

کاش تہذیب نوی کے کھیل کو سمجھو سراب
کاش تقلید روایات کہن کرتے رہو

انتشار اک پیش نامہ ہے زوال ملک کا
اتحاد قوم و ملت کا جتن کرتے رہو

دوستی احسان دانش کچھ نہیں اس کے سوا
زندگی بھر اعتراف حسن ظن کرتے رہو

چند عام اصطلاحیں

شعر : اس کلام کو کہتے ہیں جو مقررہ وزن اور بحر میں کہا گیا ہو ۔ نثر کسی وزن اور بحر میں نہیں ہوتی اس لیے دونوں میں فرق فوراً نظر آ جاتا ہے ۔

مصرع : شعر دو برابر کے حصوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے ۔ ان میں ہر حصے کو مصرع کہتے ہیں ۔ شعر کا پہلا مصرعہ مصرع اول اور دوسرا مصرع مصرع ثانی کہلاتا ہے ۔

قافیہ : ان چند حروف اور حرکات کے مجموعے کو کہتے ہیں جو اشعار کے آخر میں بار بار لائے جائیں ۔ یعنی کسی لفظ کا جتنا جزو حروف قافیہ میں شمار کیا جاتا ہے اتنا ہر شعر کے آخر میں مکرر آتا ہے اور اس جزو سے پہلے حروف کی حرکت ایسے الفاظ میں یکساں ہوتی ہے ۔ مثلاً میر تقی میر کی یہ غزل آپ پڑھ چکے ہیں

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خون تھا مژہ پر جم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صبح پیری شام ہونے آئی میر
تو نہ جیتا یاں بہت دن کم رہا

اس غزل میں دم ، غم ، جم ، محرم ، نم کم ایسے الفاظ ہیں جنھیں قافیہ کہا جائے گا یہ سب ہم آوار الفاظ ہیں اور ان کے آخر میں حرف میم کی تکرار ہے اور ہر لفظ میں میم سے پہلے جو بھی لفظ ہے وہ مفتوح ہے یعنی اس پر زبر کی حرکت ہے -

ردیف : اس ایک لفظ یا الفاظ کو کہتے ہیں جو قافیے کے بعد اشعار کے آخر میں جوں کے توں دہرائے جاتے ہیں جیسے اوپر غزل میں "رہا" ردیف ہے -

بحر : شعر کے وزن کا نام بحر ہے -

زمین : قافیہ ، ردیف اور بحر کا مجموعی نام زمین ہے -

مطلع : غزل اور قصیدہ وغیرہ کے اس پہلے شعر کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعوں میں قافیے (یا قافیہ اور ردیف دونوں) آئیں - جیسے اوپر والی میر تقی میر کی غزل کا پہلا شعر - جس کے پہلے مصرعے میں دم اور دوسرے میں غم ہم قافیہ الفاظ آئے ہیں اور "رہا" جو ردیف ہے دونوں مصرعوں میں موجود ہے -

مقطع : اس آخری شعر کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنا تخلص (مختصر شاعرانہ نام) لاتا ہے جیسے اوپر والی غزل کا آخری شعر جس میں میر تقی نے اپنا تخلص میر استعمال کیا ہے -

بیت : کسی غزل کے ایسے شعر کو کہتے ہیں جو نہ مطلع ہو نہ مقطع - جیسے اوپر کی غزل کا دوسرا ، تیسرا اور چوتھا شعر -

نظم کی قسمیں

شکل اور بناوٹ کے لحاظ سے شعر یا نظم کی خاص خاص قسمیں مندرجہ ذیل ہیں ۔ مثالیں آپ کی کتاب کے حصہ نظم میں موجود ہیں ۔

غزل :

اس نظم کو کہتے ہیں جس کا پہلا شعر مطلع اور آخری مقطع ہوتا ہے مطلعے کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں ، باقی اشعار میں قافیہ ہر شعر کے دوسرے مصرے میں آتا ہے ۔ مقطعے میں عام طور پر شاعر اپنا تخلص لاتا ہے ۔ غزل میں اگر پہلے مطلعے کے بعد اور بھی کوئی مطلع ہو تو اسے حسن مطلع یا زیب مطلع کہتے ہیں۔ غزل کے تمام اشعار کا وزن ایک ہی ہوتا ہے ۔ اشعار کی تعداد کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ پندرہ یا سترہ ہوتی ہے ۔ لیکن بعض شعرا کی غزلوں میں اشعار کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے ۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ عملاً تعداد اشعار غزل کی بنیادی شرائط میں شامل نہیں ۔

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین قسم ہے ۔ اس کی ابتدا عربی شاعری سے ہوئی ۔ قدیم عربی شعرا اپنے قصیدوں کے شروع میں کبھی کبھی عاشقانہ مضامین باندھا کرتے تھے ۔ قصیدے کے اس جز یعنی عاشقانہ اشعار کا ایک نام "غزل" بھی تھا ۔ عربی سے جب غزل فارسی زبان میں آئی تو قصیدے سے الگ ہو کر

اس نے بجائے خود ایک باقاعدہ نظم کی صورت اختیار کر لی - پھر فارسی سے یہ اردو میں آئی اور برصغیر پاک و ہند کی فضا میں پرورش پا کر پروان چڑھی - یہاں کا ماحول اسے ایسا راس آیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں شاعری کی دوسری اقسام کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہردلعزیز ہو گئی -

معنی یا مضمون کے اعتبار سے غزل کے اشعار ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں، یعنی ہر شعرمیں ایک الگ اور مکمل مضمون بیان کیا جاتا ہے- اسکا دوسرے اشعار کے مضامین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات تو ایک ہی غزل کے اشعار میں متضاد کیفیات بیان کر دی جاتی ہیں - لیکن غزل کے اشعار کا مختلف المضامین ہونا ضروری نہیں ؛ اگر غزل میں شروع سے آخر تک مسلسل ایک ہی مضمون ادا کیا جائے تو مضائقہ نہیں بلکہ یہ ایک قابل تعریف بات سمجھی جاتی ہے - ایسی غزل کو مسلسل غزل کہتے ہیں -

لغت میں لفظ "غزل" کے دو معنی ہیں ایک عشق و محبت کی باتیں کرنا ، دوسرے ہرن کی وہ درد بھری نرم سی چیخ جو پیچھا کرنے والے شکاری کتوں کے خوف سے اس کے گلے سے نکلتی ہے ان معانی سے دو نتیجے نکلتے ہیں ایک تو غزل میں عشق و محبت کی بات کا ہونا دوسرے اس کا درد آمیز لہجہ - شروع شروع میں غزل میں عشق و محبت اور اس سے پیدا ہونے والے جذبات و احساسات نظم کیے جاتے تھے - اردو کے قدیم شاعروں نے اکثر ان ہی مضامین کو غزل میں ادا کیا ہے مگر ان کے بعد کے شاعروں خصوصاًجدید اردو غزل گو شعرا نے غزل کے مضامین میں بڑی وسعت پیدا کی اور فلسفیانہ ، صوفیانہ ،

اخلاق ، سیاسی ، سماجی غرض ہر قسم کے مضامین سے اسے مالا مال کر دیا ۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اب غزل میں مضمون کی کوئی قید نہیں ۔ جہاں تک غزل کے لہجے کا تعلق ہے اس میں لطافت و ملائمت کا ہونا لازمی ہے ۔

غزل کی زبان خاص طور پر نرم و شیریں ہوتی ہے اور طرز ادا میں سادگی و بے تکلفی اس کی بنیادی خوبیوں میں داخل ہے۔ زبان کے سلسلے میں ایک بات اور یاد رکھنی چاہیے کہ غزل کے شاعر کو ہر شعر میں ایک مکمل بات یا پورا مضمون بیان کرنا پڑتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تفصیل کے بجائے اختصار سے کام لیتا اور اشاروں میں بات کرتا ہے ۔ اس کو غزل کی اشاریت یا ایمائیت کہتے ہیں ۔ مرزا غالب نے مندرجہ ذیل شعر میں اسی میں حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مذکورہ بالا خوبیوں کی بدولت غزل کے ایک شعر کے دو مصرعوں میں دیکھنے میں تو چند الفاظ ہوتے ہیں جنھیں روانی سے پڑھیے تو شاید ایک سکنڈ میں پورا شعر پڑھ لیا جائے لیکن معنی پر غور کیجیے تو پورا ایک دفتر ہوتا ہے ۔ بڑے بڑے مضمون ، بلند خیالات ، روحانی کیفیات ، لمبے چوڑے مناظر اور طویل قصے چند الفاظ کے شعر میں باآسانی بیان ہو جاتے ہیں ۔

قصیدہ :

اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی مدح یا تعریف کی جائے ۔ غزل کی طرح قصیدہ بھی عربی سے فارسی میں اور

فارسی سے اردو میں آیا ۔ ساخت کے اعتبار سے قصیدہ اور غزل میں صرف اشعار کی تعداد کا فرق ہوتا ہے ورنہ مطلع ، مقطع، ردیف ، قافیہ اور وزن کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا ۔ قصیدے کے اشعار کی تعداد معین نہیں ہے ۔ پندرہ بیس اشعار سے لے کر سو دو سو بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد ہو سکتی ہے ۔

غزل کے شروع میں ایک سے زیادہ مطلعے ہو سکتے ہیں مگر قصیدے کے شروع میں صرف ایک ہی مطلع ہوتا ہے ، اگر کسی قصیدے میں ایک سے زائد مطلعے ہوتے ہیں تو ہر دو مطلعوں کے درمیان بہت سے اشعار ضرور ہوتے ہیں ۔ جس قصیدے میں متعدد مطلعے ہوتے ہیں اسے "ذوالمطالع" کہتے ہیں ۔ قصیدے میں مدح اگر اللہ تعالیٰ کی ہو تو اسے "حمد" کہتے ہیں ۔ خاتم المرسلین کی تعریف ہو تو "نعت" اور خلفائے راشدین یا بزرگان دین میں سے کسی کی توصیف بیان کی جائے تو "منقبت" اور کسی بادشاہ یا امیر کی تعریف ہو تو "مدح" کہتے ہیں ۔ بعض اوقات شاعر خود اپنی تعریف بھی کرتا ہے ایسے قصیدے کو "فخریہ" کہتے ہیں ۔

قصیدے کے چار خاص اجزا یہ ہیں :

۱ ۔ تشبیب یا تمہید :

قصیدے کا ابتدائی حصہ جس میں شاعر مدح سے پہلے کچھ اشعار بطور تمہید کے لکھتا ہے ۔ اس تمہید کو "تشبیب" بھی کہتے ہیں بلکہ یہی نام زیادہ رائج ہے ۔ اس حصے میں مضمون کی کوئی قید نہیں ہوتی ۔ بہار کی صفت ، شکایت روزگار ، کوئی منظر ، قصہ ، پند و نصیحت غرض کوئی مضمون نظم کیا جا سکتا ہے ۔

۲ - گریز :

تشبیب اور مدح کو ملانے کے لیے ایک یا چند اشعار کا سہارا لیا جاتا ہے یعنی تمہید کے بعد قصیدہ نگار کوئی موقع پیدا کر کے ممدوح کا ذکر چھیڑتا ہے اور مدح شروع کرتا ہے - بالفاظ دیگر تشبیب اور مدح کے درمیان کا حصہ گریز کہلاتا ہے - گریز میں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ اصل مطلب پر آنے کا معقول اشارہ ہو اور تمہید و اصل مطلب میں گہرا تعلق پیدا ہو جائے -

۳ - مدح :

اس حصے میں شاعر اپنے ممدوح کی تعریف بیان کرتا ہے -

۴ - دعا :

اس آخری حصے میں شاعر اپنے ممدوح کی عمر و صحت ، مال و دولت اور منصب و اقبال کے لیے دعا کرتا اور پھر اپنا مدعا بیان کرتا ہے -

قصیدے کا نام عموماً تشبیب کے مضمون کی مناسبت سے ہوتا ہے مثلاً اگر تشبیب میں بہار کی کیفیت بیان کی گئی ہے تو اس قصیدے کو "بہاریہ" کہیں گے اور اگر شکایت زمانہ کا مضمون ہو تو "شہر آشوب" کہلائے گا - قصیدے کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جس میں تشبیب اور گریز نہیں ہوتی بلکہ شاعر مدح ہی سے قصیدے کا آغاز کرتا ہے ایسے قصیدے کو "خطابیہ" کہتے ہیں -

قصیدے کی زبان زور دار اور پرتکلف ہوتی ہے - غزل میں نرم و شیریں الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے اس کے برخلاف قصیدے میں ، پرشکوہ اور بارعب الفاظ

استعمال کر کے شاعر اپنی علمی قابلیت اور زور طبع کا اظہار کرتا ہے - زبان کے ماسوا غزل اور قصیدے میں معنوی فرق بھی ہے - غزل سچے جذبات اور نازک احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہے - اس کے مقابلے میں قصیدے میں خیالات کی بلند پروازی اور نازک خیالی سے کام لیا جاتا ہے - غزل میں سوز و گداز ہوتا ہے تو قصیدے میں شان و شوکت - ایک میں اثر انگیزی ہوتی ہے تو دوسرے میں رعب و دبدبہ - اس لیے کسی نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ غزل "آہ" ہوتی ہے اور قصیدہ "واہ" -

موجودہ زمانہ میں قصیدہ گوئی تقریباً ختم ہو چکی ہے اور کوئی شاعر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا - وجہ ظاہر ہے فی زمانہ حالات بدل چکے ہیں نہ وہ اگلے سے مشاق استاد رہے کہ مدح سرائی کریں نہ وہ بخشش و انعام کی بارش کرنے والے بادشاہ و رئیس رہے کہ ممدوح بنیں - پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ قصیدے میں شاعری کم شاعرانہ مہارت ، اظہار علم و فضل اور دماغ سوزی زیادہ ہوتی ہے - آجکل کے شاعروں کو فکر معاش سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ وہ اتنی دماغ سوزی کریں اور کریں بھی تو کس امید پر - اس لیے کہ قصیدے کے قدردان اور واہ وا کرنے والے ہی باقی نہیں رہے -

یہ صحیح ہے کہ ہمارے قصیدہ نگاروں نے ممدوح کی تعریف میں عموماً زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں اور اسی غیر معتدل مداحی کے باعث قصیدہ نگاری بہت بدنام ہوئی ہے مگر ان کمزوریوں کے باوجود یہ نہیں تصور کرنا چاہیے کہ ہماری قصیدہ نگاری بیکار گئی - سچ پوچھیے تو اس سے زبان و بیان کو بڑے فائدے پہنچے ہیں - قصیدوں میں ہمیں اچھی شاعری

کے نمونے بھی ملتے ہیں خصوصاً اخلاق اور نعتیہ قصیدے تو مضمون کے لحاظ سے بھی بڑے اہم ہیں۔

مثنوی :

اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں ۔ غزل اور قصیدے کے خلاف جس میں شروع سے آخر تک ایک قافیہ کی قید ہوتی ہے مثنوی کے اشعار کا قافیہ الگ الگ ہوتا ہے ۔ اس نظم میں گویا پابندی اتنی ہوتی ہے کہ ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں ۔ یہ بات اس کے نام سے بھی ظاہر ہے ۔ مثنوی لفظ "مثنٰی" سے منسوب ہے جس کے معنی ہیں دو دو یعنی مثنوی ایسے اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں دو دو مصرعے باہم مقفٰی ہوں ۔

مثنوی ایرانیوں کی ایجاد ہے ۔ عربی شاعری میں اس کا رواج نہ تھا ۔ شاعری ، کی یہی ایسی قسم ہے جس کی بدولت فارسی شاعری کو عربی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے ۔ فارسی میں سینکڑوں بلند پایہ مثنویاں لکھی گئیں جن میں فردوسی کا شاہنامہ اور مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی فارسی ادب کی مایہ ناز مثنویاں ہیں ۔

مثنوی طویل اور مسلسل مضامین کے لیے وضع کی گئی تھی اس لیے اس میں تعداد اشعار کی کوئی حد مقرر نہیں ۔ پندرہ بیس اشعار سے لے کر ساٹھ ساٹھ ہزار اشعار تک مثنوی میں لکھے گئے ہیں ۔ اس خوبی کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کی تمام اقسام میں مثنوی سب سے زیادہ مفید اور کارآمد قسم ہے ۔ اس میں شاعر کو مسلسل خیالات و واقعات خوبی کے ساتھ نظم کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ طویل

تاریخی واقعات ، صوفیانہ خیالات ، سچے یا فرضی قصے ، موسمی حالات ، آپ یا جگ بیتی ، سیرو شکار ، جنگ کے واقعات وغیرہ مسلسل مضامین مثنوی ہی میں بیان کیے جاتے ہیں -

مثنوی کے لیے دو باتیں ضروری قرار دی گئی ہیں -

(۱) اس کے اجزا آپس میں مربوط ہوں -

(۲) بیان میں تسلسل ہونا چاہیے -

اجزا کے آپس میں مربوط ہونے سے مراد یہ ہے کہ مثنوی میں اشعار اور مصرعوں کی ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ ہر مصرع دوسرے مصرعے سے اور ہر شعر دوسرے شعر سے چسپاں ہوتا چلا جائے اور دونوں کے درمیان خلا نہ رہنے پائے - خاص کر جب کوئی تاریخی واقعہ یا قصہ بیان کیا جا رہا ہو تو کلام میں ربط کا لحاظ رکھنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے -

مثنوی کے سات وزن مقرر ہیں لیکن بعض شعرا نے ان مقررہ اوزان کے علاوہ اور وزن بھی استعمال کیے ہیں - بہرحال یہ ضروری ہے کہ وزن ایسا ہو جو مثنوی کے مضمون کی فضا سے ملتا جلتا ہو تاکہ اس کا پورا اثر ظاہر ہو - اردو میں کم و بیش ہر شاعر نے چھوٹی یا بڑی مثنویاں لکھی ہیں - میر ، مومن ، نواب مرزا شوق قدوائی وغیرہ کی مثنویاں بہت عمدہ ہیں مگر میر حسن دہلوی کی مثنوی سحرالبیان اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم زیادہ مشہور اور مقبول مثنویاں ہیں - حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ اسلام" بھی مثنوی ہے لیکن اس کا وزن مسلمہ اوزان سے مختلف ہے -

رباعی :

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں صرف چار مصرعے ہوتے ہیں اور انھیں میں ایک مکمل مضمون بیان کیا جاتا ہے ۔ رباعی کے چار مصرعوں میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہونا ضروری ہے ۔ تیسرے مصرعے میں قافیہ ہو یا نہ ہو، دونوں طرح درست ہے ۔ قافیے کی اس ترتیب کے علاوہ رباعی کے لیے ایک خاص بحر (یعنی وزن) مقرر ہے اس کے سوا دوسری بحروں میں رباعی نہیں کہی جاتی اور رباعی کی بحر میں غزل، قصیدہ وغیرہ دوسری قسم کی نظمیں نہیں لکھی جاتیں ۔ گویا ہر چار مصرعے والی نظم کو رباعی نہیں کہتے ۔ رباعی کے لیے خاص اوزان کی قید ہے وہ ہو تو رباعی ورنہ قطعہ ۔ معنوی اعتبار سے رباعی کا چوتھا مصرع خاص طور پر زور دار اور پرلطف ہونا چاہیے ۔

مثنوی کی طرح رباعی بھی ایرانیوں کی ایجاد ہے ۔ ایران میں اسلام سے پیشتر بھی اس کا رواج تھا اور بعد میں تو اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ فارسی شعرا نے رباعی کو صوفیانہ اوراخلاقی مضامین کے لیے خاص طور سے استعمال کیا ہے مگر عمر خیام کی رباعیاں رندانہ بھی ہیں اور حکیمانہ بھی ۔

اردو میں بھی رباعی کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی اور تقریباً سب شاعروں نے رباعیاں لکھی ہیں لیکن انیس، حالی اور اکبر الہ آبادی کی رباعیوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے ۔

قطعہ :

اس نظم کو کہتے ہیں جس میں دو یا زیادہ اشعار اس قید کے ساتھ لکھے جائیں کہ سب کا مطلب آپس

میں ایک دوسرے سے متعلق اور مسلسل ہو۔ اس کا پہلا شعر مطلع نہیں ہوتا یا یہ کہہ لیجیے کہ اس کے پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں قافیہ نہیں ہوتا اور سب شعروں کے دوسرے مصرعوں میں قافیہ ضرور ہوتا ہے۔

قطعہ میں کم از کم دو شعر ہوں اور زیادہ سے زیادہ کی تعداد متعین نہیں۔ قطعہ بعض اوقات غزلوں اور قصیدوں میں بھی واقع ہو جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ کوئی طویل مضمون جب ایک شعر میں ادا نہیں ہو پاتا تو دو یا زیادہ اشعار آپس میں جوڑنے یا مربوط کرنے پڑتے ہیں ایسے موقعوں پر مطبوعہ کتابوں میں قطعہ کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں کے درمیان "قطعہ" یا اس کی مختصر شکل "ق" لکھ دیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو سکے کہ یہاں سے قطعہ یعنی مسلسل مضمون شروع ہوتا ہے۔

مخمس :

اس نظم کو کہتے ہیں جس میں پانچ پانچ مصرعوں کے متعدد بند ہوں ہیں۔ پہلے بند کے پانچوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور یہ مطلع کہلاتا ہے۔ باقی بندوں کے پہلے چار چار مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں اور پانچواں مصرع پہلے بند کے قافیے کا تابع ہوتا ہے۔

مخمس میں بعض شعرا نے یہ ایجاد کی ہے کہ ہر بند میں پانچویں مصرعے کو دہرایا ہے۔

مسدس :

اس نظم کو کہتے ہیں جس میں چھ چھ مصرعوں کے متعدد بند ہوتے ہیں۔ ہر بند کے پہلے چاروں مصرعے ہم قافیہ

ہوں اور پانچویں چھٹے مصرعے ان سے علیحدہ قافیوں میں مگر آپس میں ہم قافیہ ہوں ۔ شعرائے اردو نے مسدس میں قافیوں کی یہ ترتیب قائم کرکے اسے طولانی اور مسلسل مضامین ادا کرنے کے قابل بنا دیا ہے ۔ چنانچہ میر انیس اور دوسرے مرثیہ گو شعرا نے مرثیے مسدس ہی میں لکھے ہیں اسی طرح مولانا حالی کی شہرہ آفاق نظم "مدو جزر اسلام" بھی مسدس کی شکل میں ہے ۔

ترکیب بند :

اس نظم کو کہتے ہیں جس میں پہلے ایک غزل ہوتی ہے جس میں مطلع تو ہوتا ہے مگر مقطع نہیں ہوتا ۔ اس کے بعد ایک شعر الگ قافیے میں بطور بند کے ہوتا ہے ۔ اس طرح پھر ایک غزل اسی بحر میں ہوتی ہے اور تعداد اشعار بھی پہلی غزل کے اشعار کے برابر ۔ اس غزل کے بعد پھر ایک شعر الگ قافیے کا ہوتا ہے ۔ غرض یکے بعد دیگرے ایک ایک غزل اور ایک ایک شعر الگ ردیف و قافیے کا مگر سب ایک بحر میں ہوں تو ترکیب بند کی شکل بنتی ہے ۔ رہا بندوں کی تعداد کا سوال تو اس کی کوئی حد مقرر نہیں ۔

ترجیع بند :

یہ نظم بھی ترکیب بند کی شکل کی ہوتی ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ ترجیع بند میں ہر غزل کے بعد ایک ہی شعر کی تکرار کی جاتی ہے لیکن ترکیب بند میں ایسا نہیں ہوتا دونوں میں جو متعدد غزلیں یکے بعد دیگرے ہوتی ہیں ان میں مضمون عموماً مسلسل ہوتا ہے اور سب کی بحر ایک ہوتی ہے ۔

نظم :

جدید شاعری میں نظم کا لفظ ایسے مجموعہ اشعار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو کسی ایک خاص موضوع پر کہے گئے ہوں۔ خواہ شکل و صورت میں وہ غزل سے مشابہ ہوں یا قصیدے سے، قطعہ کی مانند ہوں یا مثنوی کے یا کسی اور قسم کی نظم کہی جائے۔

جدید اصطلاح کے مطابق نظم کو شکل اور بناوٹ کے لحاظ سے نہیں بلکہ مضمون اور معنی کے لحاظ سے کوئی نام دیا جاتا ہے مثلاً اصلاحی نظم، قومی نظم، تاریخی نظم، سلامی نظم وغیرہ۔

اسی طرح تین اور قسمیں بھی ہیں جو شکل و بناوٹ کے لحاظ سے نہیں بلکہ مضمون کے اعتبار سے کی گئی ہیں اور پرانے زمانے سے چلی آتی ہیں۔

مرثیہ :

اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کے مرنے پر رنج و غم کا اظہار کیا جائے۔ خواہ وہ نظم قطعے کی شکل میں ہو یا مسدس کی یا کسی اور صورت میں۔ لیکن عام طور پر اردو میں مرثیے کے ایک خاص معنی بھی ہیں یعنی صرف کربلا کے حالات، شہدائے کربلا کی منقبت اور شہادت وغیرہ بیان کرنا۔ ابتدا میں واقعات کربلا کے بیان کے لیے نظم کی کوئی خاص قسم مقرر نہیں تھی۔ وہ کسی صورت میں بھی لکھا جا سکتا تھا مگر بعد میں شعرائے لکھنئو نے صرف مسدس کو مرثیے کے لیے مخصوص کر لیا۔

ہجو :

اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی برائی اور مذمت کی جائے ۔ اس کے لیے نظم کی کسی خاص قسم کی قید نہیں یہ قصیدہ ، مثنوی ، مخمس ، مسدس غرض کسی شکل میں بھی ہو سکتی ہے ۔ اردو میں سودا کو ہجو نگار کی حیثیت سے ایک منفرد مقام حاصل ہے ۔

شہر آشوب :

اس نظم کو کہتے ہیں جس میں شہر اور ملک کی عام بدحالی کا ذکر کیا جائے خواہ وہ مخمس اور مسدس کی شکل میں ہو یا کسی اور صورت میں ۔ اردو میں سودا ، میر ، انشا ، ظفر ، داغ ، حالی وغیرہ نے اپنے شہر آشوبوں میں اس زمانے کی افراتفری اور زبوں حالی کا نہایت موثر نقشہ کھینچا ہے ۔

علاؤ الدین علائی کے نام غالب کے خط پر دیے ہوئے سوال کے بارے میں جوابی اشارات

۱- بنام : نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی (۱۸۳۳ء-۱۸۸۴ء)

۲- پیدائش مطابق : ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء

۳- حوالات : قیام آگرہ ۱۷۹۷ تا - ۱۸۱۲-۱۳ء

۴- دوام جس : شادی مطابق : ۹ اگست ۱۸۱۰ء

۵- بیڑی : بیوی : امراؤ بیگم دختر نواب بخش خاں معروف

۶- جیل خانہ : دلی : جہاں شادی کے بعد ۱۸۱۲-۱۳ء سے وہ مستقل ہوئے -

۷- بلاد شرقیہ کی سیر : مراد سفر کلکتہ دسمبر ۱۸۲۶ء نومبر ۱۸۲۹ء جس میں انہیں کانپور ، لکھنئو ، باندہ ، بنارس ، عظیم آباد ، الہ آباد ، مرشد آباد دیکھنے کا موقع ملا -

۸- دو ہتھکڑیاں : مراد جوان مرگ عارف کے بچے باقر علی خاں اور حسین علیخاں - عارف اور ان کی بیوی کی وفات کے بعد والدۂ عارف ان بچوں کو سنبھالے بیٹھی تھیں ، ان کا بھی انتقال ہو گیا تو غالب اور ان کی بیگم ان دونوں بچوں کو اپنے پاس لے آئے - عارف، امراؤ بیگم کے بھانجے تھے جن کا ۱۸۵۰ء میں انتقال ہوا -

۹- مع ہتھکڑیوں کے بھاگنا : مراد سفر رامپور ۲۷ جنوری ۱۸۶۰ء - ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء (تک رامپور میں قیام)

۱۰- حکم ربانی : مراد ، سفر آخرت (موت) سے ہے جو بالآخر ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو واقع ہوا

۱۱- ذی الحجہ ۷. ۱۲ء- جون ۱۸۶۱ء

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور، منظور شدہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور بموجب سرکلر نمبر 748—SE/G مورخہ 9 مارچ 1973ء سرگودھا بورڈ بموجب سرکلر نمبر 4139--4734/MS مورخہ 18 اپریل 1973ء ملتان بورڈ بموجب نوٹیفکشن نمبر 203/ASG مورخہ 21 فروری 1973ء

سیریل نمبر
کوڈ نمبر G-143

1412

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	تعداد اشاعت	قیمت
جون 1973	اول	2,000	5.00 رو